تعمیرِ حیات

کامیاب زندگی کی تعمیر کے لئے گائڈ بک

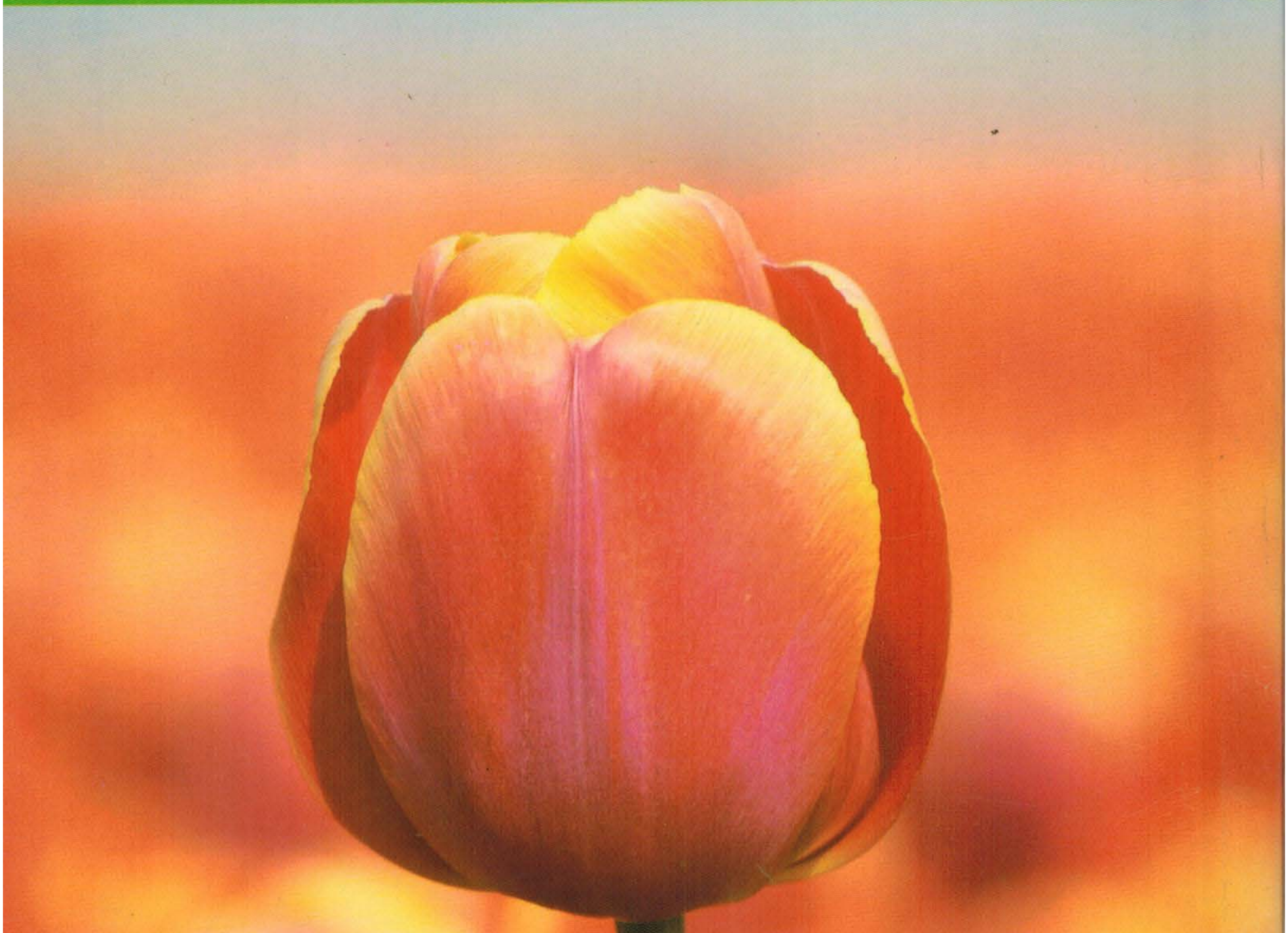

مولانا وحید الدّین خاں

تعمیرِ حیات

کامیاب زندگی کی تعمیر کے لئے گائڈ بک

مولانا وحید الدّین خاں

Ta'ameer-e-Hayat
By Maulana Wahiduddin Khan

First published 2000
Reprinted 2015
This book is copyright free

Goodword Books
1, Nizamuddin West Market, New Delhi-110 013
Tel. +9111-4652-1511, Mob. +91-8588822674
email: info@goodwordbooks.com
www.goodwordbooks.com

Goodword Books, Chennai
324, Triplicane High Road,
Triplicane, Chennai-600005
Tel. +9144-4352-4599
Mob. +91-9790853944, 9600105558
email: chennaigoodword@gmail.com

Goodword Books, Hyderabad
2-48/182, Plot No. 182, Street No. 22
Telecom Nagar Colony, Gachi Bawli
Hyderabad-500032
Tel. 04023000131, Mob. 07032641415
email: hyd.goodword@gmail.com

Printed in India

عرض ناشر

ہمارے ادارے کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بھی رہا ہے کہ ایسے مضامین شائع کئے جائیں جو لوگوں کے لئے زندگی کی تعمیر میں ان کی رہنمائی کرنے والے ہوں۔ ماہنامہ الرسالہ (جاری شدہ ۱۹۷۶) میں مستقل طور پر اس قسم کے مضامین شائع کئے جاتے رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی مستقل کتاب ۱۹۸۷میں رازحیات کے نام سے چھپی۔ جو ۲۹۲صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر دوسری کتاب ۱۹۹۶میں چھپی۔ اس کتاب کا نام کتاب زندگی ہے اور وہ ۲۵۱صفحات پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ اس درمیان میں ادارے کی طرف سے اس موضوع پر کئی چھوٹی کتابیں بھی چھپ چکی ہیں۔ مثلاً راہیں بند نہیں (صفحات ۵۰) اور رہنمائے حیات (صفحات ۵۰)، وغیرہ۔

زیر نظر مجموعہ "تعمیر حیات" اس موضوع پر ایک اور کتابی پیش کش ہے۔ یہ ۲۴۰صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے پانچ ابواب ہیں۔ امید ہے کہ انشاءاللہ یہ کتاب لوگوں کے لئے اپنی زندگی کی تعمیر میں معاون اور مددگار ہوگی۔

ناشر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست

۱۔ صحیح طرز فکر	صفحہ	5
۲۔ قانونِ فطرت		31
۳۔ واقعات کی زبان میں		79
۴۔ کامیابی کا راز		135
۵۔ رہنمائے حیات		175

پہلا باب

صحیح طرز فکر

کسی انسان کے لئے سب سے اہم چیز صحیح طرز فکر ہے۔ صحیح طرز فکر انسان کو تعمیر اور ترقی کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے بر عکس غلط طرز فکر اس کو تعمیر اور ترقی دونوں سے محروم کر دیتا ہے۔

صحیح طرز فکر

انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ فکری صلاحیت رکھتا ہے۔ حیوان اپنی جبلت کے تابع ہے۔انسان کی عظمت یہ ہے کہ وہ سوچتا ہے اور سوچ کے تحت اپنے عمل کا منصوبہ بناتا ہے۔حیوان کے لئے غلطی کرنے کا کوئی امکان نہیں کیوں کہ حیوان خدائی جبلت کے تحت عمل کرتا ہے۔ لیکن انسان صحیح بھی کرتا ہے اور غلط بھی۔اس لئے ضروری ہے کہ ہر آدمی اپنے سوچنے کی صلاحیت کو آخری حد تک بیدار کرے، تاکہ اس کی سوچ درست سوچ ہو۔اور اس کے نتیجہ میں اس کا عمل بھی درست عمل۔

پہلا نکتہ

زندگی ایک آرٹ ہے۔جو لوگ اس آرٹ کو جانیں وہی اس دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کر سکتے ہیں۔جو لوگ اس آرٹ سے بے خبر ہوں،ان کے لئے اس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

اس آرٹ کو اگر ایک لفظ میں بیان کرنا ہو تو اس کو مثبت طرز فکر (positive thinking) کہا جا سکتا ہے۔ یعنی رد عمل کی نفسیات سے اوپر اٹھ کر کھلے انداز میں سوچنا،اور پھر غیر متاثر ذہن کے تحت رائے قائم کر کے اپنا منصوبہ بنانا۔

مثبت طرز فکر کے برعکس وہ طرز فکر ہے جس کو منفی طرز فکر (negative thinking) کہا جا سکتا ہے۔مثبت طرز فکر اگر اپنی فکری صلاحیتوں کو عمل میں لانے کا نام ہے تو منفی طرز فکر یہ ہے کہ آدمی کی اپنی فکری صلاحیت ارتقاء نہ کر سکے،وہ صرف خارجی احوال کے زیر اثر سوچے اور اسی کے مطابق اپنی رائے بنائے۔

اس اعتبار سے دیکھئے تو زندگی کا سارا معاملہ صحیح سوچ یا غلط سوچ کا معاملہ ہے۔ صحیح سوچ کامیابی کا ذریعہ ہے، اور غلط سوچ ناکامی کا ذریعہ۔یہی اصول افراد کے لئے ہے اور یہی اصول

قوموں کے لئے بھی۔ آدمی نے اگر اپنے ذہن کو بند نہ رکھا ہو تو صحیح فکر کو پانا کچھ بھی مشکل نہیں۔ آدمی کی خود اپنی فطرت اسی کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ کائنات میں بکھری ہوئی نشانیاں اسی کا سبق دیتی ہیں۔ تاریخ کے تجربات یہی پیغام دے رہے ہیں۔ تمام علوم اسی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ ایسی حالت میں صحیح طرز فکر سے وہی شخص محروم رہ سکتا ہے جو آنکھ رکھتے ہوئے نہ دیکھے، کان رکھتے ہوئے نہ سنے، جو عقل رکھتے ہوئے سمجھنے سے انکار کردے۔

دوسرا نکتہ

کہا جاتا ہے کہ انسان ایک سوچنے والا حیوان (thinking animal) ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انسان کی تمام کارروائیاں اس کی سوچ کے تابع ہوتی ہیں۔ آدمی پہلے سوچتا ہے، اس کے بعد وہ عمل کرتا ہے۔ سوچ اگر درست ہو تو عمل بھی درست ہوگا۔ اور اگر سوچ درست نہ ہو تو عمل بھی شروع سے آخر تک غلط ہو کر رہ جائے گا۔ صحیح سوچ سے صحیح آغاز ملتا ہے اور صحیح آغاز صحیح نتیجہ تک پہنچاتا ہے۔

سیب یا کوئی پھل جب اپنی شاخ سے ٹوٹتا ہے تو وہ ہمیشہ زمین پر گرتا ہے۔ یہ واقعہ ہزاروں سال سے ہو رہا تھا۔ مگر وہ لوگوں کو بس ایک عادی واقعہ نظر آتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس میں سوچنے کی کوئی بات نہیں، کیوں کہ جو ہو رہا ہے وہی ہونا چاہیے۔

نیوٹن (وفات ۱۷۲۷) غالباً پہلا شخص تھا جس نے سیب کے پھل کو شاخ سے ٹوٹ کر نیچے گرتے ہوئے دیکھا تو وہ سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوا۔ اس کے ذہن میں بظاہر ایک انوکھی بات آئی: سیب شاخ سے ٹوٹ کر اوپر کیوں نہیں گیا، وہ نیچے کیوں آیا۔ یہ سوچ بظاہر انوکھی تھی مگر اس کے ذریعہ نیوٹن اس حقیقت تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا کہ زمین میں قوت کشش (gravitational pull) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اوپر کی چیز ہمیشہ نیچے آتی ہے۔ نیچے کی چیز کبھی اوپر نہیں جاتی۔

اسی طرح ہزاروں سال سے انسان کو بظاہر یہ دکھائی دیتا تھا کہ زمین ایک مسطح میدان کی

طرح چپٹی ہے۔ ظاہری مشاہدہ میں یہ نظریہ درست معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ اس کو ایک مسلّمہ کے طور پر مان لیا گیا۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ایک گہری سوچ والا آدمی سمندر کے کنارے ساحل پر کھڑا ہوا تھا۔ دور سمندر افق سے ملتا ہوا نظر آتا تھا۔ اچانک اس نے دیکھا کہ سمندر کے دوسرے سرے پر ایک نشان بر آمد ہوا۔ یہ ایک بحری جہاز کا مستول (Mast) تھا۔ دھیرے دھیرے مستول اوپر اٹھتا گیا یہاں تک کہ پورا جہاز سطح سمندر پر دکھائی دینے لگا۔

وہ آدمی سوچنے لگا کہ ایسا کیوں ہوا۔ زمین اگر چپٹی (flat) ہوتی تو جہاز دور سے بھی بیک وقت پورا دکھائی دیتا اور قریب سے بھی پورا۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ پہلے وہ دھندلا دکھائی دیتا اور بعد کو وہ صاف نظر آتا۔ مگر جب ایسا ہوا کہ جہاز پہلے تھوڑا سامنے آیا اور اس کے بعد دھیرے دھیرے پورا جہاز دکھائی دیا۔ اس سے اس آدمی نے سمجھا کہ زمین میں خم (curvature) ہے یعنی زمین تختہ کے مانند نہیں ہے بلکہ گیند کے مانند ہے۔ چنانچہ زمین کے خم کے ساتھ جہاز اوپر اٹھتا رہا یہاں تک کہ وہ پوری طرح سامنے آ گیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی میں سوچنے کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوچ ہی کے ذریعہ تمام نئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ سوچ ہی کے ذریعہ منصوبہ بندی ممکن ہوتی ہے۔ سوچ ہی کے ذریعہ ناکامی کو کامیابی میں تبدیل کیا جاتا ہے۔ سوچ ہی کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ کوئی شخص ماضی اور حال پر غور کر کے مستقبل کے لئے زیادہ بہتر نقشہ بنا سکے۔

تیسرا نکتہ

انسانی سماج میں ہمیشہ باہمی جھگڑے جاری رہے ہیں۔ ان جھگڑوں کا وجود کوئی لازمی چیز نہیں۔ یہ خود سوچنے والے انسان کے اوپر ہے کہ وہ چاہے تو اپنے آپ کو جھگڑوں میں پھنسائے اور چاہے تو اپنے آپ کو ان سے محفوظ رکھے۔ یہ معاملہ فرد کے لئے بھی ہے اور قوموں اور حکومتوں کے لئے بھی۔

مجھے ایک صاحب کا قصہ معلوم ہے۔ انھوں نے تجارت کی اور اس میں کافی کامیاب رہے۔ ان کا ایک رشتہ دار جس نے انھیں کے ساتھ تجارت شروع کی تھی وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کو اس کامیاب تاجر سے حسد ہو گیا۔ ایک شخص نے مذکورہ کامیاب تاجر کو بتایا کہ آپ کا فلاں رشتہ دار آپ کے خلاف ایسا اور ایسا کہتا ہے۔ تاجر نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے کئی بار اپنی بات کو دہرایا۔ آخر میں اس نے کہا کہ میں آپ کو بار بار بتا رہا ہوں کہ آپ کا فلاں رشتہ دار آپ کے خلاف بری بری باتیں پھیلا رہا ہے مگر آپ اس کا کوئی جواب ہی نہیں دیتے۔ مذکورہ تاجر نے نہایت اطمینان سے کہا: یہ ان کا پرابلم ہے، میرا پرابلم تو نہیں۔

مذکورہ تاجر نے اپنے حاسد رشتہ دار کی بات کو سنا اور ٹال دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے درمیان مزید کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا۔ بات لفظوں پر ختم ہو گئی۔ اس کے برعکس اگر یہ تاجر مذکورہ رشتہ دار کی بات پر بھڑک اٹھتا تو دونوں کے درمیان ایسی لڑائی چھڑ جاتی جس میں دونوں کی تباہی یقینی تھی۔

چوتھا نکتہ

۱۹۴۷ سے پہلے کے ہندستان کا واقعہ ہے۔ ایک گاؤں میں دو زمیندار رہتے تھے۔ ان میں سے ایک مذہبی تھا اور داڑھی رکھتا تھا۔ اور دوسرے کے چہرے پر داڑھی نہیں تھی۔ بے داڑھی والے زمیندار نے ایک بار داڑھی والے زمیندار کے یہاں شیرینی کا تحفہ بھیجا۔ داڑھی والے زمیندار نے اس کو یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ میں داڑھی منڈوں کا تحفہ قبول نہیں کرتا۔

بے داڑھی والا زمیندار اس کو برداشت نہ کر سکا۔ اس نے تحفہ کی واپسی کو اپنی توہین سمجھا۔ اس کے اندر زبردست انتقام بھڑک اٹھا۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان لڑائی شروع ہو گئی۔ ایک دوسرے کا کھیت کاٹنا، ایک دوسرے کے آدمی کو قتل کرنا، ایک دوسرے کے خلاف مقدمے چلانا، ایک دوسرے کو بدنام کرنا۔ اس طرح کی منفی کارروائیاں ۲۵ سال تک جاری رہیں۔ لڑائی کا یہ سلسلہ صرف اس وقت بند ہوا جب کہ دونوں کے گھر کے زیور تک بک گئے۔

دونوں میں یہ سکت ہی نہ رہی کہ وہ ایک دوسرے کے خلاف مزید کوئی کارروائی کر سکیں۔

انسانی سماج میں زیادہ تر جھگڑے الفاظ سے شروع ہوتے ہیں۔ لوگ مخالفانہ الفاظ سن کر بھڑک اٹھتے ہیں۔ اس کے بعد ان کی سوچ انتقام کے رخ پر چل پڑتی ہے۔ اور اس کے بعد وہ تمام صورتیں پیش آتی ہیں جن کو آپس کی لڑائی کہا جاتا ہے۔ منفی عمل ہمیشہ منفی سوچ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ منفی حالات میں بھی مثبت سوچ کو قائم رکھا جائے۔ منفی کارروائی کا جواب بھی مثبت انداز میں دیا جائے۔

اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جب بھی آپ کسی ناخوشگوار بات کو سنیں تو یہ سوچیں کہ کیا یہ محض الفاظ کا معاملہ ہے یا وہ حقیقی معنوں میں آپ کو کوئی نقصان پہنچانے والا ہے۔ اگر اس سے کسی حقیقی نقصان کا اندیشہ ہو تو اس کا تدارک کیجئے۔ ورنہ سادہ طور پر صرف یہ کیجئے کہ اس کو نظر انداز کر دیجئے۔

پانچواں نکتہ

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ انگریز انیسویں صدی میں عراق میں داخل ہو چکے تھے۔ ۱۹۱۷ میں انھوں نے بغداد کو فتح کیا۔ اس کے بعد وہاں ایک انگریز کونسلر (councillor) رہنے لگا۔ انگریز کونسلر جب شروع میں بغداد میں آیا تو صبح کے وقت اس کو محسوس ہوا کہ اس کی رہائش گاہ کے باہر عراقیوں کے "شور" کی آواز آرہی ہے۔ انگریز کونسلر نے فوراً اپنے مقامی سکریٹری کو بلایا۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیسا شور ہے۔ سکریٹری نے جواب دیا کہ یہ مسلمانوں کی صبح کی نماز کا وقت ہے اور وہ مسجدوں میں اس کے لئے اذان دے رہے ہیں۔ کونسلر نے دوبارہ پوچھا کہ اس سے برٹش امپائر کو کوئی خطرہ تو نہیں۔ سکریٹری نے جواب دیا کہ نہیں، اس میں خطرہ کی کوئی بات نہیں۔ اس کے بعد کونسلر نے کہا کہ پھر وہ جو کر رہے ہیں انھیں کرنے دو۔

اختلافی معاملات میں یہ بہترین پالیسی ہے۔ اگر کوئی شخص آپ کے لئے حقیقی خطرہ بن رہا ہو تو ضرور اس سے مقابلہ کیجئے۔ اور اس کو روکنے کی کوشش کیجئے۔ لیکن اگر وہ بات صرف الفاظ کی

حد تک ہو تو خواہ آپ کے جذبات کتنا ہی مجروح ہوتے ہوں اس کو نظر انداز کیجئے۔ جذبات کا مجروح ہونا کوئی نقصان کا مسئلہ نہیں ہے۔ وہ صرف ایک خیالی بات ہے۔ اور خیالی بات پر عملی اقدام کرنا دانش مند آدمی کا کام نہیں۔

چھٹا نکتہ

موجودہ دنیا میں کوئی آدمی اکیلا نہیں ہے۔ یہاں ہر آدمی کو دوسرے بہت سے لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا ہوتا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے سڑک کے اوپر ہر آدمی اپنی گاڑی کو دوسری بہت سی گاڑیوں کے ساتھ چلاتا ہے۔ ایسی حالت میں رد عمل کی پالیسی کبھی مفید نہیں ہو سکتی۔ اس دنیا میں کامیابی صرف اس شخص کے لئے ہے جو منفی حالات میں مثبت جواب دینا جانے۔

اس معاملے کی ایک دلچسپ مثال یہ ہے کہ سوامی وویکانند (وفات ۱۹۰۲) کے ایک مسیحی دوست نے ان کو جانچنا چاہا۔ اس نے سوامی جی کو اپنے گھر پر بلایا۔ وہاں ملاقات کے کمرے میں ایک میز تھی۔ مسیحی دوست نے ہر مذہب کی مقدس کتابیں ایک کے اوپر ایک اس میز پر رکھ دیں۔ اس کی ترتیب یہ تھی کہ سب سے نیچے ہندوؤں کی مذہبی کتاب گیتا تھی اور اس کے اوپر دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابیں۔ سوامی جی جب اس کمرے میں پہنچے تو ان کے مسیحی دوست نے میز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، سوامی جی، میز کے اوپر رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھئے اور اس کے اوپر تبصرہ کیجئے۔

مسیحی دوست کا اندازہ تھا کہ سوامی جی یہ منظر دیکھ کر بگڑ جائیں گے کہ ان کے مذہب کی کتاب کو سب سے نیچے رکھ دیا گیا ہے اور دوسرے مذہب کی کتابوں کو اس کے اوپر۔ کیوں کہ اس میں بظاہر ان کے اپنے مذہب کی توہین ہے اور دوسرے مذہبوں کی تعظیم۔ مگر سوامی جی اس کو دیکھ کر غصہ نہیں ہوئے۔ انھوں نے اس معاملے کو ٹھنڈے طریقہ سے لیا۔ اس بنا پر وہ اس قابل ہوگئے کہ وہ ایک منفی واقعہ کا مثبت جواب دے سکیں۔ وہ کتابوں کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا کہ بنیاد تو بہت اچھی ہے:

The foundation is really good.

یہ واقعہ مزید اس بات کی مثال ہے کہ آدمی اگر غصہ نہ ہو اور اعتدال پر قائم رہے تو وہ

اپنے نہیں کو ہے بنا سکتا ہے، وہ ایک غیر موافق واقعہ کو ایک موافق واقعہ میں تبدیل کر سکتا ہے۔

ان چند مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سوچنے کے عمل کی کتنی زیادہ اہمیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سوچ ہی کی سطح پر انسان کی ہر کامیابی اور ناکامی کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اعلیٰ زندگی نام ہے اعلیٰ سوچ کا۔ اگر آپ زندگی میں کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو اپنے اندر صحیح سوچ پیدا کیجئے۔ صحیح سوچ ہی کا دوسرا نام صحیح عمل ہے، اور صحیح عمل کا دوسرا نام کامیابی۔

ساتواں نکتہ

سوچ کی غلطی کی ایک مثال وہ ہے جس کو ثنائی طرز فکر (dichotmous thinking) کہا جاسکتا ہے یعنی کسی معاملہ میں صرف دو صورت کے دائرے میں سوچنا، جب کہ وہاں تیسری زیادہ بہتر صورت بھی موجود ہو۔

مثلاً ایک شخص آپ کے خلاف بدزبانی کرے۔ وہ آپ کے وقار کو مجروح کرے۔ ایسی صورت حال میں لوگ عام طور پر برداشت نہیں کرپاتے، وہ غصہ ہو کر فریق ثانی سے لڑ جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ برداشت کرنا بزدلی ہے اور اس کے مقابلہ میں لڑ جانا بہادرانہ دفاع۔ اب چونکہ بزدلی کے مقابلہ میں بہادری زیادہ بہتر چیز معلوم ہوتی ہے اسلئے وہ اس روش کو چھوڑ دیتے ہیں جس کو وہ بزدلی سمجھتے ہیں اور اس روش کو اختیار کر لیتے ہیں جس کے متعلق ان کا خیال ہوتا ہے کہ وہ ایک بہادرانہ روش ہے۔

مگر یہ سوچ کی غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ صورت حال میں ایک تیسری ممکن روش بھی ہے، اور وہ اس کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی مشتعل ہو کر لڑنے میں اپنا وقت ضائع نہ کرے بلکہ وہ اپنے آپ کو مثبت عمل پر قائم رکھے۔ یہ تیسری روش عین وہی چیز ہے جس کو ایک مشہور مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے ـــــ کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔

یہ محض ایک اخلاقی بات نہیں، بلکہ یہ زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے۔ یہ دنیا طرح طرح

کے لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔اس بنا پر اس دنیا میں بار بار ناخوشگوار تجربے پیش آتے ہیں۔ایسی حالت میں آدمی اگر ہر ناپسندیدہ بات پر بھڑکتا رہے، وہ ہر اشتعال انگیزی پر مشتعل ہو جائے تو وہ کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے وقت اور اپنی صلاحیت کو دوسروں کے خلاف کارروائی میں ضائع کرتا رہے گا۔ جب کہ صحیح بات یہ ہے کہ اپنی قوت اور اپنی صلاحیت کو مکمل طور پر صرف اپنی مثبت تعمیر کے لئے استعمال کیا جائے۔

اس دنیا میں آدمی کے پاس وقت بہت کم ہے اسی کے ساتھ اس کے وسائل بھی بہت محدود ہیں۔ایسی حالت میں کوئی بھی شخص اس کا تحمل نہیں کر سکتا کہ وہ دوسروں کو سبق سکھانے یا ان سے بدلہ لینے کے لئے ان کے پیچھے دوڑتا رہے۔ایسی روش کی قیمت آدمی کو یہ دینی پڑتی ہے کہ اس کی اپنی تعمیر و ترقی کا عمل رک جاتا ہے۔

آٹھواں نکتہ

آدمی پیدائشی طور پر معیار پسند (idealist) ہے۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ معیار کی تلاش میں رہتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں خیر برتر کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔اس قسم کی معیار پسندی نظری طور پر بہت اچھی معلوم ہوتی ہے مگر عملی طور پر وہ صرف تباہ کن ہے۔

اس کا سبب یہ ہے کہ کوئی آدمی اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو دوسرے لوگوں کے ساتھ زندگی گزارنا ہوتا ہے۔ ہر آدمی کا اپنا انٹرسٹ ہے۔ ہر آدمی کی اپنی مصلحتیں ہیں۔ ہر آدمی فائدہ اور نقصان کا اپنا ذاتی نظریہ رکھتا ہے۔اس صورت حال نے موجودہ دنیا میں ہر ایک کے لئے معیار طلبی کو نا قابل حصول بنا دیا ہے۔اس بنا پر اس دنیا میں قابل عمل صورت صرف ایک ہے،اور وہ دوسروں کے ساتھ ہم آہنگی (adjustment) ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں آدمی کے لئے جو انتخاب (choice) ہے، وہ خیر اور شر کے درمیان نہیں ہے، بلکہ وہ چھوٹی برائی (lesser evil) اور بڑی برائی (greater evil) کے درمیان ہے۔اب کسی انسان کے لئے معقول روش یا صحیح طرز فکر یہ ہے کہ جب کوئی معاملہ پیش

آئے تو وہ بڑی برائی کو چھوڑ دے اور چھوٹی برائی پر راضی ہو جائے۔

نواں نکتہ

فن تفکیر (art of thinking) کے سلسلہ میں ایک اہم پہلو ہے —— ایک چیز اور دوسری چیز کے درمیان فرق کو جاننا۔ دنیا میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو بظاہر مشابہہ مگر حقیقۃً وہ ایک دوسرے سے مختلف سے ہوتی ہیں۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے بعض اوقات آدمی کو بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔

مثلاً ایک شخص سروس کرتا ہے، اور دوسرا آدمی تاجر ہے۔ سروس کرنے والے آدمی کو مہینہ پورا ہونے پر جو رقم ملتی ہے وہ پوری کی پوری اس کی اپنی آمدنی ہوتی ہے۔ اگر وہ ملی ہوئی پوری رقم خرچ کردے تو اس سے اس کی سروس کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ اس کے برعکس تاجر کے پاس پورے مہینہ میں جو رقم آئی، اگر وہ اس پوری رقم کو اپنی ذاتی ضرورت میں خرچ کردے اور ہر مہینہ ایسا ہی کرتا رہے تو اس کی تجارت ختم ہو جائے گی اور وہ دیوالیہ ہو کر رہ جائے گا۔ کیوں کہ تاجر کے پاس جو رقم آتی ہے اس میں بمشکل دس فیصد اس کی اپنی آمدنی ہوتی ہے، بقیہ رقم مارکیٹ کی ہوتی ہے جس کو اسے دوسروں کو لوٹانا ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں ضروری ہے کہ سروس اور تجارت کے فرق کو سمجھا جائے ورنہ آدمی کو سخت نقصان اٹھانا پڑے گا۔

اس اصول کا تعلق زندگی کے اکثر معاملات سے ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ جب بھی کوئی معاملہ پیش آئے تو ظاہری یا جزئی مشابہت کی بنا پر وہ غیر حقیقی رائے قائم کرنے کی غلطی نہ کرے۔ وہ دو چیزوں کے فرق کو جانے اور اس کے مطابق اپنی رائے قائم کرے۔ جو آدمی اس حکمت کو نہ سمجھے اس کا حال ایک ایسے ڈرائیور کا ہوگا جو خالی سڑک اور بھری سڑک کے فرق کو نہ جانے اور دونوں جگہ یکساں طور پر اپنی گاڑی دوڑانے لگے۔

دسواں نکتہ

اس سلسلہ کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ آدمی اپنے ذہن کو اس طرح تربیت دے کہ وہ گرد و

پیش کے واقعات سے سبق لے سکے۔ سبق لینے کا مزاج ایک طرف آدمی کے لئے ذہنی ارتقاء کا ذریعہ ہے، اور دوسری طرف وہ اس کو غیر ضروری نقصان سے بچاتا ہے۔

ایک نوجوان نے شہر میں ایک دکان کھولی۔ کچھ دنوں کے بعد اس میں چوری ہو گئی۔ ایک بزرگ نے نوجوان سے اس کی تفصیل پوچھی، نوجوان نے بتایا کہ مجھ کو تجربہ نہیں تھا، میں نے دکان میں ایک معمولی تالا لگادیا۔ وہ نہایت آسانی سے کھل سکتا تھا۔ چنانچہ کوئی شخص رات کو آیا اور تالا کھول کر اطمینان کے ساتھ چوری کی اور بھاگ گیا۔

بزرگ نے کہا کہ اس معاملہ میں خود تجربہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ سیکڑوں لوگوں کا تجربہ موجود ہے کہ دکان میں مضبوط تالا لگانا چاہئے۔ دکان میں معمولی تالا لگانا چور کو چوری کی دعوت دینا ہے۔

ہماری دنیا اسباق اور نصیحتوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر طرف کوئی نہ کوئی ایسی چیز موجود ہے جس سے آدمی اپنے لئے مفید سبق لے سکے۔ اور بہتر انداز میں اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ چیزوں کو کھلی آنکھ سے دیکھا جائے اور کھلے ذہن کے ساتھ ان پر غور کیا جائے۔

حقیقت پسندی

خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروق کا ایک قول ہے: **لیس العاقل الذی یعرف الخیر من الشر و لکنه الذی یعرف خیر الشرین** (**العبقرایات الاسلامیة**، ص ۵۰۵) یعنی دانش مند وہ نہیں ہے جو شر کے مقابلہ میں خیر کو جانے۔ بلکہ دانش مند وہ ہے جو یہ جانے کہ دو شر میں سے بہتر شر کون سا ہے۔

اجتماعی زندگی میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد اور دوسرے فرد یا ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان نزاعات پیدا ہوتے ہیں۔ ایک اور دوسرے کے درمیان اختلافات ظہور میں آتے ہیں۔ ایسے مواقع پر ہمیشہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ معاملہ کو طے کرنے کی صورت کیا ہو۔ وہ کون سا رہنما اصول ہے جس کی روشنی میں باہمی نزاعات کو طے کیا جائے۔

ایسے موقع پر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ معاملہ کو خیر اور شر یا انصاف اور بے انصافی کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حصے میں شر نہ آئے بلکہ خیر آئے۔ وہ اپنے آپ کو بے انصافی سے بچائیں اور جو انصاف ہے اس کو حاصل کریں۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس قسم کے لوگ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں۔ ساری کوشش کے باوجود آخر میں انھیں شکایت اور نقصان کے سوا کچھ اور نہیں ملتا۔

اس کا سبب کیا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں کوئی بھی شخص اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح کے معاملہ میں ہر نزاع کے دو فریق ہوتے ہیں۔ کسی بھی فیصلہ کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ ایک فریق کے ساتھ دوسرا فریق بھی اس پر راضی ہو۔ ایک فریق جس چیز کو خیر یا انصاف سمجھتا ہو، اگر دوسرا فریق اس کو تسلیم کرنے پر راضی نہ ہو تو اس کا نتیجہ دو طرفہ ٹکراؤ ہو گا۔ اور ٹکراؤ ہمیشہ مسئلہ کو بڑھانے والا ہوتا ہے نہ کہ اس کو گھٹانے والا۔

ایسی حالت میں دانش مندی کا تقاضا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ معاملہ کو خیر اور شر یا انصاف اور بے انصافی کی نظر سے نہ دیکھا جائے بلکہ اس کو ممکن اور ناممکن کی نظر سے دیکھا جائے۔ پھر جو چیز عملی طور پر ممکن ہے اس کو لیا جائے اور جو چیز عملی طور پر ناممکن ہے اس کو چھوڑ دیا جائے۔

اس معاملہ کی ایک تاریخی مثال یہ ہے کہ بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان فلسطین کے مسئلہ پر نزاع پیدا ہوئی جو اس کے بعد پچاس برس تک چلتی رہی۔ یہودیوں کا یہ کہنا تھا کہ دو فریقوں کے درمیان امن کا معاہدہ ہو جائے۔ لیکن عرب اس کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ امن صرف عدل کی بنیاد پر ہو سکتا ہے، عدل نہیں تو امن بھی نہیں۔ مگر بے شمار قربانیوں کے باوجود عربوں کا یہ نظریہ فیل ہو گیا اور بیسویں صدی کے آخر میں انھوں نے عدل کی شرط کو پس پشت ڈال کر صرف امن کے مقصد کے تحت اسرائیل سے معاہدہ کر لیا۔

نظری طور پر یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ جب دو فریقوں میں نزاع کی صورت پیدا ہو جائے تو ان کے درمیان امن کا قیام عدل کی بنیاد پر ہونا چاہیے۔ آئیڈیلزم کے اعتبار سے یہ نظریہ بہت اچھا ہے مگر عملی اسباب بتاتے ہیں کہ اس قسم کا آئیڈیل کبھی قابلِ حصول نہیں ہوتا۔ اس طرح کے نزاعی معاملات میں دانش مندی یہ ہے کہ آدمی نظری انصاف پر اصرار نہ کرے بلکہ عملی انصاف پر راضی ہو جائے۔

اصل یہ ہے کہ امن اور انصاف کو ایک دوسرے کے ساتھ بریکٹ کرنا بجائے خود غلط ہے۔ اس دنیا میں امن انصاف کے لیے نہیں ہوتا۔ امن کا تعلق مواقع کار سے ہے، نہ کہ عدل و انصاف سے۔ امن اس لیے حاصل نہیں کیا جاتا کہ اس کے ساتھ انصاف حاصل ہو جائے۔ بلکہ امن اس لیے قائم کیا جاتا ہے تاکہ وہ مواقع کار حاصل ہوں جن کو استعمال کر کے عدل و انصاف تک پہنچا جا سکے۔

مثال کے طور پر ۱۹۴۸ میں فلسطین کی جو صورتحال تھی اس میں عربوں کو فلسطین کا بیشتر

حصہ ملا ہوا تھا۔اس وقت دانش مندانہ پالیسی یہ تھی کہ اس صورتحال کو قبول کر کے یہودیوں سے وہ صلح کر لی جائے جو پچاس برس بعد کی گئی۔اگر ایسا کیا جاتا تو اس کا زبردست فائدہ ہوتا۔اس طرح عربوں کے لیے ممکن تھا کہ وہ امن قائم کر کے اپنے تعمیر و استحکام کی جدوجہد شروع کر دیں۔ پچھلے پچاس برس میں انھوں نے انصاف کے حصول کے نام پر بے شمار دولت ضائع کی ہے۔اور لاکھوں قیمتی جانوں کا نقصان کیا ہے۔قیام امن کی صورت میں ان کا یہ تمام سرمایہ تعمیر و استحکام کے محاذ پر لگ جاتا۔اس مثبت پالیسی کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ ان تمام چیزوں کو لڑائی کے بغیر کامیاب طور پر حاصل کر لیتے جس کو وہ لڑائی کے ذریعہ ناکام طور پر حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

اس معاملہ کی بہترین مثال اسلام کے دور اول کا وہ تاریخی واقعہ ہے جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرک قبائل کے درمیان زبردست نزاع تھی۔ان مشرکین نے آپ کو آپ کے وطن مکہ سے نکلنے پر مجبور کر دیا تھا۔اور مسلمانوں کے خلاف دوسری بہت سی ناانصافیاں کر رہے تھے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم اگر امن کے حصول کے لئے عدل کی شرط لگاتے تو دونوں فریقوں کے درمیان کبھی امن قائم نہ ہوتا۔ مگر آپ نے یہ کیا کہ عدل وانصاف کے سوال کو الگ کر کے مشرکین سے گویا "امن برائے امن" کے اصول پر صلح کر لی۔اس امن کو آپ نے کام کے ایک موقع کے طور پر لیا۔اور اس کو اسلام کی تعمیر و استحکام کے لیے استعمال کیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صرف دو سال کے اندر مزید اضافہ کے ساتھ وہ سب کچھ حاصل ہو گیا جس کو آپ نے بظاہر معاہدہ امن کے وقت کھو دیا تھا۔

دانش مندی کا یہ اصول جس طرح اجتماعی نزاعات کے لیے ہے۔اسی طرح وہ انفرادی نزاعات واختلافات کے لیے بھی ہے۔انفرادی معاملات میں بھی کامیابی کا واحد طریقہ یہی ہے کہ خیر اور شر یا صحیح اور غلط کی بنیاد پر معاملات کو طے کرنے کے بجائے ممکن اور ناممکن کی بنیاد پر ان کو

طے کیا جائے۔

گھر کے اندر دو مردوں یا دو عورتوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو تو یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہئے کہ عملی حالات کے اعتبار سے ممکن کیا ہے اور ناممکن کیا ہے۔ حق اور ناحق یا صحیح اور غلط کی بحث میں پڑنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اختلاف کبھی ختم نہ ہوگا۔ اس کے برعکس اگر آپ ممکن پر راضی ہو جائیں تو بیک وقت آپ کو دو فائدے حاصل ہوں گے ــــــ اختلاف کا فوری خاتمہ اور مواقعِ کار کا حصول۔

یہی اصول تمام انفرادی نزاعات کے لیے ہے۔ زندگی کی سرگرمیوں کے درمیان ہر شخص کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اختلاف اور نزاع کی صورتیں پیش آتی ہیں۔ کبھی مالی اور کبھی غیر مالی۔ ایسے مواقع پر جو شخص حق اور باطل یا صحیح اور غلط کی بحث چھیڑے۔ وہ بلاشبہہ غیر دانش مند انسان ہے۔ اس کے بجائے جو عملی تقاضوں کو سمجھے اور ان کی رعایت کرتے ہوئے ممکن پر راضی ہو جائے تو ایسا ہی شخص عقل مند ہے، اور یہی وہ شخص ہے جو اس دنیا میں کامیابی حاصل کرے گا۔

اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی نزاع پیدا ہو تو لوگوں کی توجہ تمام تر اس پر لگ جاتی ہے کہ از روئے انصاف کیا ہونا چاہئے یا ان کے نزدیک اس معاملہ میں حق کیا ہے اور پھر اس حق کے حصول کے لئے فریق ثانی سے لڑائی چھیڑ دیتے ہیں۔ یہ لڑائی اکثر سالہا سال تک جاری رہتی ہے اور اکثر کسی مثبت نتیجہ تک نہیں پہنچتی۔ اس طرح کے موقع پر دوسرا طریقہ یہ ہے کہ یہ سوچا جائے کہ مفروضہ حق کے حصول میں جو وقت اور طاقت خرچ ہوگی اس کو مقابلہ آرائی سے بچا کر اپنی مثبت تعمیر میں استعمال کیا جائے۔

ٹکراؤ ہمیشہ حق کے حصول کے نام پر کیا جاتا ہے۔ مگر عملی طور پر ٹکراؤ کا نتیجہ ہمیشہ یہ نکلتا ہے کہ اس کے دوران نہایت قیمتی مواقع ضائع ہو جاتے ہیں۔ اس دنیا میں عقلمندی یہ ہے کہ ہر معاملہ میں یہاں عملی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے۔ ایک شخص اپنی ذاتی زندگی میں آئیڈیل کو اپنا نشانہ بنا سکتا ہے، مگر جب اجتماعی زندگی کا معاملہ ہو تو اس کو ہمیشہ پریکٹکل بن جانا چاہئے۔

دانش مند کون

ایک برطانوی مصنف ولیم رالف انگ (William Ralph Inge) کا قول ہے کہ —
دانش مند وہ ہے جو چیزوں کی اضافی قدر کو جانے:

The wise man is he who knows the relative value of things.

اس قول کا مطلب کیا ہے اس کو مثال سے سمجھئے۔ ایک طالب علم کو امتحان دینا ہے۔ وہ وقت کے مطابق اپنے گھر سے اسکول کے لئے روانہ ہوتا ہے۔ راستہ میں ایک جاہل لڑکا اس سے الجھ جاتا ہے اور اس کو گالی دیتا ہے جس کے نتیجہ میں طالب علم کو غصہ آجاتا ہے۔

اب طالب علم اگر غصہ ہو جائے اور مذکورہ لڑکے سے انتقام لینے کے لئے اس سے الجھ جائے تو عین ممکن ہے کہ اس جھگڑے میں اتنی زیادہ دیر ہو جائے کہ وہ وقت پر امتحان حال تک نہ پہنچے اور نتیجۃً اس کا ایک سال ضائع ہو جائے۔

اسی طرح ایک شخص کو ضروری سفر کرنا ہے۔ وہ گھر سے روانہ ہوتا ہے تاکہ ریلوے اسٹیشن پہنچے اور ٹرین پر سوار ہو کر وقت پر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائے۔ لیکن جب وہ گھر سے نکلا تو راستے میں ایک شخص سے اس کا جھگڑا ہو گیا۔ اب اگر وہ دیر تک اس آدمی سے جھگڑتا رہے تو عین ممکن ہے کہ اس کو اتنی زیادہ دیر ہو جائے کہ جب وہ ریلوے اسٹیشن پہنچے تو اس کو معلوم ہو کہ اس کی ٹرین چلی گئی۔

ان مثالوں پر غور کیجئے۔ مذکورہ دونوں شخصوں کا ایک مسئلہ وہ تھا جو خود مقام واقعہ پر موجود تھا۔ یعنی ایک شخص کا انھیں گالی دینا یا زیادتی کرنا۔ یہ معاملہ کا وہ پہلو تھا جو براہ راست عین موقع کے وقت دکھائی دے رہا تھا۔ اسی کے ساتھ وہاں ایک چھپا ہوا پہلو بھی تھا جو بظاہر مقام واقعہ پر موجود نہ تھا مگر ایک صاحب بصیرت آدمی غور کر کے اسے جان سکتا تھا۔ وہ یہ کہ اگر ان جاہلوں سے ٹکراؤ کیا جائے اور ان کو سزا دینے کی کوشش کی جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ایک اور انتہائی

اہم مصلحت تباہ ہو جائے گی۔ یعنی وقت پر امتحان ہال یا ریلوے اسٹیشن نہ پہنچنا اور محض ایک وقتی نوعیت کی جذباتی تسکین کی خاطر زیادہ بڑے فائدہ سے اپنے آپ کو محروم کرلینا۔

مذکورہ قول میں اسی دوسرے یا بظاہر دکھائی نہ دینے والے پہلو کو معاملہ کا اضافی پہلو کہا گیا ہے۔ معاملہ کا ابتدائی پہلو، یعنی زیادتی کرنے والے کی زیادتی، ہر آنکھ والا دیکھتا ہے مگر معاملہ کے دوسرے پہلو یا اضافی قدر (relative value) کو وہی شخص دیکھے گا جو گہری بصیرت کا حامل ہو اور اپنے اقدام کا فیصلہ عقلی غور و فکر کے تحت کرتا ہو نہ کہ محض وقتی جذبات کے تحت۔

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں اکثر معاملات میں یہ دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ غیر دانش مند آدمی صرف سامنے کی صورت حال کو دیکھ پاتا ہے اور اس کے مطابق کارروائی کر کے اپنے معاملہ کو بگاڑ لیتا ہے۔ دانش مند انسان وہ ہے جو معاملہ کے دیگر پہلوؤں کو دیکھ سکے۔ جو سامنے کی صورت حال سے اوپر اٹھ کر ان حقیقتوں کا ادراک کرلے جو اگرچہ مقام واقعہ پر موجود نہیں مگر آخر کار ظاہر ہو کر وہی فیصلہ کن بن جائیں گی۔

موجودہ دنیا اسی دانش مندی کا امتحان ہے۔ جو آدمی اس اعتبار سے دانش مند ثابت ہو وہی اس دنیا میں کامیاب ہوگا۔ اور جو آدمی اس دانش مندی کا ثبوت نہ دے سکے اس کے لئے یہاں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام مقدر نہیں۔

حکمتِ اعراض

ایک صاحب اپنے خط مورخہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۹ میں لکھتے ہیں: میں نے ہندی اخبار "ہندستان" کا شمارہ ۲۸ ستمبر ۱۹۹۹ پڑھا۔ اس کے اداریہ میں یہ لکھا تھا کہ حال میں سورت (گجرات) میں "گنیش وسرجن" کا جلوس نکلا۔ اس موقع پر پولیس اور جلوس کے درمیان ٹکراؤ ہو گیا۔ پتھراؤ اور فائرنگ کے نتیجہ میں جلوس کے آٹھ افراد ہلاک اور کئی درجن زخمی ہو گئے۔ یہ جلوس شہر کے مسلم محلّہ کی ایک مسجد کے پاس سے گزر رہا تھا۔ ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ مسلم اور ہندو یا مسلم اور پولیس کے درمیان لڑائی ہو جاتی مگر عملاً اس کا الٹا ہوا۔ مسلمانوں نے وہاں پر صبر کا رویہ اپنایا جس کی وجہ سے انھیں اس کا پھل مل گیا۔ اس میں کسی بھی مسلمان کا نقصان نہیں ہوا۔ کیوں کہ ٹکراؤ انتظامیہ اور ہندوؤں کے درمیان ہوا تھا۔ یہ پڑھ کر آپ کی وہ بات یاد آگئی جو آپ "الرسالہ" یا کئی دیگر کتابوں میں لکھ چکے ہیں۔ (سہیل احمد، حسن البناء منزل، جامعۃ الفلاح، بلریا گنج، اعظم گڈھ)

"سورت" کا یہ واقعہ تمام اخباروں میں آچکا ہے۔ اس واقعہ میں بہت بڑا سبق ہے۔ اس سبق کی طرف الرسالہ میں بار بار نشاندہی کی جاتی رہی ہے۔ وہ یہ کہ —— مسلم کش فسادات کا اصل سبب جلوس کا نکلنا اور اس کا مسلم محلّہ سے گزرنا نہیں ہے بلکہ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ جب جلوس نکلے تو محلّہ والے اس کے مقابلہ میں غیر حکیمانہ رویہ اختیار کریں۔ حکیمانہ رویہ ہمیشہ حفاظت کا ضامن ہوتا ہے اور غیر حکیمانہ رویہ ہمیشہ نقصان کا باعث بنتا ہے۔

اس معاملہ کا خلاصہ یہ ہے کہ جلوس کے وقت وہاں کے مسلمان اگر منفی رد عمل کا طریقہ اختیار کریں تو مسئلہ مسلم ورسس پولیس بن جائے گا۔ اور اگر وہاں کے مسلمان ایسے موقع پر اعراض کا رویہ اختیار کریں تو سارا مسئلہ جلوس ورسس پولیس بن جائے گا۔ اس اصول کی صداقت بار بار فسادات کی صورت میں سامنے آچکی ہے۔ سورت کا مذکورہ واقعہ اس حکمت کی ایک مثبت مثال ہے۔

دور اول کے مسلمان مخالفین کی سازشوں اور زیادتیوں میں گھرے ہوئے تھے۔ اس وقت نصیحت کرتے ہوئے ان سے کہا گیا کہ: اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرو تو ان کی کوئی سازش تم کو نقصان نہ پہنچائے گی۔ (آل عمران ۱۲۰) اب یہ غور کیجئے کہ دشمن کی سازشوں کے مقابلہ میں صبر کس طرح ڈھال بن جاتا ہے۔ اور زیر سازش گروہ کو اس کے نقصان سے محفوظ رکھتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں جب بھی کوئی ناخوشگوار صورت حال پیش آئے تو اس کے مقابلہ میں رد عمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اشتعال انگیز صورت حال کو دیکھ کر آدمی بھڑک اٹھے اور فوری جذبات کے تحت جوابی کارروائی کرنے لگے۔ اور دوسرا یہ کہ فریق ثانی کی طرف سے اشتعال انگیزی کے باوجود وہ مشتعل نہ ہو بلکہ اپنے جذبات کو روک کر پورے معاملہ پر غور کرے۔ اور اس کے بعد جو کچھ کرے ٹھنڈے ذہن کے تحت سوچ سمجھ کر کرے۔

مذکورہ تقسیم میں پہلی قسم کے رد عمل کا نام غیر صابرانہ رد عمل ہے اور دوسری قسم کے رد عمل کا نام صابرانہ رد عمل۔ دوسرے لفظوں میں اس فرق کو اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ غیر صابرانہ رد عمل پیش آمدہ صورت حال کا جذباتی جواب (emotional response) ہے۔ اس کے برعکس صابرانہ رد عمل یہ ہے کہ پیش آمدہ صورت حال کے مقابلہ میں جو جوابی کارروائی کی جائے وہ ایک سوچا سمجھا جواب (considered response) ہو۔

صبر کوئی بے عملی نہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی کے سامنے کوئی ناپسندیدہ صورت حال پیش آئے تو وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ صبر اعلیٰ ترین بہادری ہے۔ جب ایک آدمی بے صبری کے ساتھ جذباتی اقدام کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو گیا۔ اس کے برعکس جب ایک آدمی صبر والی روش اختیار کرتا ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا ہے کہ اس نے اپنے بھڑکے ہوئے جذبات کو قابو میں رکھا۔ اس نے اپنے جذبات کو اپنی عقل پر غالب ہونے نہیں دیا۔

غلط سوچ کا مسئلہ

ماہنامہ الرسالہ کے ایک قاری لکھتے ہیں: آپ نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ آدمی کے لئے جب کامیابی کا ایک موقع ختم ہو جائے تو اس کو مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ کیوں کہ اس کے بعد دوسرا موقع وہیں اس کے لئے موجود رہتا ہے جس سے وہ اپنی ترقی کا سفر دوبارہ شروع کر سکے۔ سوال یہ ہے کہ آدمی کس طرح جانے کہ یہاں اس کے لئے دوسرا موقع موجود ہے۔ (سہیل احمد، نئی دہلی)

نئے موقع کو پہچاننے کی شرط صرف ایک ہے، وہ یہ کہ آدمی بند ذہن کے تحت نہ سوچے بلکہ وہ کھلے ذہن کے ساتھ سوچنے کے لئے تیار ہو۔ وہ دوسروں کو قصوروار ٹھہرانے کے مزاج سے اپنے آپ کو اوپر اٹھالے۔ اس کی ایک مثال ہندستان کے مسلمان ہیں۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہمارے لیڈر اور ہمارے اخبارات مسلمانوں کو یہ بتاتے تھے کہ ہندستان میں ان کا مقابلہ ہندو اکثریت سے ہے۔ یہاں وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتے۔ ۱۹۴۷ میں تقسیم کے بعد بھی یہی ذہن باقی رہا۔ تمام بولنے والے اور لکھنے والے لوگ مسلمانوں کو یہی منفی سبق دیتے رہے۔ کچھ لوگ اس حد تک گئے کہ انھوں نے کہنا شروع کیا کہ یہاں کا اکثریتی فرقہ ہندستانی مسلمانوں کے حق میں اس ملک کو دوسرا اسپین بنانا چاہتا ہے۔

اس غوغا آرائی نے مسلمانوں کے ذہن کو اتنا زیادہ بگاڑا کہ وہ سمجھنے لگے کہ ہندستان میں ان کے لئے کامیابی اور ترقی کے مواقع سرے سے موجود ہی نہیں۔ میں ۱۹۴۷ سے اس کے خلاف لکھتا اور بولتا رہا ہوں۔ آخر کار آزادی کے تقریباً ۴۰ سال بعد مسلمانوں کا ذہن بدلنا شروع ہوا۔ اب ان کی سمجھ میں آیا کہ ہندستان میں ان کے لئے ہر قسم کے مواقع کھلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اب یہاں کے مسلمان ہر میدان میں مسلسل ترقی کر رہے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام فطرت کے قوانین کے تحت چلتا ہے نہ کہ کسی متعصب فرقہ کے منصوبوں یا سازشوں کے تحت۔ کوئی فرقہ یا گروہ بالفرض چاہے بھی تو فطرت اس کے

راستہ میں رکاوٹ بن جائے گی اور وہ تاریخ کے پہیہ کو الٹی طرف گھمانے میں کامیاب نہ ہوگا۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اس دنیا کا نظام فطرت کے اٹل قانون کے تحت چل رہا ہے نہ کہ کسی گروہ کی سازش کے تحت۔ فطرت کے اس قانون کا ایک حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ وہ اکثر حالات میں کمزور فریق کا ساتھ دیتا ہے۔ وہ نام نہاد بڑے گروہ کے مقابلہ میں چھوٹے گروہ کی حمایت کرتا ہے۔ یہ قانون قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے: کتنی ہی چھوٹی جماعتیں اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں۔ (البقرہ ۲۴۹)

ایک کمزور گروہ اپنے مقابلہ میں طاقتور گروہ سے کیوں کر بڑھ جاتا ہے اور فطرت کا قانون کس طرح اس کا مددگار بنتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ خالق فطرت نے پیدائشی طور پر ہر انسان کے اندر اتھاہ امکانات رکھ دیے ہیں۔ ہر آدمی پیدائشی طور پر غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ہے۔ مگر ابتدائی طور پر یہ صلاحیت سوئی ہوئی حالت میں ہوتی ہے۔ یہ تمام اعلیٰ امکانات اس کے اندر بالقوۃ طور پر موجود ہوتے ہیں۔ یہ انسان کا اپنا معاملہ ہے کہ وہ اس بالقوۃ (potential) کو بالفعل (actual) میں تبدیل کرے۔

یہاں دوبارہ فطرت کا قانون یہ ہے کہ یہ تبدیلی دباؤ کے ذریعہ ہوتی ہے۔ یعنی کسی فرد یا گروہ کے اوپر حالات کا جتنا زیادہ دباؤ پڑتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ یہ عین وہی فطری معاملہ ہے جو مثال کے طور پر، گنے کے ساتھ پیش آتا ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے، ہر گنا رس سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ مگر معمول کے حالات میں یہ رس گنے سے باہر نہیں آتا۔ گنے کا رس صرف اس وقت اندر سے نکل کر باہر آتا ہے جب کہ اس پر غیر معمولی دباؤ پڑے۔ گنے کو اگر آپ نرم روئی میں رکھ دیں تو اس کا رس کبھی باہر نہیں آئے گا۔ لیکن جب آپ گنے کو کریشر (crusher) میں ڈالتے ہیں تو اس کے اندر بھرا ہوا میٹھا رس نکل کر باہر آجاتا ہے۔

یہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان بھی ہمیشہ دباؤ کے حالات میں ترقی کرتا ہے۔ یہی اصول فرد کے لئے بھی ہے اور یہی اصول جماعت کے لئے بھی۔ اس معاملہ کو مشہور برطانوی مورخ

آرنلڈ جے ٹوائن بی نے اپنی کتاب مطالعۂ تاریخ (A Study of History) میں کامیابی کے ساتھ واضح کیا ہے۔ ۱۲ جلدوں کی اس کتاب میں اس نے بتایا ہے کہ تاریخ کی تمام بڑی بڑی تہذیبوں کو جو لوگ وجود میں لائے وہ اقلیت میں تھے۔ یہ دراصل اقلیتی گروہ ہے جو تاریخ کے تمام بڑے بڑے واقعات کے پیچھے کام کرتا رہا ہے۔

ٹوائن بی کے مطابق، اس کا اصول یہ ہے کہ اکثریتی گروہ کی طرف سے اقلیتی گروہ کو چیلنج پیش آتا ہے۔ یہ چیلنج اقلیتی گروہ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اکثریتی گروہ کے مقابلہ میں زیادہ کام کرے۔ وہ اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لئے اپنی صلاحیتوں کو دوسروں سے زیادہ استعمال کرے۔ حالات کا یہ دباؤ اقلیتی گروہ کو ابھارتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ہیروانہ کردار ادا کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ٹوائن بی نے فطرت کے اس اصول کو تاریخ کی اکیس تہذیبوں کی عملی مثال سے ثابت کیا ہے۔

فطرت کا یہی قانون ہندستانی مسلمانوں پر صادق آتا ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان میں انگریزوں کی حکومت تھی۔ وہ اپنی سیاسی مصلحت کے تحت ملک کے چھوٹے اور بڑے گروہ کے درمیان ایک موازنہ (بیلنس) قائم کئے ہوئے تھے۔ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ کو جب ہندستان آزاد ہوا اور یہاں جمہوری دور آیا تو انگریز کا قائم کردہ موازنہ ٹوٹ گیا۔ اب مسلمانوں کی حیثیت اقلیتی گروہ کی ہو گئی اور ہندوؤں کی حیثیت اکثریتی گروہ کی۔ اس کے بعد ہندستانی مسلمانوں کے لئے بہت سے مسائل پیدا ہو گئے جو انگریزوں کے زمانے میں موجود نہ تھے۔

ہندستانی مسلمانوں کے لئے بظاہر یہ ایک مسئلہ تھا۔ مگر فطرت کے قانون کے مطابق وہ ایک چیلنج تھا۔ اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ مسلمانوں کی چھپی ہوئی قوتوں کو بیدار کرنے کے ہم معنی تھا۔ بیداری کا یہ عمل ابتدائی طور پر ۱۹۴۷ کے بعد ہی شروع ہو گیا تھا۔ مگر اپنے پہلے دور میں وہ غیر شعوری حالت میں عمل کرتا رہا۔ اس کے بعد دوسرا دور آیا اور بیداری کا یہ عمل شعوری طور پر شروع ہو گیا۔ اب یہ عمل اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ ہر جگہ اس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

کچھ عرصہ پہلے دہلی میں مسلمانوں کا ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع تھا: مسلمانوں کا معاشی پچھڑا پن کیوں؟ یہاں مختلف مقررین نے اظہار خیال کیا۔ میں نے اپنی تقریر میں کہا کہ یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے کہ اس ملک کے مسلمان پچھڑ گئے ہیں۔ میں نے کہا کہ اصل حقیقت برعکس طور پر یہ ہے کہ اس ملک کے تقریباً ہر مسلمان نے ۱۹۴۷ کے بعد ترقی کی ہے۔ میں نے کہا کہ صنعتی انقلاب کے بعد ساری دنیا میں اور خود ہندستان میں ایک اقتصادی انفجار (economic explosion) آیا ہے۔ ایسی حالت میں یہ ایک قسم کا خلافِ زمانہ قول ہے کہ مسلمانوں کو اقتصادی اعتبار سے پچھڑا ہوا اگر وہ بتایا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کا بیان بظاہر ہی قابلِ رد ہے۔

پھر میں نے اپنی تقریر میں حاضرین کو براہ راست خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ جو مسلمان اس ہال کے اندر موجود ہیں، ان میں سے ہر مسلمان کی اقتصادی حالت ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر ہے۔ اور اگر آپ میں سے کسی کا معاملہ اس سے مختلف ہو تو وہ کھڑا ہو کر میرے اس بیان کی تردید کرے۔ حاضرین میں سے کسی ایک مسلمان نے بھی یہ نہیں کہا کہ ۱۹۴۷ میں میری جو معاشی حالت تھی اس کے مقابلہ میں آج میری حالت خراب ہو چکی ہے۔

میں نے اس معاملہ کا باقاعدہ سروے کیا ہے اور اپنی کتاب "ہندستانی مسلمان" میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کے مطابق، ہندستان کا تقریباً ہر مسلم ادارہ، ہر مسلم جماعت، ہر مسجد اور ہر مدرسہ ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج دگنا اور چوگنا ترقی کر چکا ہے۔ تقریباً ہر مسلم خاندان ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج زیادہ بہتر زندگی گزار رہا ہے۔ تعلیم اور اقتصادیات کے میدان میں ہندستانی مسلمان ۱۹۴۷ کے مقابلہ میں آج بہت زیادہ ترقی کر چکے ہیں۔ یہ ترقی اتنا عام ہو چکی ہے کہ کسی بھی مسلم خاندان کا جائزہ لے کر اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

اس معاملہ کی ایک چشم کشا مثال وہ ہے جو جولائی ۱۹۹۹ میں سامنے آئی۔ نیویارک کے مشہور اقتصادی میگزین فوربس (Forbes) نے ساری دنیا کے ارب پتیوں کا سروے کیا۔ اس سلسلہ میں اس نے ہندستان کے ارب پتیوں کا بھی سروے کیا۔ اس سروے کے نتائج فوربس

میگزین کے شمارہ ۵ جولائی ۱۹۹۹ میں شائع ہوئے۔اس کے بعد وہ ہندستان کے تمام اخباروں، مثلاً ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس، وغیرہ میں نقل ہوئے۔

فوربس میگزین کے سروے کے مطابق اس وقت ہندستان کے ارب پتیوں (billionaires) میں جو آدمی نمبر ایک پر ہے وہ بنگلور کا ایک مسلمان ہے جس کا نام عظیم ہاشم پریم جی ہے۔ اس کے علاوہ ہندستان کے دس انتہائی بڑے دولت مندوں میں سے تین آدمی مسلمان ہیں۔ انٹیلی جنٹ انوسٹر (Intelligent Investor) کے شمارہ ۱۴ جولائی ۱۹۹۹ میں یہ رپورٹ ایٹ دی ٹاپ (At The Top) کے عنوان سے چھپی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا، نئی دہلی کے شمارہ ۲۷ جون ۱۹۹۹ میں یہ رپورٹ ویری رچ (Very rich) کے عنوان سے چھپی ہے۔ دوسرے اخباروں میں یہ رپورٹ رچسٹ انڈین (Richest Indian) وغیرہ عنوانات کے تحت شائع ہوئی ہے۔

تقابل کا مسئلہ

امریکہ کے ایک سفر میں میری ملاقات کچھ ایسے مسلمانوں سے ہوئی جو ہندستان سے جاکر امریکہ میں آباد ہوگئے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اپنے وطن کو چھوڑ کر یہاں کیوں چلے آئے۔ ہر ایک کا جواب یہ تھا کہ امریکہ میں ہمارے لئے پیس (امن) ہے، اور ہندستان میں ہمارے لئے پیس نہیں۔ میں نے کہا کہ یہ ادھوری بات ہے۔ پیس کا تعلق کسی ملک سے نہیں۔ بلکہ پیس کی ایک قیمت ہے، آپ جہاں بھی وہ قیمت ادا کریں، وہاں آپ کو پیس مل جائے گا۔ یہ قیمت اڈ جسٹمنٹ ہے۔

پھر میں نے کہا کہ امریکہ میں بھی مسلمانوں کے لئے وہ تمام مسائل موجود ہیں جو ہندستان میں ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہندستان میں وہ ان مسائل کو لے کر بے برداشت ہو جاتے ہیں۔ اور امریکہ میں ان مسائل کے اوپر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ میں ان کے لئے امن ہے اور ہندستان میں ان کے لئے امن نہیں۔ میں نے کہا کہ ہندستان میں مسلمانوں کے لئے پرسنل لاء میں مداخلت کا مسئلہ ہے، ملازمتوں میں امتیاز کا مسئلہ ہے، درسی کتابوں میں غیر اسلامی مضامین کا مسئلہ ہے، مسجد کی بے حرمتی کا مسئلہ ہے، وغیرہ۔ یہ تمام مسائل امریکہ میں بھی پوری طرح موجود ہیں۔ مگر مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ہندستان میں ان چیزوں کو لے کر احتجاجی سیاست چلاتے ہیں اور امریکہ میں ان چیزوں کو نظر انداز کر کے رہتے ہیں۔ مسلمانوں کی روش میں اسی فرق نے بے امنی کا مسئلہ پیدا کیا ہے نہ کہ دو ملکوں کے فرق نے۔

اس مثال سے اندازہ ہوتا ہے کہ کس طرح اکثر لوگ غلط تقابل میں مبتلا رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بیشتر فکری غلطیاں غلط تقابل کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ صحیح تقابل سے صحیح فکر بنتا ہے اور غلط تقابل سے غلط فکر۔ اس دنیا میں صحیح رائے صرف وہ لوگ قائم کر سکتے ہیں جو اس فکری حکمت کو جانیں۔ جو لوگ اس فکری حکمت سے محروم ہوں وہ صحیح رائے سے بھی محروم رہیں گے۔

دوسرا باب

قانون فطرت

فطرت انسان کی سب سے بڑی معلم ہے۔ فطرت زندگی کا خاموش کتب خانہ ہے۔ آدمی اگر فطرت سے سبق لینا سیکھ لے تو یہی اس کی تعمیر حیات کے لیے کافی ہو جائے۔

سب سے زیادہ کامیاب

جون ۱۹۹۹ میں ایک غیر متوقع خبر میڈیا میں شائع ہوئی۔ وہ یہ کہ ہندستان کا سب سے زیادہ امیر آدمی بنگلور کا ایک مسلمان ہے۔ اس کا نام ہے —— عظیم ہاشم پریم جی۔

اس واقعہ کی تفصیلات ٹائمس آف انڈیا (۲۷ جون ۱۹۹۹) اور اس زمانہ کے دوسرے اخبارات ورسائل میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اس کے مطابق، مسٹر عظیم ہاشم پریم جی نے اتنی زیادہ دولت کمائی ہے کہ اب وہ ہندستان کے سب سے زیادہ امیر آدمی بن چکے ہیں حتی کہ کمار منگلم برلا اور دھیرو بھائی امبانی سے بھی زیادہ۔

ان کا پھیلا ہوا کاروبار صابن سے لے کر کمپیوٹر تک وسیع ہے۔ اپنے والد کی وفات کی بنا پر وہ اپنی انجینیرنگ کی تعلیم مکمل نہیں کر سکے تھے۔ مگر آج ان کے تجارتی اداروں میں سیکڑوں انجینیر اور غیر انجینیر ملازم ہیں۔

وہ بے حد محنتی ہیں۔ اسی کے ساتھ وہ انوکھی صفات کے آدمی ہیں۔ مثلاً وہ بہت کم بولتے ہیں۔ ایک بار جب کہ ان کی میز کے چاروں طرف ماہرین بیٹھے ہوئے ایک پروجیکٹ پر اظہار خیال کر رہے تھے، مسٹر عظیم ہاشم پریم جی پوری میٹنگ کے دوران ایک لفظ بھی نہیں بولے۔ وہ صرف کاغذات اور پنسل لے کر اپنا نوٹ تیار کرتے رہے۔ وہ بے حد سادہ ہیں۔ اس قدر امیر ہونے کے باوجود وہ جہاز کے اکانومی کلاس میں سفر کرتے ہیں۔ وہ فائیو اسٹار ہوٹلوں میں کبھی نہیں ٹھہرتے، وغیرہ۔ ایک بار وہ بنگلور ہوائی اڈہ پر اترے تو اطلاع کے باوجود ایرپورٹ پر آفس کی کار موجود نہ تھی۔ وہ خاموشی سے آٹو رکشہ لے کر اپنے دفتر آگئے۔ اور برہمی کا اظہار کیے بغیر خاموشی سے اپنا کام شروع کر دیا۔

کامیابی ہر جگہ حاصل کی جاسکتی ہے، بشرطیکہ آدمی اس کے لیے ضروری جدوجہد کی شرط پورا کرے۔

فطرت سے ہم آہنگی

کوئی آدمی زلزلہ سے لڑ نہیں سکتا۔ اسی طرح کوئی آدمی فطرت کے قوانین سے لڑ کر موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتا۔ فطرت کے مقابلہ میں انسان کے لئے واحد ممکن روش یہ ہے کہ وہ اس سے ہم آہنگی کرے۔ وہ فطرت کے قوانین سے مطابقت کرتے ہوئے اپنی زندگی کا نقشہ بنائے۔ اس کے بعد دوسرا ممکن بدل صرف تباہی ہے نہ کہ تعمیر یا ترقی۔

اس دنیا میں اگر آپ اپنے لئے ایک ہرا بھرا درخت چاہتے ہوں تو اس کا آغاز ایک بیج یا ایک چھوٹے سے پودے سے کرنا ہوگا۔ اور پھر ضروری ہوگا کہ آپ لمبی مدت تک انتظار کریں اس کے بعد ہی آپ اپنے مطلوب درخت کو پا سکتے ہیں، اس قانون فطرت کی خلاف ورزی کرنا صرف اس قیمت پر ممکن ہوگا کہ آپ کو اپنا مطلوب درخت کبھی حاصل ہی نہ ہو۔

یہی مثال زندگی کے تمام معاملات پر صادق آتی ہے۔ آپ جب بھی اپنی زندگی کا کوئی منصوبہ بنائیں تو اپنی خواہشوں اور امنگوں کے ساتھ اس حقیقت کو بھی ضرور ملحوظ رکھئے کہ آپ کو اپنے منصوبہ کی تکمیل ایسی دنیا میں کرنی ہے جو آپ کی مرضی کی پابند نہیں۔ آپ کو چاہئے کہ فطرت کے ان خارجی ضابطوں کی رعایت کرتے ہوئے اپنا منصوبہ بنائیں اور اس سے مطابقت کرتے ہوئے اس کو چلائیں۔ یہی واحد حکمت ہے جس کی تعمیل کر کے اس دنیا میں کسی انفرادی یا اجتماعی منصوبہ کو کامیاب کیا جا سکتا ہے۔

دنیا میں کامیابی اسی مطابق فطرت عمل کا دوسرا نام ہے۔ اس کے مقابلہ میں ناکامی یہ ہے کہ آدمی فطرت کے نظام سے مطابقت نہ کر سکے۔ کامیابی پچاس فی صد اپنی کوششوں کا نام ہے اور پچاس فی صد فطرت کی موافقت کا نام۔

تربیت کے مراحل

انسان امکانی طور پر اشرف المخلوقات ہے۔ مگر یہ درجہ صرف اس کو ملتا ہے جس نے اپنی محنت سے اس امکان کو واقعہ بنایا ہو۔

انسان کا معاملہ عین وہی ہے جو اس دنیا میں دوسری چیزوں کا معاملہ ہے۔ مثلاً لوہا ایک دھات ہے جس کو زمین سے نکالا جاتا ہے۔ وہ اپنی ابتدائی صورت میں صرف ایک کچی دھات (ore) ہے۔ زمین سے نکالنے کے بعد اس پر کئی مزید مراحل گزرتے ہیں حتی کہ اس کو انتہائی گرم آنچ میں پگھلایا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ ترقی کر کے وہ چیز بن جاتا ہے جس کو فولاد (steel) کہا جاتا ہے۔

اسی طرح انسان بھی ابتداء میں گویا ایک "کچی دھات" ہوتا ہے اس کے اندر ایک اعلیٰ انسان بننے کی تمام امکانی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ مگر ابتدائی انسان صرف اس وقت اعلیٰ اور ترقی یافتہ انسان بنتا ہے جب کہ وہ ان تمام مراحل سے گزرے جو قانون کے مطابق اس کے لئے ضروری ہیں۔ ان مراحل میں سب سے اہم چیز صبر و تحمل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے ساتھ جب مشکلات پیش آئیں تو ان سے بھاگنے کے بجائے وہ حوصلہ مندانہ طور پر ان کا سامنا کرے۔ لوگوں کی طرف سے اس کو تلخ تجربات پیش آئیں، مگر وہ غصہ اور نفرت میں مبتلا نہ ہو بلکہ مثبت جذبات کے ساتھ وہ ان کو برداشت کرے۔ زندگی کے سفر میں اس کو نقصان اور ناکامی سے سابقہ پیش آئے۔ اس کے باوجود وہ بے ہمت نہ ہو، ہر بار وہ نئے عزم کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھے۔

زندگی کے یہی وہ تجربات ہیں جو انسان کو حقیقی معنوں میں انسان بناتے ہیں۔ جو انسان کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں کو باہر لا کر اس کو ایک کامل انسان بنا دیتے ہیں۔ زندگی کے ناخوشگوار تجربات کسی انسان کے لئے تربیتی مراحل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس تربیتی کورس سے گزرے بغیر انسان کا اعلیٰ انسان بننا ممکن نہیں۔

صحیح سبق لیجئے

باغ میں گلاب کا ایک پیڑ ہے۔ اس کی شاخوں میں پھول اگے ہوئے ہیں اسی کے ساتھ اس کی شاخوں میں کانٹے بھی ہیں۔ پھول کے ساتھ کانٹے کو دیکھ کر ایک شاعر کہتا ہے:

حفاظت پھول کی ممکن نہیں ہے اگر کانٹوں میں ہو خوئے حریری

یہ صحیح ہے کہ فطرت کی دنیا میں پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہوتے ہیں۔ مگر کانٹوں کا مقصد یہ نہیں ہے کہ وہ پھول کی متشددانہ چوکیداری کرے۔ یہ شاعر کی اپنی خیال آرائی ہے نہ کہ فطرت کا مطلوب سبق۔

پھول کے ساتھ کانٹے کو پیدا کر کے فطرت جو سبق دینا چاہتی ہے وہ زیادہ صحیح طور پر یہ ہے کہ ـــــ دنیا میں خوشگوار چیزوں کے ساتھ ناخوشگوار چیزیں بھی ہیں۔ انسان کو چاہئے کہ وہ دونوں کے ساتھ زندگی گزارنے کا حوصلہ پیدا کرے۔ ایک اور شاعر نے یہی دوسرا سبق لیتے ہوئے اس طرح کہا ہے ؎

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں

زندگی اسی نباہ کے آرٹ کا دوسرا نام ہے۔ جس آدمی کا یہ حال ہو کہ وہ پھول کو دیکھ کر خوش ہو اور کانٹے کو دیکھ کر غصہ کرے وہ موجودہ دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس قسم کا مزاج فطرت کے نقشہ کے خلاف ہے اور جو مزاج فطرت کے نقشہ کے خلاف ہو اس کے لئے موجودہ دنیا میں کامیابی مقدر نہیں۔

پھول کا حسن خود اس کی چوکیداری ہے۔ پھول کا حسین اور خوشبودار ہونا یہی اس بات کی کافی ضمانت ہے کہ وہ دنیا کے باغ میں اپنے لئے ایک بہتر جگہ پائے۔ وہ دشمنوں کی دشمنانہ کارروائیوں سے پوری طرح محفوظ رہے۔ اسی طرح اگر انسان اپنے اندر کوئی ممتاز خوبی پیدا کر لے تو وہ اس قابل ہو جائے گا کہ وہ دنیا کے اندر پھول کی طرح جیئے۔ کانٹوں کی طرف سے اس کے لئے کوئی خطرہ نہ رہے۔

نفع بخشی

درخت کی شاخوں میں ہری پتیاں نکلتی ہیں۔ وہ ایک عرصے تک شاخ کا حسن بنی رہتی ہیں۔ مگر جیسے ہی ان کی ہریالی ختم ہوتی ہے درخت ان کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گر پڑتی ہیں، صرف اس لئے کہ وہ مٹی میں مل کر اپنے وجود کو ختم کر لیں۔

ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اس کا سبب قانون فطرت ہے۔ پتی جب تک ہری ہوتی ہے، وہ سورج سے توانائی لے کر درخت کو پہنچاتی رہتی ہے۔ لیکن ہراپن ختم ہوتے ہی پتی کی یہ صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ درخت کے لئے ایک غیر مطلوب چیز بن جاتی ہے۔ یہاں تک کہ درخت اس کو اپنے سے جدا کر کے زمین پر گرا دیتا ہے۔

یہی موجودہ دنیا کا قانون ہے۔ موجودہ دنیا میں نفع اندوزی ایک غیر معلوم لفظ ہے۔ یہاں کی ہر چیز نفع بخشی کے اصول پر قائم ہے نہ کہ نفع اندوزی کے اصول پر۔ سورج ہمیشہ ہماری دنیا کو یک طرفہ طور پر روشنی اور حرارت پہنچاتا ہے، وہ اپنے لئے ہماری دنیا سے کچھ نہیں لیتا۔ ہوا مسلسل طور پر حرکت میں ہے تاکہ زمین کے چاروں طرف بسے ہوئے لوگوں کو آکسیجن کی سپلائی جاری رکھے۔ مگر ہوا اس کی کوئی قیمت دنیا والوں سے وصول نہیں کرتی۔ ندیاں پہاڑوں کی بلندی سے اتر کر زمین کے چاروں طرف پھیل جاتی ہیں۔ تاکہ لوگوں کو زندگی بخش پانی فراہم کریں۔ مگر یہ ندیاں لوگوں سے اس کا کوئی معاوضہ وصول نہیں کرتیں۔

یہی کائناتی اخلاق انسان کو بھی اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انسان کو بھی نفع اندوزی کے بجائے نفع بخشی کے اصول پر اپنی زندگی کی تعمیر کرنا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ عظیم کائناتی قافلہ میں شریک ہو جائیں گے اور جو ایسا نہ کر سکیں وہ نفع بخشی کے اصول پر چلنے والی اس دنیا میں بے جگہ ہو جائیں گے۔

بڑائی کا راز

زمین کے اوپر بڑے بڑے پہاڑ دکھائی دیتے ہیں۔ ایورسٹ کی چوٹی زمین سے ساڑھے پانچ میل اوپر ہے۔ اتنے بڑے بڑے پہاڑ زمین پر کیوں قائم ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ بقیہ چیزوں کے سامنے اپنی بڑائی کا مظاہرہ کریں۔ حتیٰ کہ پہاڑ اپنا سایہ زمین پر ڈال کر یہ اعلان کر رہا ہے کہ بڑا بننے سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اس کو تواضع پسند ہے نہ کہ فخر وناز۔

پہاڑ کا زمین پر قائم ہونا خدمت کے لئے ہے نہ کہ عظمت کے لئے۔ وہ زمین کے چاروں طرف اس لئے قائم ہے تاکہ زمین کو متوازن رکھ سکے۔ زمین کے دو تہائی حصے میں گہرے سمندروں کی بنا پر یہ اندیشہ تھا کہ زمین اپنا توازن کھودے گی اور انسان کے لئے ناقابل رہائش بن جائے گی۔ چنانچہ زمین کی خشکی والے حصوں میں پہاڑ ابھر آئے تاکہ نشیب وفراز کے دوطرفہ عمل سے زمین کے توازن کو برقرار رکھیں۔

یہ دنیا کے لئے فطرت کا ایک مقرر اصول ہے۔ یہاں بہت سی چیزیں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کو فطرت کی طرف سے کوئی امتیازی خصوصیت دی گئی ہے۔ مگر یہ امتیازی خصوصیت اس لئے نہیں ہے کہ ایک چیز اپنے آپ کو دوسری چیز سے بڑا سمجھے۔ ایک چیز دوسری چیز کے اوپر فخر کرے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ ہر ایک اپنی خدمت کے شعبہ میں زیادہ سے زیادہ اپنا حصہ ادا کرے۔

یہی مزاج انسان کو بھی اپنے اندر پیدا کرنا ہے۔ انسان کے ساتھ بھی یہی معاملہ کیا گیا ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف امتیازی صفتیں دی گئیں ہیں۔ یہ امتیازی صفتیں صرف امتیازی کارکردگی کے لئے ہیں۔ وہ اس لئے نہیں ہیں کہ کوئی انسان ان کو پاکر خود پسند بن جائے اور دوسروں کے اوپر اپنی بڑائی جتانے لگے۔ متوازن انسانی ترقی کے لئے ضروری ہے کہ آدمی اپنے آپ کو جاننے کے ساتھ دوسروں کو بھی جانے اور ان کا اعتراف کرے۔

زندگی کی دوڑ

سمندر میں ان گنت مچھلیاں ہوتی ہیں۔ چھوٹی بھی اور بڑی بھی۔ یہ مچھلیاں مسلسل طور پر پانی کے اندر دوڑتی رہتی ہیں۔ چھوٹی مچھلی کو ہر لمحہ یہ خطرہ ہوتا ہے کہ بڑی مچھلی اس کو کھا جائے گی۔ چھوٹی مچھلی اگر سمندر سے سوال کرے کہ یہ بڑی مچھلیاں کب تک چھوٹی مچھلیوں کو کھاتی رہیں گی تو سمندر کا جواب ہوگا کہ ——— اس وقت تک جب کہ چھوٹی مچھلی اپنے آپ کو اتنا بڑا نہ کر لے کہ وہ بڑی مچھلی کے منھ میں نہ آسکے۔

زندگی اسی دوڑ کا نام ہے۔ اس دنیا کا پورا نظام اسی دوڑ یا مسابقت کے اصول پر قائم ہے۔ اس مسئلہ کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم اس کے خلاف شکایت اور احتجاج کا طوفان برپا کریں۔ اس قسم کا احتجاجی طوفان کسی مفروضہ ظالم کے خلاف نہیں، وہ براہ راست فطرت کے نظام کے خلاف ہے، اور یہ ایک معلوم بات ہے کہ فطرت کے خلاف کوئی بھی شکایت یا احتجاج کارگر ہونے والا نہیں۔

مزید یہ کہ دوڑ یا مسابقت کا یہ نظام کوئی ظلم وزیادتی کا معاملہ نہیں ہے۔ یہ ہر ایک کے لئے زندگی اور ترقی کا زینہ ہے، اگر یہ دوڑ کا نظام نہ رہے تو ہر ایک جمود کا شکار ہو جائے۔ زندگی کی سرگرمیاں تمام کی تمام ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔

ہر انسان کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک باعتبار امکان اور دوسری باعتبار واقعہ۔ ایک انسان جب ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو واقعہ کے اعتبار سے وہ ایک بچہ ہوتا ہے مگر امکان کے اعتبار سے وہ ایک پورا انسان ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر پیدا ہونے والا واقعہ کے اعتبار سے ایک غیر عالم آدمی ہوتا ہے مگر امکان کے اعتبار سے وہ ایک ایسا آدمی ہوتا ہے جو اپنے دماغ میں عمل کا خزانہ سمیٹے ہوئے ہو۔ یہی معاملہ تمام دوسرے پہلوؤں کا ہے۔ ہر آدمی کے اندر غیر معمولی امکانات کا سرمایہ چھپا ہوا ہے۔ یہ امکانات صرف اس وقت واقعہ بنتے ہیں جب کہ وہ زندگی کی دوڑ میں حوصلہ مندانہ طور پر شریک ہو جائے۔

ہر طرف سبق

کائنات پوری کی پوری انسان کے لئے سبق ہے۔ یہ سبق ایک وسیع خدائی کتاب ہے جس کے ہر صفحہ پر انسان کے لئے ایک پیغام لکھا ہوا ہے، جس کے ہر ذرہ اور ہر پتہ پر نصیحت کے کلمات درج ہیں۔ تاہم یہ سب کے سب خاموش زبان میں ہیں۔ انسان اگر اس کائناتی کتاب کو پڑھ سکے تو وہ اس میں وہ سب کچھ پالے گا جس کے ذریعہ وہ موجودہ دنیا میں اپنی زندگی کی اعلیٰ تعمیر کر سکے۔

رات کے بعد صبح کا آنا آدمی کو یہ پیغام دے رہا ہے کہ اس دنیا میں ہر ناخوشگوار صورتحال کے بعد اپنے آپ ایک نئی خوشگوار صورت حال آرہی ہے۔ سورج یہ پیغام دے رہا ہے کہ اگر تم لوگوں کے درمیان محبوب بننا چاہتے ہو تو لوگوں کے درمیان نفع بخش بن کر زندگی گزارو۔ ہرے بھرے درخت یہ پیغام دے رہے ہیں کہ اس دنیا میں یہ امکان چھپا ہوا ہے کہ مٹی جیسی خشک چیز سے درخت جیسی ایک پر بہار چیز وجود میں آئے۔ ایک بہتا ہوا دریا یہ پیغام دے رہا ہے کہ دنیا میں کوئی بھی رکاوٹ تمہارا راستہ روکنے والی نہیں، بشرطیکہ تمہارے اندر رکاوٹوں کے باوجود اپنا سفر جاری رکھنے کی صلاحیت موجود ہو۔

چڑیوں کو دیکھئے۔ رات کے وقت چڑیاں اپنے بسیرے کے مقامات پر خاموش ہو جاتی ہیں مگر جب رات کا وقت ختم ہوتا ہے اور سویرا شروع ہوتا ہے تو چڑیاں درختوں پر چہچہانے لگتی ہیں۔ اس طرح چڑیاں یہ پیغام دے رہی ہیں کہ خوشیوں اور امنگوں کے ساتھ اپنے بستروں سے اٹھ جاؤ، اور دن کی روشنی میں بھرپور طور پر اپنی کوشش جاری کر دو۔

اسی طرح ہماری دنیا کے ہر جزء میں مفید سبق ہے۔ یہ دنیا اپنے پورے وجود کے ساتھ اسباق کی عظیم ترین انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ لکھا ہوا موجود ہے جو آدمی کو اپنی زندگی کی تعمیر کے لئے درکار ہے۔

نظامِ فطرت

یہ ایک حقیقت ہے کہ موجودہ زمانہ کے مسلمان کچھ مسائل میں مبتلا ہیں۔ مسلمانوں کا لکھنے اور بولنے والا طبقہ صبح و شام اس پر لکھتا اور بولتا رہتا ہے۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ تمام مسائل اغیار کے ظلم و سازش کی پیداوار ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ مسلمانوں کے تمام مسائل اغیار کی سازشوں کا نتیجہ ہیں اور ان کا حل یہ ہے کہ ان سازشوں کے خلاف لڑائی کی جائے۔

مگر یہ صرف غلط فکری ہے، اور یہ غلط فکری ہی ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ان حضرات کی غلطی یہ ہے کہ انھوں نے فطرت کے ایک قانون کو غیر قوموں کی سازش سمجھ لیا۔ حالاں کہ یہ ایسا ہی ہے جیسے بارش سے پیدا ہونے والی کیچڑ کا الزام انسانوں کو دیا جانے لگے۔

یہ فطرت کا قانون ہے کہ دنیا میں انسانوں کے درمیان مقابلہ ہو، ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف چیلنج بنے۔ اسی نظام فطرت کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک کو دوسرے سے جھٹکا لگتا ہے۔ کوئی شخص یا گروہ دوسرے کو دھکیل کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ یہ نظام انسانی ترقی کے لئے قائم کیا گیا ہے۔

ایسی حالت میں زد میں آنے والا گروہ اگر شکایت اور احتجاج کرے تو اس کا کوئی عملی فائدہ نہیں۔ اس کے بجائے اس کو چاہئے کہ وہ ازسرنو اپنے آپ کو مستحکم بنائے۔ وہ صبر کے اصول کو اختیار کرکے اپنی تیاری کرے۔ وہ تلافی مافات کے اصول کو اختیار کرکے خود اپنے آپ پر عمل کرے۔

موجودہ زمانہ میں نئی قوتیں ظاہر ہوئیں۔ مثلاً ٹکنالوجی، سائنٹفک ایجوکیشن وغیرہ۔ مسلمان ان نئی قوتوں میں دوسری قوموں سے پچھڑ گئے۔ اسی بنا پر ہر جگہ وہ دوسری قوموں کی زد میں آئے ہوئے ہیں۔ اب اس کا حل صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنی علمی اور عملی کمیوں کو دور کریں، یہاں تک کہ ان کا وجود خود دوسری قوموں کے لئے چیلنج بن جائے۔

یہی اس دنیا میں کامیابی کی واحد ممکن تدبیر ہے۔ جہاں تک موجودہ قسم کی احتجاجی سیاست یا مطالباتی ہنگاموں کا تعلق ہے، اس سے مسلمانوں کو کچھ بھی ملنے والا نہیں۔ خواہ ان کو مزید ایک سو سال تک جاری رکھا جائے۔ ایسے احتجاجات انسان کے خلاف نہیں ہیں بلکہ وہ خالق فطرت کے خلاف ہیں اور کون ہے جو خالق فطرت سے لڑ کر کامیاب ہو۔

قانون فطرت

ولیم پن (William Penn) ۱۶۴۴ میں لندن میں پیدا ہوا، ۱۷۱۸ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ایک ایسا لیڈر تھا جس نے مذہب اور سیاست دونوں میں حصہ لیا۔ وہ مذہبی رواداری کا زبردست حامی تھا۔ اس کا ایک قول یہ ہے کہ —— لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ کبھی وہ خود حکومت کریں گے اور کبھی ان کے اوپر حکومت کی جائے گی :

Let the people think they govern and they will be governed.

ولیم پن نے یہ بات تاریخ کے مطالعہ کی بنیاد پر کہی۔ مگر یہ سادہ طور پر محض تاریخ کی بات نہیں، وہ فطرت کا ایک عالم گیر قانون ہے جس کو خود خدا نے اپنے تخلیقی نقشہ کے مطابق اس دنیا میں قائم کیا ہے۔ خداوند عالم کا مقرر کیا ہوا یہ فطری قانون قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے :

وتلك الايام نداولها بين الناس (آل عمران ۱۴۰) یعنی ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں۔

یہاں ایام یا دن سے مراد فتح وشکست اور غلبہ اور مغلوبیت کے دن ہیں۔ اس دنیا میں جس طرح دوسری تمام چیزیں امتحان اور آزمائش کے لیے ہیں، اسی طرح سیاسی اقتدار بھی آزمائش اور امتحان کے لیے ہے۔ چنانچہ وہ باری باری ہر گروہ کو دیا جاتا ہے تاکہ ہر ایک کی جانچ ہو سکے۔ اس دنیا میں حاکمیت کی حالت بھی برائے امتحان ہے اور محکومیت کی حالت بھی برائے امتحان۔

آدمی کو چاہیے کہ جب اس کو حاکم بنایا جائے تو وہ فخر وناز کی کیفیت میں مبتلا نہ ہو۔ اور جب وہ اپنے آپ کو محکومیت کی حالت میں پائے تو وہ منفی نفسیات کا شکار نہ ہو۔ دونوں حالتوں کو وہ خدائی فیصلہ کے طور پر لے۔ دونوں حالتوں میں اس کی نگاہ خود اپنی ذمہ داری کی ادائگی پر ہو نہ کہ دوسروں کے صحیح یا غلط رویہ پر۔

یہ ایک عظیم اصلاحی عقیدہ ہے جو لوگوں کو منفی نوعیت کی سیاسی سرگرمیوں سے بچاتا ہے، وہ لوگوں کو اس قابل بناتا ہے کہ اپنی صلاحیتوں کو ضیاع سے بچائیں۔ اور ہمیشہ مفید اور نتیجہ خیز عمل میں مصروف رہیں۔ حکومت کا چھننا خدا کی طرف سے ہے۔ اس کے خلاف احتجاج کرنا خدا کے خلاف احتجاج کرنا ہے۔ اور کون ہے جو خدا کے خلاف احتجاج میں کامیاب ہو۔

چیلنج نہ کہ انتقام

اسپین میں مسلمانوں کے ساتھ جو کچھ پیش آیا اس کو عام طور پر صلیبی جنگوں کا انتقام بتایا جاتا ہے۔ صلیبی جنگیں تیرھویں صدی کے آخر میں ختم ہوئی تھیں۔ مولانا شبلی نعمانی نے پہلی عالمی جنگ (۱۹۱۴) تک ہونے والے اس قسم کے تمام واقعات کی یہی ایک توجیہہ قرار دیتے ہوئے کہا تھا:

کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی   دکھاؤ گے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک

مسلم دانشوروں میں یہی ذہن اب تک باقی ہے۔ چنانچہ فلسطین سے لے کر بوسنیا تک کے تمام واقعات کو دوبارہ وہ اسی انتقامی توجیہہ کے خانہ میں ڈالے ہوئے ہیں۔ مگر یہ توجیہہ قرآن اور قانون فطرت دونوں کے خلاف ہے۔

ابن خلدون کا زمانہ عین وہی تھا جب کہ اسپین میں مسلم سلطنت کا زوال ہوا۔ اس نے اپنے مقدمہ میں تاریخ اور فطرت کا یہ قانون بتایا کہ ہر سلطنت یا ہر عروج یافتہ قوم آخر کار زوال کا شکار ہوتی ہے (ملاحظہ ہو مقدمہ ابن خلدون کا باب: ان الدولة لها اعمار طبيعية كما للاشخاص صفحہ ۱۷۰-۱۷۲)

اصل یہ ہے کہ اس دنیا کا نظام چیلنج کے اصول پر بنایا گیا ہے۔ اس کو قرآن میں کہیں تلك الايام نداولها بين الناس کہا گیا ہے اور کہیں اس کو بعضكم لبعض عدو کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہاں ایک قوم کا ابھرنا دوسری قوم کے لیے چیلنج بنتا ہے۔ اس چیلنج سے مغلوب قوم کی صلاحیتیں جاگتی ہیں۔ وہ اٹھ کر غالب قوم کو زیر کرتی ہے۔ اس طرح غالب اور مغلوب کے درمیان مختلف صورتوں میں مسابقت جاری رہتی ہے۔ یہی مسابقت یا چیلنج تمام انسانی ترقیوں کا واحد زینہ ہے۔ اس عمل کے دوران کبھی ایک قوم گرتی ہے اور کبھی دوسری قوم، تاہم مجموعی اعتبار سے انسانیت کا سفر ترقی کی طرف جاری رہتا ہے۔ مغلوب قوم پیش آمدہ چیلنج کا مقابلہ کر کے دوبارہ غالب آسکتی ہے۔ لیکن فریاد اور احتجاج کا طریقہ اس کو خدا کی دنیا میں کہیں پہنچانے والا نہیں۔

انتقامی توجیہہ صرف نفرت کے جذبات ابھارتی ہے۔ اس کے برعکس فطرت پر مبنی توجیہہ آدمی کے اندر یہ جذبہ پیدا کرتی ہے کہ وہ پیش آمدہ چیلنج کا مقابلہ کرے اور اس طرح اپنی کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کر لے۔

دوسروں کی رعایت

آپ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑا رہے ہیں۔ سامنے سے دوسری گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ اب آپ کے لیے دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ پہلے کی طرح بیچ سڑک پر اپنی گاڑی دوڑاتے رہیں۔ دوسرے یہ کہ آپ اپنی گاڑی کو ایک طرف موڑ دیں اور سامنے والی گاڑی کے کنارے سے نکل جائیں۔

ایسے موقع پر آپ کیا کرتے ہیں۔ ایسے موقع پر آپ ہمیشہ یہ کرتے ہیں کہ اپنی گاڑی کو کنارے کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اگر آپ بدستور اپنی گاڑی سیدھے رخ پر دوڑاتے رہیں تو آپ کی گاڑی سامنے والی گاڑی سے ٹکرا جائے گی۔ اس کے بعد آپ کا انجام یہ ہوگا کہ آپ منزل پر پہنچنے کے بجائے قبرستان میں پہنچ جائیں گے یا زخمی ہو کر اسپتال لے جائے جائیں گے۔ مگر جب آپ اپنی گاڑی کو کنارے کی طرف موڑ دیتے ہیں تو آپ کی گاڑی اور آپ دونوں محفوظ حالت میں منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔

یہی اس دنیا میں زندگی کا راز ہے۔ سڑک پر کوئی سواری اکیلی نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ اور بہت سی سواریاں سڑک پر دوڑ رہی ہوتی ہیں۔ اس لیے ہر ایک کو دوسرے کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔ یہی معاملہ وسیع تر معنوں میں پوری انسانی زندگی کا ہے۔ موجودہ دنیا میں آپ اکیلے نہیں ہیں۔ بلکہ بہت سے دوسرے انسان بھی آباد ہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی سرگرمیوں کو پوری طاقت کے ساتھ جاری کیے ہوئے ہے۔ ایسی حالت میں وسیع تر زندگی میں بھی کامیابی کا راز وہی ہے جو محدود معنوں میں سڑک کے سفر میں اختیار کیا جاتا ہے۔ یعنی دوسروں کی رعایت کرتے ہوئے اپنے مقصد کے لیے جدوجہد کرنا۔

آپ جس طرح اپنے جذبات کو جانتے ہیں اسی طرح آپ کو دوسرے کے جذبات کو بھی جاننا ہوگا۔ آپ جس طرح اپنے منصوبے کو جانتے ہیں اسی طرح آپ کو دوسروں کے منصوبے سے بھی واقف ہونا پڑے گا۔ آپ جس طرح اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اسی طرح آپ کو یہ بھی جاننا ہوگا کہ دوسروں کے کیا مفادات ہیں اور وہ کس طرح ان کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ——— اس دنیا میں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو جاننے کے ساتھ دوسروں کو بھی جانیں۔

فطری طریقہ

جب بھی قومی تعمیر کا کوئی ایسا منصوبہ سامنے لایا جائے جس میں لمبی مدت کی جدوجہد کے بعد نتیجہ نکلنے والا ہو تو لوگ فوراً کہہ دیتے ہیں کہ اس میں تو بہت وقت لگے گا، اور ہم کو لمبے انتظار کا موقع نہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک الٹا تبصرہ ہے۔

گہرائی کے ساتھ دیکھیے تو دیر طلب منصوبوں سے گھبرا کر فوری تدبیروں کی طرف دوڑنا منزل پر پہنچنے کی مدت کو اور لمبا کرنا ہے۔ دیر طلب منصوبہ تو بہر حال ایک وقت پر مکمل ہو جاتا ہے۔ مگر مختصر راستوں پر دوڑنا صرف وقت ضائع کرنا ہے۔ کیوں کہ ایسے راستے کبھی اپنے مسافر کو منزل تک نہیں پہنچاتے۔

جو شخص درخت کی بڑی بڑی شاخوں کو گاڑ کر آناً فاناً اپنے سامنے ایک ہرا بھرا باغ دیکھنا چاہتا ہو، اس کو پودے لگا کر باغبانی کا طریقہ بتائیے تو اس کی سمجھ میں اس قسم کی شجر کاری کبھی نہیں آئے گی۔ وہ کہے گا کہ یہ تو بہت لمبا منصوبہ ہے۔ حالاں کہ اگر مستقبل کے لحاظ سے دیکھیے تو خود اسی کا منصوبہ غیر متناہی طور پر لمبا ہے۔ کیوں کہ شاخیں گاڑنے والے کو تو ہزار سال میں بھی باغ دیکھنا نصیب نہیں ہو سکتا۔ جب کہ پودے لگانے والے کے لیے بہر حال ایک ایسا وقت آتا ہے جبکہ وہ ہرے بھرے باغ کا مالک بن جائے، خواہ یہ وقت ۲۵ برس بعد آئے یا پچاس برس بعد۔

جس طرح باغبانی میں کوئی شارٹ کٹ نہیں، اسی طرح زندگی کی تعمیر میں بھی کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ یہ کام بہر حال طویل المدت منصوبہ ہی کے ذریعہ ہوگا۔ خواہ ہم اس کو آج شروع کریں، یا آج کے بہت دنوں بعد اس وقت شروع کریں جب کہ کام کا پہلا قیمتی موقع ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہو۔

فطرت کا یہ طریقہ کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ وہ خود خدا کا بنایا ہوا ہے۔ جس خدا نے دنیا کو بنایا ہے اسی نے اس کے لیے یہ قانون بھی وضع کیا ہے۔ انسان جس طرح اپنے رہنے کے لیے کوئی اور دنیا پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح اس کے لیے ناممکن ہے کہ وہ اپنے لیے کوئی اور قانون وضع کر سکے۔

فطرت کے خلاف

شری گروگولوالکر آر ایس ایس کے دماغ سمجھے جاتے ہیں۔ انھوں نے یکساں سول کوڈ کے تصور کی مکمل مخالفت کی ہے۔ ان کی یہ مخالفت مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے بلکہ فطرت کی بنیاد پر ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یکساں سول کوڈ سرے سے قابل عمل ہی نہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک غیر فطری اسکیم ہے۔ انھوں نے کہا کہ فطرت یکسانیت سے نفرت کرتی ہے :

Nature abhors uniformity

اس بات کا تعلق صرف یکساں سول کوڈ سے نہیں ہے بلکہ پوری زندگی سے ہے۔ زندگی کا نظام پورا کا پورا فطرت کے اصولوں پر قائم ہے۔ یہ فطری اصول خود اپنے زور پر قائم ہیں اور وہ ابد تک قائم رہیں گے۔ کسی بھی شخص یا حکومت کے لیے صرف یہ موقع ہے کہ وہ فطرت سے موافقت کرے۔ وہ کسی بھی حال میں اس سے لڑ نہیں سکتا۔ فطرت سے لڑنا ایسا ہی ہے جیسے بھونچال سے لڑنا، اور کون ہے جو بھونچال سے لڑکر کامیابی کی امید کرسکے۔

تاریخ میں بار بار ایسا ہوا ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو اقتدار مل گیا تو اس نے سمجھا کہ ہم جو چاہیں کرسکتے ہیں۔ اس بھرم کے تحت انھوں نے بڑے بڑے اقدامات شروع کردیے۔ انھوں نے چاہا کہ زندگی کے مروجہ نقشہ کو توڑ کر خود اپنی پسند کے مطابق اس کا ایک نقشہ بنائیں۔ مگر تاریخ بتاتی ہے کہ ایسی ہر طاقت کے حصہ میں صرف ناکامی آئی۔ فطرت کا نظام جس طرح پہلے قائم تھا اسی طرح وہ بعد کو بھی قائم رہا۔

چنگیز خان سے لے کر نادر خان تک، اور ہٹلر سے لے کر اسٹالن تک، اور پھر موجودہ زمانہ کے آمروں اور ڈکٹیٹروں تک ہر ایک اسی کا مصداق ثابت ہوئے ہیں۔ اس معاملہ میں پوری تاریخ انسانی میں کسی کا کوئی استثناء نہیں۔

انھیں فطری اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ اس دنیا میں امن کے لیے بقا ہے جنگ کے لیے بقا نہیں۔ یہاں عدل کو جماؤ ملتا ہے ظلم کو نہیں۔ یہاں تواضع کو جگہ ملتی ہے گھمنڈ کو نہیں۔ یہ دنیا فراخدلی کو قبول کرتی ہے تنگ نظری کو نہیں۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے۔ اس قانون سے کسی کا ٹکرانا ایسا ہی ہے جیسے کہ وہ پتھر کی چٹان سے اپنا سر ٹکرانے لگے۔

بیان حقیقت

ایک صورت یہ ہے کہ آپ اپنی بات کو دلیل سے ثابت کریں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اس کو سادہ طور پر بلا دلیل بیان کریں۔ انگریزی کا ایک مثل ہے کہ ایک واضح بیان مضبوط ترین استدلال ہے:

A clear statement is an argument in itself.

جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ بہت سی حدیثوں میں یہی دوسرا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ اتنی موثر ہیں کہ انھوں نے کروروں لوگوں کے اندر انقلاب پیدا کر دیا۔

اس کی وجہ کیا ہے کہ ایک واضح بیان سننے والے کے لیے بذاتِ خود دلیل بن جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے ایک بیان کے ساتھ فطرت خود اضافہ کرکے اس کو مکمل کر لیتی ہے۔ دلیل کی کمی انسان کی فطرت خود پورا کر لیتی ہے۔

تمام حقیقتیں انسان کی فطرت کے اندر موجود ہیں۔ وہ انسان کے لاشعور میں پیدائشی طور پر رکھ دی گئی ہیں۔ آدمی جب کسی حقیقت کو مانتا ہے تو وہ اس کو اس لیے مانتا ہے کہ وہ اس کی پیدائشی معرفت کے ساتھ مطابقت کر رہی ہے۔ ایک بیان جب سننے والے کی اپنی فطرت کے ساتھ مطابقت کر رہا ہو تو اُس کے بعد اِس کی حاجت نہیں رہتی کہ اس کو ثابت کرنے کے لیے دلیل و برہان پیش کی جائے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو پیاس لگی ہوئی ہو۔ اس کو پانی کا ایک گلاس پیش کیا جائے تو اس کی ضرورت نہیں کہ پانی کی اہمیت پر اس کے سامنے تقریر کی جائے یا علمی دلائل کے ذریعہ ثابت کیا جائے کہ پانی انسان کے لیے ضروری اور مفید ہے۔ آدمی کے اندر پانی کا احساس اس کو اس سے مستغنی کر دیتا ہے کہ وہ پانی کی اہمیت سمجھنے کے لیے دلیل کا طالب ہو۔

اسی طرح دین فطرت کا مجرد بیان بھی پوری طرح موثر ہو سکتا ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ وہ فی الواقع بیانِ حقیقت ہو۔ اس میں کسی غیر فطری چیز کی آمیزش نہ کی گئی ہو۔ وہ اصل واقعہ سے اتنا زیادہ مطابقت رکھتا ہو کہ وہ معرفت فطری کا بے لاگ اظہار بن جائے۔ وہ اپنے صحت بیان کی بنا پر پورے معنوں میں فطرت انسانی کا مثنیٰ بن گیا ہو۔

ٹالرنس: فطرت کا اصول

ٹالرنس (رواداری، برداشت) ایک یونیورسل اصول ہے۔ شیر اور ہاتھی دونوں انتہائی بڑے جانور ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے حریف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر بھی دونوں ایک ساتھ جنگل میں رہتے ہیں۔ یہ صرف ٹالرنس کے ذریعہ ممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ جنگلوں میں دیکھا گیا ہے کہ ایک طرف سے ہاتھی آرہا ہو اور دوسری طرف سے شیر گزر رہا ہو تو دونوں اپنا اپنا راستہ بدل کر دائیں اور بائیں سے نکل جاتے ہیں۔ اگر دونوں اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ نہ کریں تو دونوں آپس میں لڑنے لگیں، یہاں تک کہ دونوں لڑکر تباہ ہو جائیں۔

شیر اور ہاتھی کو یہ طریقہ فطرت نے سکھایا ہے۔ اسی طرح انسان کے جسم میں فطرت نے ٹالرنس کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ میڈیکل سائنس میں اس کو حیاتیاتی ٹالرنس (biological tolerance) کہا جاتا ہے۔ اس سے مراد ایک جسم حیوانی کی یہ صلاحیت ہے کہ وہ ایک چیز سے برا اثر لیے بغیر اس سے ربط کو یا جسم میں اس چیز کے داخل کیے جانے کو برداشت کرے:

The ability of an organism to endure contact with a substance, or its introduction into the body, without ill effects. (X/31)

جسم کی اسی صلاحیت پر امراض کے علاج کا پورا نظام قائم ہے۔ بیماری کے وقت جسم کے اندر ایسی دوائیں ڈالی جاتی ہیں جو مجموعی حیثیت سے جسم کے لیے مضر ہیں۔ مگر جسم خارجی چیزوں کے معاملہ میں اپنی ساری حساسیت کے باوجود ایسی دواؤں کو برداشت کرتا ہے۔ وہ ان کے ساتھ ٹالرنس کا معاملہ کرتا ہے۔ اسی "حیاتیاتی ٹالرنس" کی بنا پر یہ ممکن ہوتا ہے کہ یہ دوائیں جسم میں داخل ہو کر اپنا اثر دکھائیں۔ وہ جسم کے اعضاء پر برا اثر ڈالے بغیر اس کے بیمار عضو پر عمل کرکے اس کو اچھا کر سکیں۔

ٹالرنس کا یہی طریقہ انسانی سماج میں بھی مطلوب ہے۔ جنگل کے جانور جو کچھ اپنی جبلت (instinct) کے تحت کرتے ہیں۔ اور انسانی جسم جو کچھ اپنی فطرت کے تحت کرتا ہے۔ وہی انسان کو اپنے شعور کے تحت کرنا ہے۔ اس کو اپنے سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت ٹالرنس کا طریقہ اختیار کرکے دوسروں کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔

حکمت معاملہ

ایک تعلیم یافتہ مسلمان ایک سرکاری محکمہ میں اچھی سروس میں ہیں۔ ان کے افسر اعلیٰ سے ان کا جھگڑا ہو گیا۔ وہ گھر لوٹے تو ان کے دماغ میں سخت ٹنشن تھا۔ ان کو ڈر تھا کہ مذکورہ افسران کی سروس بک خراب کر دے گا اور اس کے نتیجہ میں ان کا پروموشن رک جائے گا۔ اس ٹنشن کی وجہ سے ان کے سر میں اتنا سخت درد ہوا کہ وہ گھر آکر بستر پر لیٹ گئے اور اس کے بعد کوئی کام نہ کر سکے۔

ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا کہ آپ نے جو کیا وہ درست نہ تھا۔ میں نے ان کو ایک حدیث سنائی۔ ایک قبیلہ کا سردار مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ آپ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ جاؤ اس کا استقبال کرو۔ اس موقع پر آپ نے ایک اصولی بات یہ فرمائی کہ: انزلوا الناس منازلھم۔ یعنی لوگوں کے ساتھ ان کے رتبہ کے مطابق معاملہ کرو (حیاۃ الصحابہ ۲/۲۰۹)

شریعت کے احکام سب کے سب فطرت پر مبنی ہیں۔ یہ خود فطرت کا تقاضا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کا لحاظ کریں۔ کوئی شخص جب دوسرے شخص سے معاملہ کرے تو وہ اس طرح معاملہ کرے کہ دوسرا شخص اس کو اپنی تحقیر محسوس نہ کرے۔ ہر شخص یہ سمجھے کہ اس کو اس کے مقام کے مطابق مناسب عزت (due respect) دی جا رہی ہے۔ جس سماج میں یہ روایات ہوں اس سماج میں باہمی محبت بڑھتی ہے اور سماجی انتشار کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

یہ فطرت کا ایک اصول ہے اور قدیم زمانہ سے مختلف شکلوں میں اس کو دہرایا جاتا رہا ہے۔ اسی کو ایک انگریزی مثل میں اس طرح کہا گیا ہے کہ افسر ہمیشہ حق پر ہوتا ہے:

Boss is always right.

یہ گویا معاملاتی حکمت یا معاملاتی شریعت ہے۔ اس کا لحاظ کرنا ہر ایک کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ جس سماج میں اس کی رعایت نہ کی جائے وہ سماج کبھی اچھا سماج نہیں بن سکتا۔

حقیقت پسندی

اگر آپ میدان میں ہوں اور بارش آجائے تو آپ بھاگ کر سایہ کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ یہ پسپائی نہیں ہے بلکہ حقیقت پسندی ہے۔ اسی طرح اگر زلزلہ آجائے تو آپ گھر سے نکل کر کھلے میدان میں آجاتے ہیں۔ یہ بھی پسپائی نہیں ہے بلکہ ایک فطری حقیقت کا اعتراف ہے۔ جہاں انسان کا اور فطرت کا معاملہ ہو وہاں مسئلہ کا حل صرف اعتراف ہوتا ہے نہ کہ ٹکراؤ۔

بارش اور زلزلہ کا نظام جو خالق فطرت نے دنیا میں رکھ دیا ہے۔ انسان اس کو بدلنے پر قادر نہیں۔ انسان صرف یہ کر سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے نقصان سے بچانے کی تدبیر کرے۔ اور اس کے نقصان سے بچنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ اعراض کا اصول اختیار کرتے ہوئے اپنے آپ کو اس کی زد سے ہٹا دیا جائے۔ اسی لیے آپ بارش کے وقت سایہ میں آجاتے ہیں اور زلزلہ کے وقت میدان میں۔

ٹھیک یہی معاملہ صبر اور اعراض کے اصول کا بھی ہے۔ صبر و اعراض کا رویہ کسی قسم کی بزدلی یا پسپائی نہیں ہے۔ وہ سادہ طور پر صرف حقیقت پسندی ہے۔ اس کی ضرورت اس لیے ہے کہ خالق فطرت نے انسان کو امتحان کی غرض سے آزادی عطا کی ہے۔ انسان اپنی آزادی کا استعمال کبھی صحیح کرتا ہے اور کبھی غلط۔ اب آپ کیا کریں۔ اگر آپ ہر انسان سے لڑنے لگیں تو لوگوں سے آپ ان کی آزادی چھین نہیں سکتے۔ کیوں کہ یہ آزادی ان کو خود مالک کائنات نے دے رکھی ہے، لوگوں کی آزادی چھیننے کی بے فائدہ کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوگا کہ آپ اپنے راستہ کو کھوٹا کر لیں گے۔

ایسی حالت میں صرف ایک ہی ممکن رویہ ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کو صبر کہا جاتا ہے یعنی لوگوں کی طرف سے اگر کبھی تلخی اور ناگواری پیش آجائے تو اس سے اعراض کرتے ہوئے اپنا سفر حیات جاری رکھا جائے۔

صبر و اعراض دوسروں کا مسئلہ نہیں، وہ خود اپنا مسئلہ ہے۔ بے صبری آدمی کے سفر کو روک دیتی ہے، اور صبر اس بات کو ممکن بناتا ہے کہ آدمی کی زندگی کا سفر کامیابی کے ساتھ جاری رہے یہاں تک کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے۔

انسانی فطرت

ابوالبرکات صاحب (نظام پور، اعظم گڑھ) سے ۲ دسمبر ۱۹۹۱ کو دہلی میں ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں انھوں نے مندرجہ ذیل واقعہ بتایا۔

ضلع اعظم گڑھ میں ماہل کے قریب ہندوؤں کا ایک گاؤں ہے۔ اس کا نام ٹکریا (Tikurya) ہے۔ پڑوس کے گاؤں رسول پور سے ایک یادو چوری کی غرض سے یہاں پہنچا۔ رات کا وقت تھا۔ ایک گھر کے پاس پہنچ کر اس نے اس کی کنڈی کھٹکھٹائی۔ یہ بھی ایک یادو کا گھر تھا۔ اس نے اپنی بھانجی کی اپنے یہاں پرورش کی تھی، اس وقت صرف بھانجی گھر میں تھی۔ اس کا ماما (ماموں) کسی ضرورت سے باہر چلا گیا تھا۔

کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز سن کر لڑکی دروازہ پر آئی۔ اس نے سمجھا کہ اس کا ماما واپس آیا ہے۔ تصدیق کے لیے اس نے اندر سے کہا "ماما!" باہر کے آدمی نے یہ سن کر کہا کہ ہاں۔ اس کے بعد لڑکی نے دروازہ کھول دیا۔ مگر جب دروازہ کھلا تو سامنے کوئی شخص دکھائی نہیں دیا۔ آخر کار وہ دروازہ بند کر کے اندر چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد دوبارہ دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ لڑکی دوبارہ دروازہ پر آئی اور تصدیق کے لیے پھر کہا کہ ماما!۔ باہر سے آواز آئی کہ ہاں۔ اب لڑکی نے دوبارہ دروازہ کھول دیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا ماما واپس آیا ہے۔ ابھی دونوں دروازہ ہی پر تھے کہ لڑکی نے کہا کہ اس سے پہلے آپ دروازہ کھلوا کر کہاں چلے گئے تھے۔ ماما نے کہا کہ میں تو اس سے پہلے نہیں آیا۔ لڑکی نے کہا کہ پھر کون تھا جس نے اس سے پہلے کنڈی کھٹکھٹائی۔

یہ بات ہو رہی تھی کہ ایک طرف سے آواز آئی کہ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا تھا۔ ماما نے پوچھا کہ تم کون ہو۔ اس نے کہا کہ میں چور ہوں۔ ماما نے دوبارہ کہا کہ جب تم چور ہو تو دروازہ کھلنے کے بعد اندر گھس کر اپنا کام کیوں نہیں کیا۔ چور نے کہا کہ اصل یہ ہے کہ جب لڑکی نے اندر سے پوچھا کہ ماما۔ تو میں نے کہہ دیا کہ ہاں۔ یہ کہہ کر میں نے اپنے آپ کو لڑکی کا ماما بنا دیا۔ اور ماما کبھی کسی بھانجی کے گھر میں چوری نہیں کر سکتا۔

اختلاف

اختلاف ایک پرچۂ امتحان ہے۔ کسی سے آپ کا اختلاف پیدا ہو جائے تو سمجھ لیجئے کہ اللہ نے آپ کو ایک نازک آزمائش میں ڈال دیا تاکہ یہ جانے کہ آپ سچے مومن ہیں یا سچے مومن نہیں ہیں۔

اختلاف کو اختلاف کے دائرہ میں رکھنا سچے اہل ایمان کا طریقہ ہے۔ جو لوگ اختلاف کو تخریب کاری کے درجہ تک پہنچا دیں وہ بلاشبہہ ایمان و اسلام سے نکل گئے۔

آدمی جب اختلاف کو اختلاف کے دائرہ میں رکھے تو اس کا امکان ہوتا ہے کہ تبادلۂ خیال کے دوران دونوں میں سے کسی کے اوپر سچائی کھل جائے اور اس طرح جو بھٹکے ہوئے مسافر کی مانند تھا وہ دوبارہ صحیح راستہ پر آجائے۔

مگر جب ایک آدمی اختلاف کو تخریب کاری تک پہنچا دے تو اس کے بعد گمراہی کے گڑھے میں گرنے کے سوا کوئی انجام اس کے لیے باقی نہیں رہتا۔ ایسے آدمی کا دماغ منفی سوچ کا کارخانہ بن جاتا ہے۔ وہ دلیل اور الزام تراشی کے فرق کو سمجھنے کی اہلیت کھو دیتا ہے۔ وہ منصفانہ اختلاف کی حد سے گزر کر ظالمانہ اختلاف کے دائرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ خدا کی پکڑ کے احساس سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ صرف اپنی انا کو رہنما بنا لیتا ہے۔ اب اس کا مقصد حق کو قائم کرنا نہیں ہوتا بلکہ صرف اپنی ذات کو قائم کرنا اس کا اول و آخر مقصد بن جاتا ہے۔ وہ خدا کی رحمت سے دور ہو کر پوری طرح شیطان کی گرفت میں آجاتا ہے۔

اختلاف پیدا ہونا بالکل فطری ہے۔ مگر اختلاف کو تخریب کاری بنانا سراسر ظالمانہ فعل ہے۔ جو لوگ اختلاف کو تخریب کاری بنائیں ان کے لیے سخت خطرہ ہے کہ وہ خدا کی شدید پکڑ میں آجائیں۔ عین ممکن ہے کہ آخرت میں ان سے کہہ دیا جائے کہ آج تم نے دنیا کی زندگی میں شیطان کو اپنا رہنما بنایا۔ اب آخرت کی خدائی نعمتوں میں تمہارا کوئی حصہ نہیں۔

اختلاف کے وقت عدل پر قائم رہنا آدمی کے لیے جنت کا دروازہ کھولتا ہے۔ اور اختلاف کے وقت عدل و انصاف سے ہٹ جانا آدمی کو جہنم کے دروازے پر پہنچا دیتا ہے۔

خاموشی

ارنسٹ سیاچری (Ernest Psiachari) ایک فرانسیسی رائٹر ہے۔ وہ ۱۸۸۳ میں پیرس میں پیدا ہوا۔ ۱۹۱۴ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ابتداءً آزاد خیال اور ملحد تھا۔ مگر بعد کو وہ مسیحی عقیدہ کی طرف لوٹ آیا اور خدا اور مذہب کو ماننے والا بن گیا۔

ارنسٹ سیاچری مشہور مؤرخ ارنسٹ ریناں کا پوتا تھا۔ وہ ان لوگوں میں سمجھا جاتا ہے جنھوں نے ۱۹۱۴ سے پہلے فرانس میں روحانی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ انگریزی زبان میں اس طرح کیا گیا ہے —— خاموشی آسمان کا ایک ٹکڑا ہے جو زمین پر اتارا گیا ہے :

Silence is a bit of heaven that comes down to earth.

خاموشی فطرت کی زبان ہے۔ ایک آدمی جب خاموش ہوتا ہے تو وہ عالم فطرت کا ہم زبان بن جاتا ہے۔ اس کی سطح وہ ہو جاتی ہے جو فطرت کی سطح ہے۔ اور فطرت کی سطح سے بلند سطح اور کوئی نہیں۔

انسان مطلق معنوں میں خاموش نہیں رہ سکتا۔ انسان جب بظاہر خاموش ہوتا ہے تو اس وقت وہ دوسروں کے لیے خاموش ہوتا ہے مگر اپنے لیے خاموش نہیں ہوتا۔ وہ خارجی دنیا کی طرف سے خاموش ہو کر اپنی داخلی دنیا سے ہم کلام ہو جاتا ہے۔

چپ رہنا ایک عظیم عمل ہے۔ جب آدمی چپ رہتا ہے تو وہ "زمین" کی باتوں سے زیادہ "آسمان" کی باتوں پر دھیان دے رہا ہوتا ہے۔ وہ انسان سے زیادہ فرشتوں کی سرگوشیوں پر کان لگائے ہوئے ہوتا ہے۔ وہ دوسروں سے زیادہ خود اپنی بات کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ وہ سطحی اور ظاہری باتوں سے زیادہ گہری حقیقتوں کی دریافت میں مشغول ہوتا ہے۔

آدمی جب بولتا ہے تو وہ محدود دنیا میں ہوتا ہے، آدمی جب چپ رہتا ہے تو وہ لامحدود دنیا کی وسعتوں میں پہنچ جاتا ہے۔

تباہی کا آغاز

ایوری پیڈیز (Euripides) قدیم ایتھنز کا مشہور المیہ نگار شاعر ہے۔ وہ ۴۸۴ ق م میں پیدا ہوا، اور کم عمری میں ۴۰۶ ق م میں اس کی وفات ہوگئی۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ اس طرح کیا گیا ہے کہ خدا جس کو تباہ کرنا چاہتا ہے، سب سے پہلے اس کو دیوانہ بنا دیتا ہے :

Whom God wishes to destroy, he first makes mad.

یہ بات نہایت درست ہے۔ اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ جب کسی شخص یا قوم پر زوال آتا ہے تو اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بگڑ جاتی ہے، اور جب سوچنے کی صلاحیت بگڑتی ہے تو اس کے اقدامات بھی غلط ہو جاتے ہیں۔ اور جو لوگ غلط اقدامات کرنے لگیں ان کو پھر کوئی چیز تباہی سے نہیں بچا سکتی۔

سوچ سمجھ کا بگڑنا کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آدمی عقل کی روشنی میں رائے قائم کرنے کے بجائے جذبات کے تحت رائے قائم کرنے لگے۔ وہ اپنی زندگی کا منصوبہ حقائق کی رعایت کرتے ہوئے نہ بنائے بلکہ اپنی آرزوؤں کے زیر اثر بنائے۔ وہ گرد و پیش کے دوسرے لوگوں سے بے خبر ہو جائے اور صرف اپنے آپ میں جینا شروع کر دے۔ وہ تاریخی قوتوں اور مادی اسباب کو نظر انداز کر دے اور محض اپنی خوش خیالیوں کی دنیا میں اپنا محل بنانے کی کوشش کر رہا ہو۔

یہ دنیا حقائق اور اسباب کی دنیا ہے۔ یہاں ایک انسان اور دوسرے انسان، اور اسی طرح ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان مقابلہ جاری ہے۔ یہاں برتر ذہن اور برتر لیاقت کا ثبوت دینے کے بعد ہی کسی کو جینے کا حق ملتا ہے۔ یہاں وہی لوگ سب سے زیادہ کامیاب ہوتے ہیں جو اپنی عقل کو سب سے زیادہ استعمال کریں، جو اپنی عقل سے سب سے زیادہ فائدہ اٹھائیں۔

کوئی شخص لمبے عرصہ تک عیش و آرام میں رہے تو اس کی عقل مفلوج ہو جاتی ہے۔ کوئی قوم بہت دنوں حاکم بنی رہے تو اس کے بعد اس کی عقلی قوتیں جامد ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی وقت افراد اور قوموں کے لیے عقلی زوال کا ہوتا ہے، اور عقلی زوال آخر کار عملی زوال کا سبب بن جاتا ہے۔ اب ضرورت ہوتی ہے کہ ان کی عقلی قوتوں کو دوبارہ جگایا جائے تاکہ اس کی روشنی میں وہ اپنا سفر طے کرنے کے قابل ہو سکیں۔

پودے کی مثال

فطرت کی دنیا میں جو نمونے قائم کئے گئے ہیں ان میں سے ایک نمونہ پودے کا نمونہ ہے۔ میدان میں ایک پودا اگتا ہے۔ وہ اپنے نرم تنا پر کھڑا ہوا ہے۔ ہواؤں کے جھونکے اس کے پاس سے گزرتے ہیں مگر پودا کیا کرتا ہے۔ پودا یہ کرتا ہے کہ پچھّم کی طرف سے ہوا آئی تو وہ پورب کی طرف جھک گیا اور جب ہوا گزر گئی تو وہ دوبارہ اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا۔ اسی طرح اگر پورب کی طرف سے ہوا کا جھونکا آیا تو وہ پچھّم کی طرف جھک گیا اور جب ہوا گزر گئی تو دوبارہ وہ پہلے کی طرح کھڑا ہو گیا۔

نرم پودا ایسا نہیں کرتا کہ وہ ہوا کے مقابلہ میں اکڑ دکھائے۔ اگر وہ اکڑ دکھانے لگے اور جھکنے سے انکار کر دے تو اس کا نقصان ہوا کو نہیں پہنچے گا بلکہ خود پودا اپنی اکڑ کا شکار ہو جائے گا۔ ہوا بدستور فضاؤں میں چلتی رہے گی جب کہ پودا اپنی اکڑ کی بنیاد پر ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو جائے گا۔

یہ پودے کی مثال کی صورت میں فطرت کا ایک سبق ہے جو انسان کو دیا جا رہا ہے۔ اس مثال کے ذریعہ انسان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم جس دنیا میں ہو وہاں ہواؤں کے جھونکے ہیں اور طوفانوں کے تھپیڑے۔ اس کے مقابلہ میں تم بہت کمزور ہو۔ تمہیں ان جھونکوں اور ان تھپیڑوں کے مقابلہ میں نرمی اور موافقت کا طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ تمہاری روش یہ ہونی چاہئے کہ اپنی اصل انسانی حیثیت کو باقی رکھتے ہوئے وقتی طور پر حالات سے ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کرو۔ سختی کے ساتھ نرمی کو بھی اپنی زندگی کا ایک اصول بناؤ۔

ہوا کے مقابلہ میں پودے کا جھکنا اس لئے ہوتا ہے کہ وہ اپنی نشو نما کے عمل کو برابر جاری رکھے، یہاں تک کہ وہ پورا درخت بن جائے اسی طرح انسان جب نرمی اور ہم آہنگی کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو وہ اسلئے ہوتا ہے کہ اس کی زندگی کے سفر میں کوئی ٹھہراؤ نہ آئے۔ اس کا سفر مسلسل جاری رہے، یہاں تک کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ جائے۔

نیا طلوع

اس دنیا میں کوئی غروب آخری نہیں۔ ہر غروب کے بعد ایک نیا طلوع مقدر ہے۔ بشرطیکہ آدمی اپنی شام کو دوبارہ صبح میں تبدیل کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو ——— اس دنیا کا سب سے بڑا واقعہ روزانہ سورج کا ڈوبنا اور پھر دوبارہ اس کا نکلنا ہے۔ یہ سب سے بڑا واقعہ اس سب سے بڑی حقیقت کا مظاہرہ ہے کہ ہر ہار کے بعد دوبارہ جیت ہے، اور ہر کھونے کے بعد دوبارہ پانا۔

ہم جس دنیا میں ہیں، اس کا مالک کوئی انسان نہیں ہے، بلکہ خدا ہے جو تمام طاقتوں سے زیادہ طاقت رکھنے والا ہے۔ جس وقت کوئی انسان آپ کو محرومی سے دوچار کرتا ہے۔ یا جس لمحہ حالات کا کوئی جھونکا آپ کے چراغ کو بجھا دیتا ہے، عین اسی وقت خدا یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ میری دنیا میں ہر محروم ہونے والے کو دوبارہ دیا جاتا ہے، اور ہر بجھے ہوئے چراغ کو از سر نو روشن کیا جاتا ہے۔

اس خدائی امکان کو اپنے حق میں واقعہ بنانے کی شرط صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ آدمی اپنی متاع کو کھونے کے بعد اپنی ہمت کو نہ کھوئے۔ وہ ہر گرنے کے بعد دوبارہ اٹھے، وہ محرومی کے بعد دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد میں لگ جائے۔

شام کے بعد دوبارہ صبح کو ظہور میں لانے کے لئے کائناتی طاقت درکار ہے۔ پھر جس دنیا میں اتنے بڑے واقعہ کا ظہور ممکن ہو وہاں یہ نسبتاً بہت چھوٹا واقعہ ظہور میں کیوں نہیں آئے گا کہ ایک آدمی یا ایک قوم ایک بار گرنے کے بعد دوبارہ اٹھ جائے۔

خدا نے یہ مقدر کر دیا ہے کہ کسی کی شکست اس کے لئے آخری شکست نہ بنے۔ ایسی حالت میں شکست پر بے ہمت ہونے کا کوئی سوال نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں کسی آدمی کو اپنی دوبارہ فتح پر اتنا ہی یقین ہونا چاہئے جتنا کوئی شخص شام کے بعد دوبارہ صبح کے وقت سورج کے نکلنے کا یقین رکھتا ہے۔

لوگ عام طور پر "جو کچھ ہو چکا ہے" اس کو جانتے ہیں۔ "جو کچھ ہو سکتا ہے" اس کو نہیں جانتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگر لوگ اس دوسری بات کو جانیں تو وہ کبھی مایوس نہ ہوں۔ کیوں کہ اس دنیا میں مایوسی وقتی ہے اور امید دائمی۔

کمزور تعمیر

بچوں کا گھروندا جتنی دیر میں بنتا ہے، اس سے بھی کم مدت میں وہ زمیں بوس ہو جاتا ہے ـــــ یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مضبوط اور مستحکم زندگی کیا ہے۔ اور وہ زندگی کیا ہے جو کمزور بنیادوں پر کھڑی کی گئی ہو۔

بارش اور طوفان میں جب کوئی مکان گر پڑتا ہے تو باہر کا طوفان اس کو نہیں گراتا، مکان کی اپنی کمزوری اس کو گرا دیتی ہے۔ آندھیاں اٹھتی ہیں تو چھپر اڑ جاتے ہیں مگر پتھر سے بنے ہوئے قلعے آندھیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جگہ کھڑے رہتے ہیں۔

ہر آدمی اپنے عمل سے اپنی زندگی کی تعمیر کر رہا ہے۔ مگر تعمیر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تعمیر وہ ہے جس کے پیچھے گہری بنیاد نہ ہو، جس کا ڈھانچہ بس اوپر اوپر کھڑا کر دیا گیا ہو۔ ایسی زندگی ہمیشہ حادثات کی زد میں رہتی ہے۔ مخالفت کا معمولی جھونکا بھی اس کو ہلانے کے لئے کافی ہو جاتا ہے۔ اس کے لئے زمین پر قرار اور استحکام نہیں۔

دوسری زندگی وہ ہے جو گہری بنیادوں پر تعمیر کی جائے۔ جس کے تمام اجزا پختہ مادہ سے تیار کئے گئے ہوں۔ ایسی زندگی کو کوئی ہلا نہیں سکتا۔ مخالفین کی مخالفتیں اور دشمنوں کی سازشیں صرف اس کی مضبوطی کی تصدیق کرتی ہیں۔

کمزور تعمیر میں وقت بہت کم لگتا ہے، اس لئے اکثر لوگ کمزور تعمیر کی طرف دوڑ پڑتے ہیں۔ مگر کمزور تعمیر روزانہ گرتی ہے اور روزانہ بنائی جاتی ہے۔ اس کے برعکس مستحکم تعمیر کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بار بنا دی جائے تو صدیوں تک اپنی جگہ اٹل ہو کر کھڑی رہتی ہے۔ مستقبل کے لحاظ سے دیکھئے تو سب سے کم وقت مستحکم تعمیر میں لگتا ہے، مگر اکثر لوگ اس حقیقت کو نہیں جانتے۔

اگر آپ کو بنانا ہے تو قلعہ بنائیے، بچوں کا گھروندا نہ بنائیے۔ اس کے بعد آپ کو کسی کے ظلم کی شکایت نہ ہوگی۔ کیوں کہ اس کے بعد کوئی ظالم آپ کے قلعہ کو توڑنے کی ہمت ہی نہیں کرے گا۔ اور اگر کسی نے توڑنا چاہا تو اس کا اپنا سر تو ضرور ٹوٹ جائے گا، مگر آپ کا قلعہ توڑنے میں وہ کامیاب نہ ہوگا۔

ہار کے بعد جیت

شکست خواہ کتنی ہی بڑی ہو ، وہ ہمیشہ وقتی ہوتی ہے۔ اور دوبارہ زیادہ بہتر منصوبہ بندی کے ذریعہ اس کو فتح میں تبدیل کیا جا سکتا ہے ـــــــ اس دنیا میں ہر چیز عارضی ہے ، اسی طرح ہار بھی عارضی ہے ، اس دنیا میں کوئی ہار مستقل ہار نہیں۔

ہارنے کے بعد آدمی کے لئے دو راستے ہیں ۔ ایک یہ کہ وہ جنگ ہارنے کے بعد ہمت بھی ہار جائے۔ وہ پست ہمت ہو کر بیٹھ رہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ یہ سوچنے میں لگ جائے کہ میں ہارا تو کیوں ہارا۔ وہ فریق ثانی کے جیتنے کا سبب اور اپنے ہارنے کا سبب معلوم کرے۔

یہ دوسری سوچ آدمی کے ذہن کو کھولتی ہے۔ اس کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ زیادہ اعلیٰ تیاری کے ساتھ دوبارہ اقدام کر سکے۔ اور جو شخص ایسا کرے وہ پہلی بار نہیں تو دوسری بار ضرور کامیاب ہو کر رہتا ہے۔

اس دنیا میں ناکامی کے ساتھ کامیابی لگی ہوئی ہے اور کامیابی کے ساتھ ناکامی وابستہ ہے۔ جو شخص ناکام ہو جائے ، اس کے اندر دوبارہ اٹھنے کے لئے نیا عزم جاگتا ہے۔ اس کے دماغ کے نئے نئے گوشے بیدار ہو جاتے ہیں۔ دوسری طرف جو آدمی کامیاب ہوا ہو ، اس کی زندگی میں ٹھہراؤ آجاتا ہے۔ وہ اطمینان کی نفسیات میں مبتلا ہو کر سو جاتا ہے۔

اس طرح ہارنے والے کے لئے ہار نئی زندگی کا سبب بنتی ہے ، اور جو آدمی جیتتا ہے اس کی جیت اس کو سُلا کر زندگی سے محروم کر دیتی ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو وہ کبھی مایوس نہ ہو۔ وہ ناکامی کے بعد کبھی بد دلی کا شکار نہ ہو ، خواہ اس کی ناکامی بظاہر کتنی ہی زیادہ بڑی کیوں نہ ہو۔

یہ دنیا ہارنے کے بعد جیتنے اور جیتنے کے بعد ہارنے کا کھیل ہے۔ اس دنیا میں کامیاب کھلاڑی وہ ہے جو کھیل پر نظر رکھے نہ کہ ہار اور جیت میں کھو کر رہ جائے۔

شکست وقتی حادثہ ہے ، شکست مستقل بربادی نہیں۔ شکست آپ کو باہر کی چیزوں سے محروم کرتی ہے۔ وہ آپ کے اندر کی چیزوں کو آپ سے نہیں چھینتی۔ آپ اپنے اندر کی چیزوں کو لے کر دوبارہ نئی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

خاتمہ نہیں

مواقع نکل جاتے ہیں، مگر مواقع ختم نہیں ہوتے ــــــ یہ موجودہ دنیا کا ایک ایسا سبق ہے جو گویا ہر ذرہ اور ہر پتی سے روزانہ نشر کیا جا رہا ہے۔

ہماری دنیا کو کسی انسان نے نہیں بنایا ہے بلکہ خدا نے بنایا ہے جس کی طاقتیں لامحدود ہیں۔ دنیا کو بنانے والا اگر انسان ہوتا تو اس کے امکانات محدود ہوتے۔ مگر جب لامحدود خدا نے اس کو بنایا ہے تو اس کے امکانات اور مواقع بھی لامحدود ہیں۔

کتنے ہی مواقع آپ کے ہاتھ سے نکل جائیں۔ کتنے ہی زیادہ امکانات کو آپ کھو دیں، پھر بھی آپ کو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ ہمیشہ مزید امکانات اور مواقع آپ کے لئے موجود ہوں گے جن کو استعمال کر کے آپ اپنا مستقبل تعمیر کرسکیں۔

جب مواقع ختم ہونے والے نہ ہوں تو مواقع کے نکل جانے پر افسوس کرنا صرف بے خبر آدمی کا کام ہوسکتا ہے۔ جب ایک سواری چھوٹ کر دوسری سواری ملنے والی ہو تو مسافر اس سواری کا غم نہیں کرتا جو چلی گئی، بلکہ اگلی سواری کا انتظار کرتا ہے تاکہ اس میں بیٹھ کر اپنا سفر جاری کرسکے۔

موجودہ دنیا میں اصل اہمیت کی بات یہ نہیں ہے کہ ایک آیا ہوا موقع آپ کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ دوسرے مواقع جو ابھی باقی ہیں، ان کو آپ نے پہچانا یا نہیں اور ان کو استعمال کر کے دوبارہ اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کا جذبہ آپ کے اندر جاگا یا نہیں۔ اگر یہ دوسری بات حاصل ہو جائے تو پہلی بات کی پروا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

زندگی نام ہے ایک موقع کو کھو کر دوسرے موقع کو استعمال کرنے کا۔ اسی طرح دوسرے کامیاب ہونے والوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اور اسی طرح آپ بھی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں۔ کامیابی کا اس کے سوا کوئی طریقہ نہ دوسروں کے لئے ہے اور نہ آپ کے لئے۔

یہ قادر مطلق کی شان کے خلاف ہے کہ وہ ایسی دنیا بنائے جہاں مواقع اتنے کم ہوں کہ ایک موقع نکل جانے کے بعد دوسرا موقع آدمی کے لئے باقی نہ رہے۔

صبر — بہادری ہے

صبر بہادری ہے، اور بے صبری بزدلی۔ جو لوگ صبر کرنے پر تیار نہ ہوں انھیں آخر کار بزدل بن کر اس دنیا میں رہنا پڑے گا۔ اور بزدلی کا دوسرا نام منافقت ہے جس سے زیادہ بری اخلاقی صفت اور کوئی نہیں۔

موجودہ دنیا میں خود فطری نظام کے تحت بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ ایک انسان کو دوسرے انسان سے کوئی ذہنی یا جسمانی تکلیف پہنچتی ہے یہ ایک لازمی صورت حال ہے۔ یہ معاملہ انسانی زندگی کے آغاز ہی میں ھابیل اور قابیل کے ٹکراؤ کی صورت میں پیدا ہوا۔ اس کے بعد وہ تاریخ کے ہر دور میں، حتیٰ کہ پیغمبروں کے زمانہ میں بھی جاری رہا، وہ اسی طرح جاری رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے اور خود اس دنیا ہی کا خاتمہ ہو جائے۔

ایسی حالت میں کسی بھی انسان کے بس میں نہیں کہ وہ اپنی پسند کے عین مطابق ایسی زندگی حاصل کرلے جہاں اس کو نہ کسی سے شکایت ہو اور نہ کسی سے اختلاف۔ ایسا انتخاب موجودہ دنیا میں کسی کے لیے ممکن ہی نہیں، نہ صالحین کے لیے اور نہ غیر صالحین کے لیے۔

موجودہ دنیا میں حقیقی انتخاب صرف دو روش کے درمیان ہے۔ آپ یا تو گھر سے باہر تک ہر ایک سے مسلسل لڑتے رہیں یا شکایت و اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کریں۔ پہلی روش اگر پھول کے درخت میں اس کے کانٹوں سے الجھنے کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں دوسری روش یہ ہے کہ کانٹے کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے پھول کو لے لیا جائے۔

مگر پہلی روش کسی کے لیے بھی مستقل طور پر ممکن نہیں کیوں کہ وہ اپنی اور اپنے گھر کی تباہی کے ہم معنی ہے۔ اور کوئی بھی اتنا نادان نہیں کہ وہ مستقل طور پر اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو تباہی کے گڑھے میں ڈال دے۔ اس لیے عملاً یہ ہوتا ہے کہ بے صبری کی روش اختیار کرنے والے وقتی طور پر دوسروں سے لڑتے ہیں اور آخر کار اس کا تباہ کن نتیجہ دیکھ کر خاموشی اختیار کر لیتے ہیں مگر ایسی خاموشی کا مطلب منافقت ہوتا ہے۔

موجودہ دنیا میں آپ کو بہر حال صبر کرنا ہے۔ اگر آپ اصول کی بنیاد پر صبر نہ کریں تو آپ کو مفاد کی بنیاد پر صبر کرنا پڑے گا اور اسی دوسری روش کا نام منافقت ہے۔

ایک حقیقت

جو شخص ایک معاملہ میں غلط ثابت ہو وہ ہر معاملہ میں غلط ہے۔ اس میں صرف اس آدمی کا استثناء ہے جو غلطی کرنے کے بعد شرمندہ ہو اور کھلے دل سے اپنی غلطی کا اعتراف کرے۔

یہ ایک نفسیاتی اصول اور زندگی کی ایک اٹل حقیقت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کے ساتھ ایک کُل ہے۔ انسان سے کسی غلطی کا سرزد ہونا ایسا ہی ہے جیسے گلاس سے ایک قطرہ کا باہر آنا۔ گلاس کے قطرہ کو دیکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ اس کے اندر کیا چیز بھری ہوئی ہے۔ اسی طرح انسان کی ایک روش کو دیکھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بقیہ اعتبار سے وہ انسان کیسا انسان ہے۔

تاہم گلاس میں اور انسان میں ایک فرق ہے۔ گلاس جامد چیز ہے، اور انسان ایک متحرک مخلوق ہے۔ انسان اس پر قادر ہے کہ غلطی کرنے کے بعد وہ اپنی اصلاح کر سکے۔ اسی کا نام توبہ ہے توبہ کی صلاحیت نے انسان کو ایک خود اصلاحی مشین بنا دیا ہے۔

انسان سے جب ایک غلطی ہو، اس وقت اگر اس کا شعور جاگ اٹھے۔ وہ کسی تحفظ کے بغیر کھلے طور پر اعتراف کرلے کہ میں نے غلطی کی تو، مشینی اصطلاح میں، گویا اس نے اپنے نقص کو درست کر لیا۔ وہ دوبارہ ایک نیا انسان بن گیا۔

غلطی کرنے کے بعد اپنی غلطی کا اعتراف نہ کرنا کوئی سادہ سی بات نہیں، یہ بے حد اہم بات ہے۔ جب آدمی اپنی غلطی کو نہیں مانتا تو اس کے پیچھے کوئی خاص سبب ہوتا ہے۔ مثلاً بڑائی کا احساس۔ ذاتی مفاد کا خطرہ۔ وغیرہ۔

اسی قسم کی ایک یا دوسری کمزوری ہوتی ہے جس کی بنا پر آدمی کھلی ہوئی غلطی کا ارتکاب کرنے کے باوجود اس کا اقرار نہیں کرتا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں غلطی کے اقرار کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ جب آدمی اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہے تو وہ اپنے اندر چھپی ہوئی بہت سی کمزوریوں کو مٹاتا ہے۔ وہ گویا نفسیاتی معنوں میں ایک غسل صحت کرتا ہے۔ گندا انسان از سر نو ایک پاک صاف انسان بن جاتا ہے۔

یہی معاملہ برعکس صورت میں اس شخص کا ہے جو غلطی کا اعتراف نہ کرے۔ اس کی روح بدستور گندگی میں پڑے رہے گی، وہ ہمیشہ پیچھے جاتا رہے گا، روحانی میدان میں وہ آگے کی طرف سفر نہیں کر سکتا۔

صبح کا انتظار

ہر شام کے بعد دوبارہ نئی صبح آتی ہے۔ مگر صبح کو پانے والا صرف وہ شخص ہے جو صبح کے آنے تک اس کا انتظار کرے ــــــــ اس دنیا میں روشن صبح اپنے آپ آتی ہے۔ مگر انتظار کرنے والے اس کا انتظار نہیں کرتے۔

انسان کی سب سے بڑی کمزوری عجلت پسندی ہے۔ وہ تاریک حالات کو دیکھ کر گھبرا اٹھتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ دنیا میں رات اور دن کا نظام ہر روز اس کو سبق دے رہا ہے کہ روشنی بہرحال آئے گی، کوئی تاریکی اتنی لمبی نہیں ہو سکتی جو آنے والی روشن صبح کو آنے سے روک دے۔

دنیا میں تلخیاں بھی ہیں۔ لیکن تلخیوں کو اگر سہہ لیا جائے تو اس کے بعد مٹھاس بھی ضرور آکر رہتی ہے۔ یہاں آدمی ناکامیوں سے بھی دوچار ہوتا ہے، لیکن ہر ناکامی وقتی ناکامی ہے۔ اگر وقتی ناکامی کی چوٹ برداشت کر لی جائے تو اس کے بعد لازماً وہ مرحلہ آتا ہے جو آدمی کو کامیابی کی منزل پر پہنچا دے۔

موجودہ دنیا میں کسی چیز کو ٹھہراؤ نہیں۔ اسی طرح یہاں کامیابی اور ناکامی کو بھی ٹھہراؤ نہیں۔ یہاں ہر ناکامی کے بعد کامیابی ہے، اور ہر کامیابی کے بعد ناکامی۔ اس لئے آدمی کو چاہئے کہ کامیابی پیش آئے تب بھی وہ اعتدال پر قائم رہے، اور ناکامی کا تجربہ ہو تب بھی وہ اعتدال اور توازن کو نہ کھوئے۔

جس طرح صبح اپنے آپ آتی ہے، اسی طرح اس دنیا میں ناکامی کے بعد کامیابی بھی اپنے آپ آتی ہے۔ آدمی کو صرف یہ کرنا ہے کہ وہ انتظار کی ہمت کر سکے۔ اس دنیا میں ہر ناکامی ایک وقتی وقفہ ہے اور ہر کامیابی آئندہ ظاہر ہونے والا لازمی واقعہ۔

جس طرح شام کا آنا یقینی ہے اسی طرح شام کے بعد صبح کا ظاہر ہونا بھی یقینی ہے۔ ایک ایسی دنیا میں مایوسی کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ کائنات کا پورا نظام جس کے ساتھ ہو اس کو کس اور سے اندیشہ کرنے کی کیا ضرورت۔

کتاب کی دنیا

جس آدمی کے پاس کتاب ہے وہ اکیلا نہیں ہے ـــــ اکیلا شخص وہ ہے جس کے پاس ذہنی مشغولیت کے لئے کچھ نہ ہو۔ کتاب آدمی کو بہترین ذہنی مشغولیت دیدیتی ہے۔ پھر جو آدمی کتاب پڑھے وہ اکیلا کیسے رہے گا۔

کتاب کیا ہے۔ وہ صاحب کتاب کے مطالعہ اور تجربہ کا نچوڑ ہے۔ ہر کتاب گویا ایک خاموش آدمی ہے۔ جب ہم کتاب پڑھتے ہیں تو گویا ہم کسی آدمی کے ساتھ خیالات کے تبادلہ میں مصروف ہوتے ہیں۔ ایک کتاب پڑھنا ایک آدمی کی ہم نشینی ہے اور بہت سی کتابیں پڑھنا بہت سے آدمیوں کی ہم نشینی۔

ایک آدمی محدود مدت تک زندگی گزار کر اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔ اگر کتاب کا طریقہ نہ ہو تو گزرے ہوئے آدمیوں کے بارہ میں جاننا ہمارے لئے ناممکن ہو جائے۔ مگر کتاب کی صورت میں آدمی کے بعد بھی اس کا ریکارڈ موجود رہتا ہے۔ کتاب کے ذریعہ یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ آپ ایک مقام پر رہ کر ساری دنیا کے لوگوں سے مل سکیں۔ آپ ایک زمانہ میں ہوتے ہوئے ہر زمانہ کے لوگوں کے خیالات سے فائدہ اٹھائیں۔

کتاب کا مطالعہ آدمی کے علم کو بڑھاتا ہے۔ اس کے تجربات کو شخصی سطح سے بڑھا کر عمومی انسانیت کی سطح تک پہنچا دیتا ہے۔ کتابوں کی لائبریری گویا عالمی انسانی اجتماع ہے۔ اس اجتماع گاہ میں داخل ہو کر آپ کسی بھی وقت کسی بھی آدمی کی بات سن سکتے ہیں، کسی بھی جگہ کسی بھی آدمی سے ملاقات کر سکتے ہیں۔

کتاب کے طریقہ نے اس بات کو ممکن بنا دیا ہے کہ آپ سفر کئے بغیر دوسروں سے واقفیت حاصل کریں اور اسی طرح خود اپنے سے دوسروں کو واقف کرائیں۔ ملاقات کا سب سے بڑا کمرہ وہ ہے جہاں کتابیں ہوں، واقفیت کا سب سے بڑا ذریعہ اس کے پاس ہے جو کتابوں سے استفادہ کرنے میں لگا ہوا ہو۔ کتاب بہترین دماغوں کا ریکارڈ ہے۔ کتاب اعلیٰ انسانوں کی نمائندہ ہے۔ کتاب علم کا خزانہ ہے۔ اور بلاشبہہ اس دنیا میں علم کے خزانہ سے بڑی کوئی چیز نہیں۔

آغاز وانجام

اگر آپ نے اپنے آغاز کو پالیا تو آپ اپنے اختتام کو بھی پاسکتے ہیں۔ کیونکہ صحیح آغاز ہی کا دوسرا نام صحیح اختتام ہے ـــــ آدمی اگر صحیح رخ پر چل پڑے تو وہ منزل پر پہنچ کر رہتا ہے۔ منزل پر نہ پہنچنا ہمیشہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ آدمی نے اپنے سفر کا آغاز الٹی سمت میں کر دیا ہو۔

کائنات کا پورا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں جب بھی کوئی شخص ایک درست عمل کا آغاز کرے تو پوری کائنات اس کو تکمیل تک پہنچانے میں لگ جائے۔ باغبان ایک بیج زمین میں ڈالتا ہے تو دنیا کا پورا نظام اس کو پروان چڑھانے میں لگ جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے کمال کے درجہ کو پہنچ کر پورا درخت بن کر کھڑا ہو جائے۔

اسی طرح اس دنیا میں جب کوئی آدمی ایک صحیح عمل کا آغاز کرتا ہے تو دنیا کا پورا نظام اس کی مدد پر آجاتا ہے۔ ہر چیز اس کا ساتھ دینے لگتی ہے تاکہ وہ اپنے عمل کو اس کی تکمیل کے مرحلہ تک پہنچا سکے۔

اگر کوئی شخص دیکھے کہ اس کا شروع کیا ہوا عمل ترقی نہیں کر رہا ہے تو اس کو خود اپنی کارکردگی اور اپنے منصوبہ پر نظر ثانی کرنا چاہئے۔ یقینی طور پر اس کی اپنی طرف کوئی کوتاہی ہوگی۔ جس نے اس کے شروع کئے ہوئے عمل کو مطلوبہ انجام تک پہنچنے نہیں دیا۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ اقدام کرنے سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ لے۔ وہ حقیقت پسندانہ جائزہ کے بعد اپنا منصوبہ بنائے۔ اور جب اپنے منصوبہ پر عمل درآمد شروع کرے تو اپنے آپ کو اس میں لگانے میں کوئی کمی نہ کرے۔ آدمی نے اگر ان شرطوں کو پورا کر دیا تو اس کے بعد مستقبل میں جو چیز برآمد ہوگی وہ وہی ہوگی جس کی طلب وہ اپنے سینہ کے اندر لئے ہوئے ہے۔

ڈور کے ابتدائی سرے کو پانا ہی ڈور کے آخری سرے کو پالینا ہے۔ ڈور کے ابتدائی سرے کو مضبوطی سے تھام لیجئے۔ اس کے بعد ڈور کا آخری سرا بھی آپ کے ہاتھ میں آکر رہے گا۔ وہ آپ سے جدا ہونے والا نہیں۔

صحیح اختتام کے سوا صحیح آغاز کی اور کوئی منزل نہیں۔

مستقبل کو دیکھئے

جب آدمی کا ماضی اور حال لٹ ہو چکا ہو، اس وقت بھی اس کا مستقبل محفوظ رہتا ہے ـــــ ایک شخص کسی کا ماضی اور حال چھین سکتا ہے، مگر کوئی شخص کسی کا مستقبل چھیننے پر قادر نہیں۔

ماضی کی محرومی واقع ہو چکی، حال کی محرومی واقع ہو رہی ہے، مگر مستقبل وہ زمانہ ہے جو ابھی آنے والا ہے۔ مستقبل میں وہ تمام مواقع مزید اضافہ کے ساتھ موجود ہیں جو ماضی اور حال میں آپ کے لئے ممکن تھے۔ اس لئے اگر آپ نے ماضی اور حال کو کھو دیا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے۔ مستقبل کے اعتبار سے از سر نو اپنے عمل کی منصوبہ بندی کیجئے۔ ہو سکتا ہے کہ آئندہ آپ اتنی بڑی کامیابی حاصل کریں جو ماضی اور حال کے تمام نقصانات کی تلافی کر دے۔

زندگی کے رازوں میں سے ایک راز یہ ہے کہ آدمی کے اندر بھلا دینے کی طاقت ہو۔ اگر آپ کا ماضی اور حال برباد ہو گیا ہو تو اس کو بھلا دیجئے۔ پچھلی بربادی کو بھلانا آپ کے اندر یہ عزم پیدا کرے گا کہ آپ اپنی پوری طاقت کو نئے مستقبل کی تعمیر میں لگا دیں۔

زمانہ اگر ٹھہرا ہوا ہوتا تو آپ کو بھی ٹھہرنا پڑتا۔ اس کے بعد آپ کی محرومی ابدی محرومی بن جاتی۔ مگر زمانہ ٹھہرا ہوا نہیں ہے، زمانہ حرکت میں ہے۔ یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے کہ ایک موقع کے کھوتے ہی دوسرا موقع سامنے آجاتا ہے۔ ایک امکان کھونے کے بعد آدمی دوسرا امکان پا لیتا ہے جس کو استعمال کر کے وہ آگے بڑھ جائے۔

موجودہ دنیا میں کوئی آدمی نقصان سے بچ نہیں سکتا۔ یہاں بڑے کو بھی نقصان اٹھانا پڑتا ہے اور چھوٹے کو بھی۔ یہاں طاقت ور بھی نقصان اٹھاتا ہے اور کمزور بھی۔ اس لئے آپ کبھی نقصان پر بد دل نہ ہوں۔ ہر بار گرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کی کوشش کیجئے۔

زمانہ کا سفر ماضی اور حال پر ختم نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ مستقبل کی طرف جاری رہتا ہے۔ اگر ماضی اور حال کا سرا آپ سے چھوٹ گیا ہو تو آپ مستقبل کا سرا پکڑ لیجئے۔ آپ دوبارہ کامیابی کی منزل پر پہنچ جائیں گے۔

دشواریاں زینہ ہیں

انسان قدرت کا چھپا ہوا خزانہ ہے۔ مشکلات کی ٹھوکریں اس خزانہ کو اندر سے باہر لے آتی ہیں ـــــ پوری تاریخ کا تجربہ ہے کہ وہی لوگ سب سے زیادہ ابھرے جنھیں سب سے زیادہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

بیج جب پھٹتا ہے تو اس کے اندر سے عظیم درخت برآمد ہوتا ہے۔ یہی انسان کی شخصیت کا حال بھی ہے۔ انسان کی شخصیت پر جب حالات کا دباؤ پڑتا ہے تو اس کی اندرونی صلاحیتیں ابھرتی ہیں۔ جو چیز پہلے "بیج" کے روپ میں چھپی ہوئی تھی، وہ "درخت" کی صورت میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

انسان دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو مشکل کو صرف مشکل سمجھیں۔ دوسرے وہ جو مشکل کو چیلنج کی نظر سے دیکھیں۔ مشکل کو مشکل سمجھنا مایوسی کا ذہن پیدا کرتا ہے۔ اور مشکل کو چیلنج سمجھنے سے یہ ذہن پیدا ہوتا ہے کہ اس کا سامنا کیا جائے۔

اگر آپ مشکل کو صرف مشکل سمجھیں تو آپ کی موجود صلاحیتیں بھی مرجھا جائیں گی۔ آپ کی سوچنے کی طاقت مفلوج ہو جائے گی۔ مگر جب آپ مشکل کو چیلنج سمجھیں تو آپ کے اندر نئی ہمت جاگتی ہے۔ آپ کا ذہن پہلے سے زیادہ کام کرنے لگتا ہے۔ آپ کو نئی نئی تدبیریں سوجھتی ہیں جن کو استعمال کر کے آپ آگے بڑھ سکیں۔

جس آدمی کو صرف آسانیاں پیش آئیں وہ محدود ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی فکر میں سطحیت آجاتی ہے۔ مگر جس آدمی کو مصیبتوں اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے وہ لامحدود انسان بن جاتا ہے۔ اس کی سوچ میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے۔

دشواری ایک معلم ہے۔ دشواری سے آدمی ان باتوں کو جان لیتا ہے جن کو کسی درس گاہ میں پڑھایا نہیں جا سکتا۔ دشواری آدمی کے علم میں تجربہ کا اضافہ کرتی ہے۔ دشواری آدمی کی سنی یا پڑھی ہوئی بات کو اس کی ذاتی دریافت بنا دیتی ہے۔

زندگی کی دشواریاں زندگی کے زینے ہیں۔ وہ اس لئے ہیں تاکہ آپ کو نیچے سے اوپر لے جائیں۔ تاکہ وہ آپ کے چھپے ہوئے خزانہ کا آپ کو مالک بنا دیں۔

اپنی ذات

جو شخص اپنے آپ پر فتح حاصل کر لے ، اس کے لئے دوسروں پر فتح حاصل کرنا کچھ مشکل نہیں ——— آدمی اپنی قسمت آپ بناتا ہے۔ اپنی کمزوریوں پر غالب آنے کا نام کامیابی ہے اور اپنی کمزوریوں سے مغلوب ہوجانے کا نام ناکامی۔

ایک شخص کے اندر خود پسندی ہو تو اس کے گرد خوشامدی قسم کے لوگ جمع ہو جائیں گے۔ اور خوشامدی لوگ بلاشبہ کسی آدمی کا سب سے زیادہ برا سرمایہ ہیں۔ ایک شخص عجلت پسند ہو تو وہ ایسے موقع پر گھبرا اٹھے گا جب کہ اسے آنے والے وقت کا انتظار کرنا چاہئے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غیر ضروری طور پر آنے والی کامیابی سے محروم ہوجائے گا۔ ایک شخص صرف اپنے آپ کو جانتا ہو تو وہ لوگوں کے ساتھ درست معاملہ نہ کر سکے گا، جب کہ لوگوں کے درمیان کامیاب زندگی گزارنے کے لئے لوگوں کے ساتھ درست معاملہ کرنا ضروری ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کامیابی کے اسباب آدمی کے اپنے اندر ہوتے ہیں۔ اسی طرح ناکامی کے اسباب بھی خود آدمی کے اندر ہی پائے جاتے ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ سب سے پہلے وہ اپنا جائزہ لے۔ ہر پسپائی کا سبب خود اپنے اندر تلاش کرے۔ جو چیز آپ کے اندر ہو اس کو آپ باہر تلاش کر کے نہیں پا سکتے۔ جو نتیجہ اپنے آپ پر عمل کر کے ملتا ہو ، اس کو آپ دوسروں پر زور آزمائی کر کے حاصل نہیں کر سکتے۔

آدمی کے اندر بیک وقت دو قسم کی صلاحیتیں ہیں۔ اس کے اندر اعتراف کا مادہ ہے اور اسی کے ساتھ بے اعترافی کی خواہش بھی۔ اس کے اندر شکر کا جذبہ بھی ہے اور ناشکری کی نفسیات بھی۔ اس کے اندر تواضع کا مزاج بھی ہے اور گھمنڈ کا مزاج بھی۔ اس کے اندر امانت داری کا مادہ بھی ہے اور حق تلفی کا مادہ بھی۔ وہ دوسرے کی ترقی پر خوش ہونا بھی جانتا ہے اور دوسرے کی ترقی پر حسد کرنا بھی۔

اس دنیا میں جیت اس کے لئے ہے جو اپنے اندر کی بری خواہشوں کے مقابلہ میں جیت حاصل کرے۔ اور ہار اس کے لئے ہے جو اپنے اندر کی بری خواہشوں کے مقابلہ میں ہار جائے۔

استقلال

فارسی کا مثل ہے کہ یک در گیر و محکم گیر۔ یعنی ایک در کو پکڑو اور وہیں مضبوطی کے ساتھ جمے رہو۔ یہ فطرت کا ایک قانون ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر شعبہ سے ہے۔ آپ ایک پودا زمین میں لگائیں، اور اس کے بعد ہر روز اس کی جگہ بدلتے رہیں تو ایسا پودا کبھی بڑا درخت نہیں بن سکتا۔ ہر بار جب آپ اس کو کھود کر نکالیں گے تو اس کی کچھ جڑیں کٹ جائیں گی۔ اس طرح بار بار جڑوں کے کٹنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اس قابل ہی نہیں رہے گا کہ زمین میں جماؤ حاصل کرے اور پھر اوپر اٹھ کر فضا میں اپنی شاخیں پھیلائے۔

ایک آدمی پرائیویٹ ملازمت میں ہے۔ وہ اگر ایسا کرے کہ آئے دن ایک جگہ کو چھوڑ کر دوسری جگہ جائے تو وہ لوگوں کی نظر میں ہمیشہ بے قیمت بنا رہے گا۔ اگر وہ ایک جگہ وفاداری کے ساتھ رہتا تو وہاں اس کو قدر دانی ملتی۔ اپنے عمل سے وہاں وہ اپنے مالک کا دل جیتتا اور پھر اس کو ترقی کا درجہ ملتا۔ لیکن جگہ بدلنے کی صورت میں وہ ہمیشہ پریشان رہے گا۔ وہ اپنے لیے ایک قابل اعتماد زندگی بنانے میں کامیاب نہیں ہوگا۔ اس دنیا میں استقلال کے بغیر کوئی کامیابی ممکن نہیں۔

ایک ڈاکٹر اگر بار بار اپنے کلینک کی جگہ بدلے۔ یا ایک دکان دار بار بار ایک دکان کو چھوڑ کر دوسری دکان شروع کرتا رہے تو نہ ایسا ڈاکٹر کبھی کامیاب ہوگا اور نہ ایسا دکان دار۔ دونوں ہی آخر کار ترقی سے محروم ہو کر رہ جائیں گے۔

کوئی آدمی جب ایک سماج میں رہتا ہے تو وہ اپنے کردار سے اپنی ایک تاریخ بناتا ہے۔ یہ تاریخ ہر انسان کا عظیم ترین سرمایہ ہے۔ اگر آپ کی یہ تاریخ بن جائے کہ آپ جھوٹ نہیں بولتے، آپ وعدہ خلافی نہیں کرتے، آپ خیانت نہیں کرتے۔ آپ کسی کے ساتھ بدخواہی کا معاملہ نہیں کرتے۔ آپ اپنے اصولوں سے کبھی نہیں ہٹتے، آپ جو کام کرتے ہیں ذمہ داری کے ساتھ کرتے ہیں، تو آپ کی یہ تصویر آپ کا سب سے بڑا سرمایہ ہوگی۔

مگر یہ تصویر اسی وقت بنے گی جب کہ آپ ایک جگہ دیر تک ٹھہریں۔ اگر آپ بار بار جگہ بدلیں تو لوگوں کی نظر میں آپ کی تصویر بھی نہیں بنے گی۔ آپ لوگوں کا اعتماد حاصل نہ کر سکیں گے اور اعلیٰ ترقی کے درجہ تک پہنچنے میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔

دوقسم کے انسان

منفی نفسیات میں جینے والا انسان تاریخ کا معمول ہوتا ہے، اور ایجابی نفسیات میں جینے والا انسان تاریخ کا عامل ـــــ اول الذکر انسان کو تاریخ کے حالات بناتے ہیں۔ ثانی الذکر انسان وہ ہے جو حالات سے اوپر اٹھ کر سوچتا ہے، وہ خود ایک نئی تاریخ بناتا ہے۔

دنیا میں ہمیشہ ناخوشگوار حالات ہوتے ہیں۔ ہمیشہ ایسے اسباب پیش آتے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہو۔ ایسے موقع پر جو لوگ ردعمل کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں، وہ گویا تاریخ کا معمول بن گئے۔ وہ اپنے آس پاس کے حالات کا شکار ہو کر رہ گئے۔ ایسے لوگ ہمیشہ احتجاجی کارروائیوں میں مشغول رہتے ہیں۔ وہ کوئی مثبت کارنامہ انجام نہیں دے سکتے۔

اس کے برعکس انسان وہ ہے جو حالات سے اوپر اٹھ کر سوچے۔ جو ردعمل کے بغیر خود اپنی آزادانہ سوچ کے تحت اپنی رائے بنائے۔ ایسا انسان گویا تاریخ کے اوپر ہے۔ وہ اس حیثیت میں ہے کہ دنیا سے متاثر ہونے کے بجائے خود دنیا کی صورت گری کرے۔ وہ تاریخ کا عامل بن جائے۔

تمام حیوانات تاریخ کی پیداوار ہیں۔ مگر انسان کا مقام یہ ہے کہ وہ اپنی جد وجہد سے تاریخ بنائے۔ وہ خود اپنی ذات سے تاریخ ساز بن جائے۔

منفی نفسیات کسی انسان کے لئے قاتل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو آدمی منفی نفسیات میں مبتلا ہوا وہ گویا اپنے حالات کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔ اس کے برعکس جو شخص اپنے آپ کو منفی رجحانات اور ردّ عمل کی نفسیات سے بچائے، وہ گویا خارجی دنیا کے حملوں کے باوجود زندہ رہا۔ اس نے اپنی ہستی کو فنا ہونے سے بچالیا۔

منفی نفسیات کی بنیاد آدمی کے باہر ہوتی ہے، اور مثبت نفسیات کی بنیاد آدمی کے اندر۔ منفی نفسیات والا انسان دوسروں کے اوپر کھڑا ہوتا ہے، اور مثبت نفسیات والا انسان خود اپنی ذات پر۔ یہی واقعہ یہ بتانے کے لئے کافی ہے کہ دونوں میں سے کون ہے جس کو اعلیٰ انسان کا لقب دیا جاسکے۔ سب سے زیادہ محروم اور نادان وہ شخص ہے جس کے لئے اس دنیا میں عامل بننے کا موقع تھا، اس کے باوجود وہ صرف معمول بن کر رہ گیا۔

سب سے مشکل، سب سے آسان

"تم نے غلطی کی" اور "میں نے غلطی کی" ان دونوں جملوں میں ظاہر کے اعتبار سے صرف ایک لفظ کا فرق ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں میں اتنا زیادہ فرق ہے کہ پہلا جملہ کہنے والے کروروں انسان دنیا میں موجود ہیں، مگر دوسرا جملہ کہنے والا شاید کوئی ایک شخص بھی نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ پہلا جملہ دوسرے شخص کی نفی کرتا ہے اور دوسرا جملہ خود قائل کی نفی کرتا ہے۔ اور دوسرے کی نفی کرنا بلاشبہ سب سے زیادہ آسان کام ہے، اور اپنی نفی کرنا بلاشبہ سب سے زیادہ مشکل کام۔

موجودہ زمانہ کی وہ تمام تحریکیں جن کے گرد انسانوں کی بھیڑ دکھائی دیتی ہے، وہ سب وہی تحریکیں ہیں جو "تم نے غلطی کی" کے نعرہ پر اٹھیں۔ تمام مقبول تحریکوں اور تمام بڑے بڑے لیڈروں کی مقبولیت کا واحد راز یہ ہے کہ وہ باہر کے کسی شخص یا قوم کو غلط ثابت کرنے کے لئے اٹھے۔ اگر وہ خود اپنی نفی کرنے کا پیغام لے کر اٹھتے تو وہ اپنے ماحول میں اجنبی بن جاتے، نہ یہ کہ ان کے گرد انسانوں کی بھیڑ اکھٹا ہو۔

"تم نے غلطی کی" ایک جھوٹا کلمہ ہے، اور "میں نے غلطی کی" ایک سچا کلمہ۔ خدا کا قانون یہ ہے کہ اس دنیا میں جھوٹا کلمہ جڑ نہ پکڑ سکے، وہ جھاڑ جھنکاڑ بن کر رہ جائے۔ اس کے برعکس جو کلمہ سچا کلمہ ہو، وہ خدا کی اس دنیا میں جڑ پکڑتا ہے۔ وہ زمین میں بھی اپنی جگہ حاصل کرتا ہے اور آسمان کی وسعتوں میں بھی۔

"میں نے غلطی کی" معرفت کا کلمہ ہے۔ وہ آدمی کی شخصیت میں ارتقا پیدا کرتا ہے۔ وہ آدمی کو ادنیٰ حالت سے اعلیٰ حالت کی طرف لے جاتا ہے۔ اس کے برعکس "تم نے غلطی کی" ایک سطحی کلمہ ہے۔ وہ آدمی کو گہرے معانی سے آشنا نہیں کرتا۔ وہ آدمی کو ایک ایسے کام میں مشغول کر دیتا ہے جو سرے سے کرنے کا کوئی کام ہی نہیں۔ "میں نے غلطی کی" اصلاح ہے اور "تم نے غلطی کی" تخریب۔ "میں نے غلطی کی" خدا پرستی ہے اور "تم نے غلطی کی" نفس پرستی۔ "میں نے غلطی کی" ایک نیکی ہے اور "تم نے غلطی کی" صرف لیڈری۔ "میں نے غلطی کی" دینداری ہے اور "تم نے غلطی کی" دنیا داری۔

نقصان میں فائدہ

دنیا کا نظام اس طرح بنایا گیا ہے کہ یہاں نقصان میں بھی فائدہ ہے۔ یہاں منفی واقعہ میں بھی مثبت پہلو چھپے ہوئے ہیں، اس کی ایک انوکھی مثال حال میں سامنے آئی ہے۔ انسان کے سر میں چوٹ لگنا بظاہر ایک بھیانک واقعہ ہے۔ امریکہ میں ہر قسم کی باتوں پر ریسرچ ہوتی رہتی ہے۔ کچھ ماہرین نے اس پر ریسرچ کی تو معلوم ہوا کہ چوٹ اگر قابل برداشت دائرہ میں ہو تو وہ انسانی دماغ کو متحرک کر کے اس کے اندر نئی زندگی پیدا کر دیتی ہے۔

جب دماغ کو کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو وہ اس کی صلاحیتوں کو جگا دیتا ہے۔ دماغی خلل کی ایک انوکھی قسم جو دماغ کے بعض عمل کے لئے نقصان کا باعث ہوتی ہے وہ فنکارانہ صلاحیت میں اضافے کا باعث بھی ہو سکتی ہے۔ یہ بات ایک حالیہ مطالعہ سے معلوم ہوئی ہے۔ دماغ کے ایک حصہ کو صدمہ پہنچنا بعض دوسرے دماغی عمل کو زندہ کر سکتا ہے۔ یہ بات امریکی ڈاکٹر بروس ملر (Bruce Miller) نے بتائی جو امریکہ کی کیلی فورنیا یونیورسٹی میں ماہر علم الاعصاب کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ وہ اس تحقیقی ٹیم کے ناظم تھے جس نے اس موضوع کا علمی سروے کیا۔

When brain damage sparks talent

Washington: A rare form of dementia which causes the loss of many brain functions can also heighten the artistic talent of those afflicted, according to a study, reports Reuter. Damage to one part of the brain may somehow release functions that were previously suppressed, neurologist Dr Bruce Miller from the University of California at Los Angeles, who conducted the study, said yesterday.

(*The Hindustan Times*, New Delhi, May 2, 1998).

موجودہ دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں نہ صرف فائدہ والی چیزوں میں فائدہ ہے بلکہ ان چیزوں میں بھی فائدہ کا پہلو چھپا ہوا ہے جو بظاہر نقصان والی دکھائی دیتی ہیں۔ ایسی دنیا میں آدمی کے لئے کسی بھی حال میں مایوسی کا کوئی سوال نہیں۔

راہیں بند نہیں

روشنی اس کائنات کی سب سے تیز مسافر ہے۔ وہ ایک سکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل سے اوپر تک سفر کر لیتی ہے۔ مگر روشنی ہمیشہ ایک ہی رخ پر چلتی ہے۔ سورج کی کرنیں اگر آپ کے کمرہ کی کھڑکی کی طرف سے آرہی ہوں اور کھڑکی بند ہو تو کرنیں ایسا نہیں کرسکتیں کہ مڑ کر دروازہ کے راستہ سے داخل ہو جائیں۔ وہ کھڑکی سے ٹکرا کر پڑی رہیں گی اور کوئی دوسرا راستہ اختیار نہیں کریں گی۔

پانی کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ ایک طرف راستہ بند دیکھتا ہے تو دوسری طرف سے اپنا نکاس پیدا کر لیتا ہے۔ اگر آپ کسی پہاڑ کے اوپر کھڑے ہوں اور وہاں سے ایک ایسے چشمہ کا مشاہدہ کریں جو اوپر سے نیچے کی طرف بہہ رہا ہو، تو ہو سکتا ہے کہ آپ کو نظر آئے کہ چشمہ جدھر بہہ کر جارہا ہے اس کے عین آگے افقی دائرہ میں پھیلی ہوئی ایک چٹان ہے۔ بظاہر آپ کو خیال آسکتا ہے کہ یہ بڑی چٹان چشمہ کا راستہ روک دے گی۔ مگر بہت جلد آپ کا یہ شبہ ختم ہو جائے گا۔ جب آپ دیکھیں گے کہ چٹان کے پاس پہنچ کر پانی اپنے دائیں بائیں مڑنے لگا۔ یہاں تک کہ چٹان کے دونوں کناروں کو پار کر کے وہ آگے کی طرف نکل گیا۔

انسان کی مثال اس معاملہ میں روشنی کی نہیں، پانی کی ہے۔ انسان کا ارادہ ایک ایسا سیلاب ہے جس کو کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ زندگی کے سفر میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں حقیقۃً انسان کا راستہ رکتا ہو۔ جہاں ایک راستہ بظاہر بند نظر آئے۔ وہاں دوسرے بہت سے راستے کھلے ہوئے ہوں گے۔ ایک نادان آدمی بلاشبہ یہ کر سکتا ہے کہ سامنے کا راستہ بند دیکھ کر مایوس ہو جائے یا اس سے ٹکرا کر اپنی جان دے دے۔ لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں سے کام لیں اور عقل سے سوچ کر صورت حال سے نپٹنے کا جذبہ آپ کے اندر ہو تو کبھی آپ اس حادثہ سے دوچار نہیں ہو سکتے کہ آپ کا راستہ آپ کو بند نظر آئے۔

زندگی کی جدوجہد

زندگی ایک طویل جدوجہد ہے۔ اس جدوجہد میں وہی شخص کامیاب ہوسکتا ہے جس کے اندر یہ حوصلہ ہو کہ وہ خود طلب ہی کو اپنا حاصل بنا سکے۔

انسان بظاہر ایک محدود مخلوق ہے مگر وہ اپنے اندر لامحدود تمنائیں رکھتا ہے۔ اس کی صلاحیتیں اور اس کے حوصلے اتھاہ حد تک وسیع ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ زندگی کی جدوجہد میں داخل ہوتا ہے تو موجودہ دنیا اپنی تمام وسعتوں کے باوجود اس کو تنگ نظر آنے لگتی ہے۔ ہر کامیابی اس کو ادھوری معلوم ہونے لگتی ہے۔ ہر یافت اس کو اس احساس سے دوچار کرتی ہے کہ جو کچھ اسے پانا تھا اس کو وہ نہ پاسکا۔

ایسی حالت میں کامیاب زندگی کی تعمیر کا راز کیا ہے۔ اگر کامیاب زندگی اس کا نام ہو کہ آدمی جو کچھ پانا چاہتا ہے اس کو وہ بھرپور طور پر پالے تو تجربات بتاتے ہیں کہ موجودہ دنیا میں اس قسم کی یافت ممکن ہی نہیں۔ اس حالت میں اگر کامیابی اسی کو سمجھا جائے کہ آدمی جو کچھ چاہتا تھا اس کو اس نے پالیا تو آخر کار مایوسی کے سوا اس کے حصہ میں کچھ اور نہیں آئے گا۔ ایسی سوچ رکھنے والے انسان کے لئے اس دنیا میں دو ہی انجام ہے —— مایوسی یا خودکشی۔

حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کا راز صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ منزل کے بجائے خود طلب کو اپنا مقصود بنایا جائے۔ انسان اپنے اندر جس طلب کو محسوس کرتا ہے وہ حقیقۃً حق کی طلب ہے۔

اس دنیا میں وہی شخص کامیاب ہے جو معرفت حق کو اپنا نشانہ بنا سکے جو حقیقت اعلیٰ میں جینے کا راز پالے۔ اس کے برعکس جو لوگ مادی رونقوں کو اپنا مطلوب بنائیں وہ کبھی مطمئن نہیں ہو سکتے۔

اس دنیا کا اصول یہ ہے —— جتنا بڑا نشانہ اتنی بڑی ترقی۔

محفوظ دوری

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد سے فرمایا کہ تم لوگ زمین پر آباد ہو اور تم لوگ ایک دوسرے کے دشمن بنو گے (بعضکم لبعض عدو) اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ امتحانی دنیا میں انسان کو جن حالات کے درمیان رہنا ہے ان میں ایسا بھی ضرور ہونا ہے کہ لوگوں میں اختلاف اور مقابلے جاری ہوں جو بڑھ کر عداوت تک پہنچ جائیں۔ حتیٰ کہ قتل و خون کی نوبت آجائے۔ ایسا ہونا خود تخلیقی منصوبہ کے مطابق ہے۔ اس لیے اس کو ختم کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ درخت سے کانٹے کو ختم کرنا۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسی حالت میں کامیاب زندگی کی تعمیر کے لیے کیا کیا جائے۔ کیوں کہ لڑائی اور ٹکراؤ کے درمیان صحت مند زندگی کی تعمیر نہیں کی جاسکتی۔ صحت مند زندگی بنانے کے لیے معتدل حالات کی موجودگی لازمی طور پر ضروری ہے۔

اس کا جواب خود خالق حقیقی نے پیشگی طور پر دے دیا ہے۔ اور وہ صبر و اعراض ہے۔ عداوت کی اس دنیا میں کامیاب زندگی بنانے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ ٹکراؤ کے مواقع سے اعراض کیا جائے۔ اشتعال انگیزی اور ناخوش گواری اور ضرر رسانی کے تجربات پیش آئیں مگر ان کو نظر انداز کیا جائے۔ زیادہ فائدہ کی خاطر کم نقصان کو برداشت کر لیا جائے۔

جنگل کے جانوروں میں بھی عداوت کا یہی اصول کارفرما ہے۔ پھر جنگل کے جانور کیا کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک یہ کرتا ہے کہ فطرت کی رہنمائی کے تحت وہ اپنے آپ کو اپنے دشمن یا حریف کے مقابلہ میں محفوظ فاصلہ (safe distance) پر رکھتا ہے۔ یہی واحد فطری اصول ہے جس پر جنگل کی زندگی کروروں سال سے قائم ہے۔

محفوظ دوری پر رہنے کا یہ اصول فطرت کا اصول ہے۔ اسی کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ سڑک پر آپ اپنے کو دوسری گاڑیوں سے محفوظ دوری پر رکھتے ہیں، اسی لیے آپ کامیابی کے ساتھ اپنا سفر طے کر کے منزل پر پہنچتے ہیں۔ یہی اصول گھر کے لیے، بازار کے لیے، اجتماعی زندگی کے تمام مواقع کے لیے ضروری ہے۔ ہر جگہ ہمیں اپنے آپ کو دوسروں سے محفوظ دوری پر رکھنا ہے۔ اس دنیا میں یہی کامیابی کا واحد طریقہ ہے، اس کے بغیر موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کا حصول ممکن نہیں۔

توازن قائم رکھئے

کھلاڑی ایک کھیل دکھاتے ہیں جس کو ٹائٹ روپ واکنگ (tight-rope walking) کہا جاتا ہے۔ اس میں یہ ہوتا ہے میدان میں دو کھمبا گاڑ کر اس کے اوپر ایک موٹی رسّی تان دی جاتی ہے۔ اس رسّی کے اوپر ایک لڑکا پاؤں رکھ کر کھڑا ہوتا ہے۔ اس کے دونوں ہاتھ میں ایک لمبا بانس ہوتا ہے۔ اس بانس کے ذریعہ توازن (بیلنس) قائم کرتے ہوئے وہ تنی ہوئی رسّی پر چلتا ہے یہاں تک کہ وہ اِس سرے سے اُس سرے تک پہنچ جاتا ہے۔

یہ صرف ٹائٹ روپ کھلاڑی کی بات نہیں۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو ایسا ہی کرنا پڑتا ہے۔ ایک آدمی جب زمین پر چل رہا ہوتا ہے تو ہر آن وہ گویا کہ ٹائٹ روپ واکر ہی ہوتا ہے۔ اگر وہ چلتے ہوئے دائیں طرف کچھ زیادہ جھک جائے تو وہ دائیں طرف گر جائے گا۔ اور اگر وہ بائیں طرف زیادہ جھک جائے تو وہ بائیں طرف گر جائے گا۔ آدمی دونوں طرف توازن قائم کرتے ہوئے چلتا ہے، اسی لیے وہ کامیابی کے ساتھ راستہ طے کر پاتا ہے۔ ورنہ وہ زمین پر ادھر یا اُدھر گر پڑے۔

یہی معاملہ پوری زندگی کا ہے۔ اس دنیا میں انسان کی پوری زندگی ٹائٹ روپ واکنگ کی زندگی ہے۔ یہاں اس کو مختلف اور متضاد تقاضوں کے درمیان توازن قائم کرتے ہوئے چلنا پڑتا ہے۔ اسی توازن کو برقرار رکھنے کا نام کامیابی ہے اور اسی توازن کے بگڑ جانے کا نام ناکامی۔

خاندانی زندگی میں آدمی کو مختلف رشتہ داروں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ سماجی زندگی میں آدمی کو مختلف گروہوں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ بین اقوامی زندگی میں لیڈروں کو مختلف ملکوں اور مختلف حکومتوں کے درمیان توازن قائم کرنا پڑتا ہے۔ توازن کے اس مسئلہ سے انسانی زندگی کا کوئی بھی گوشہ خالی نہیں۔

اس توازن کو کامیابی کے ساتھ برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ آدمی سوچی سمجھی زندگی گزارے۔ وہ ہر آن محتاط رہے۔ وہ ہر لمحہ اپنا محاسبہ کرتا رہے۔ وہ اپنے تعصبات کے خول سے باہر آکر جینا سیکھے۔ وہ اپنی ذات کا لحاظ کرنے کے ساتھ دوسروں کا لحاظ کرنے والا بھی بنے۔ جو لوگ اس طرح دوطرفہ رعایت کی زندگی گزاریں وہی اس دنیا میں کامیابی کا درجہ حاصل کریں گے۔

حق کے مطابق

اپنے حق سے زیادہ چاہنا اپنے آپ کو اپنے واقعی حق سے بھی محروم کر لینا ہے ــــ جب آدمی صرف اپنے حق کا طالب ہو تو پورا نظام عالم اس کا ساتھ دے رہا ہوتا ہے، اور جب وہ اپنے حق سے زیادہ کا طالب بن جائے تو نظام عالم اس کا ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہلا آدمی کامیاب ہوتا ہے، اور دوسرا آدمی ناکام۔

جب آپ اپنے حق کے بقدر چاہتے ہیں تو آپ وہ چیز چاہ رہے ہوتے ہیں جو واقعۃً آپ کی ہے، جو ازروئے انصاف آپ ہی کو ملنا چاہئے۔ مگر جب آپ اپنے واقعی حق سے زیادہ چاہیں تو گویا آپ ایسی چیز چاہ رہے ہیں جو ازروئے انصاف آپ کی چیز نہیں ہے، بلکہ دوسرے کی چیز ہے۔ پھر دوسرا شخص کیوں آپ کو اپنی چیز دینے پر راضی ہو جائے گا۔

جب بھی آدمی اپنے حق سے زیادہ چاہے تو فوراً اس کا ٹکراؤ دوسروں سے شروع ہو جاتا ہے۔ دوسرے لوگ اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب کش مکش اور ضد اور مزاحمت وجود میں آتی ہے۔ اس کے نتیجہ میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی اصل سے زیادہ کی طلب میں اصل کو بھی کھو بیٹھتا ہے۔

اپنے حق سے زیادہ کی طلب کرتے ہی یہ ہوتا ہے کہ آدمی تضاد میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے حصہ کی چیز لینے کے لئے ایک دلیل دیتا ہے، اور دوسرے کے حصہ کی چیز پر قبضہ کرنے کے لئے دوسری دلیل استعمال کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے مقدمہ کو خود ہی کمزور کر لیتا ہے۔ وہ اپنی نفی آپ کر دیتا ہے۔ دو قسم کی دلیلوں سے وہ ثابت کرتا ہے کہ پہلی چیز اگر اس کی ہے تو دوسری چیز اس کی نہیں ہے، اور اگر دوسری چیز اس کی ہے تو پہلی چیز اس کی نہیں ہو سکتی۔

ایسے آدمی کے اوپر وہ مثال صادق آتی ہے کہ جو شخص دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑے وہ ایک کو بھی نہیں پکڑ سکتا۔ اسی طرح جو شخص اپنے اصل حق کے ساتھ مزید کا طالب بنے، وہ اصل کو بھی کھو دے گا اور اسی کے ساتھ مزید کو بھی۔

پوری انسانی تاریخ، ایک اعتبار سے، اسی حقیقت کا عملی اظہار ہے۔

کامل تباہی

ریمنڈ گرام سونگ (Raymond Gram Swing) کا ایک قول ہے۔ اس نے کہا کہ امن کا بدل جنگ نہیں ہے، امن کا بدل ہلاکت ہے:

The alternative to peace is not war.
It is annihilation.

یہ بات پچھلے زمانوں میں بھی صحیح تھی، مگر آج تو وہ آخری حد تک درست اور صحیح ہو چکی ہے۔ جدید ہتھیاروں نے اب اس کو بالکل ناممکن بنا دیا ہے کہ جنگ کے ذریعہ کوئی شخص یا قوم کوئی مثبت نتیجہ حاصل کرے۔ اب جو لوگ جنگ کا انتخاب کریں انھیں پیشگی طور پر جان لینا چاہیے کہ وہ اپنے لیے صرف موت کا انتخاب کر رہے ہیں نہ کہ زندگی اور ترقی کا۔

اگر آپ کسی مسئلہ سے دوچار ہیں تو صبر اور تحمل کے ذریعہ اس کے ساتھ نباہ کیجئے اور جو بھی کوشش کیجئے لازمی طور پر امن کے دائرہ میں رہتے ہوئے کیجئے۔ اس کے بجائے اگر آپ نے جنگ اور ٹکراؤ کا راستہ اختیار کیا تو آپ اپنے مسئلہ کو ختم کرنے میں کامیاب تو نہیں ہوں گے البتہ اپنے آپ کو مزید ناقابل حل مسائل اور ناقابل تلافی ہلاکت میں مبتلا کر لیں گے۔

مسئلہ آپ کے خیال کے مطابق، خواہ کتنا ہی گمبھیر ہو، آپ کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ آپ کے لیے انتخاب صرف دو چیزوں میں ہے۔ یا تو صورت موجودہ کو گوارا کرتے ہوئے پر امن دائرہ میں اپنی کوشش جاری کیجئے، یا لڑ بھڑ کر اپنے کو ہلاک کر لیجئے۔ اس کے سوا دوسری کوئی ممکن صورت سرے سے آپ کے لیے موجود ہی نہیں۔

قدیم زمانہ میں جنگ کسی مسئلہ کو حل کرنے کا وسیلہ ہو سکتی تھی، مگر موجودہ زمانہ میں جنگ خود سب سے بڑا مسئلہ پیدا کرنے کا ذریعہ بن چکی ہے۔ موجودہ زمانہ کی جنگ جو عمومی تباہی لاتی ہے وہ تمام تباہیوں سے زیادہ بڑی تباہی ہے۔ اس لیے اب آدمی کو صرف دو میں سے ایک کام کرنا ہے۔ یا تو وہ پر امن دائرہ میں رہتے ہوئے اپنی کوشش انجام دے، یا پھر خاموشی کا طریقہ اختیار کر لے۔

اخلاقی پستی

سرسید احمد خاں کو ان کے مخالفین نے انگریز کا پٹھو کہا۔ اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد کو ان کے مخالفین نے ہندوؤں کا ایجنٹ بتایا۔ اس کی کیا وجہ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان مخالفین نے دیکھا کہ انگریز سرسید احمد خاں کا احترام کرتے ہیں۔ اسی طرح انھوں نے دیکھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو ہندوؤں کے درمیان ایک قابل احترام حیثیت حاصل ہے۔ یہ مخالفین اپنے عناد کی وجہ سے یہ اعتراف کرنا نہیں چاہتے تھے کہ غیر مسلموں کے درمیان انھیں جو احترام ملا ہے، وہ ان کی کسی ذاتی خوبی کا نتیجہ ہے۔ اس لیے انھوں نے ان شخصیتوں کو مذکورہ قسم کے القاب دے دیے تاکہ یہ ظاہر کر سکیں کہ انھوں نے یہ درجہ محض اپنی ابن الوقتی کے ذریعہ حاصل کیا ہے نہ کہ اپنی کسی واقعی لیاقت کے ذریعہ۔

اس قسم کا قول بظاہر ایک تنقید ہے، مگر حقیقۃً وہ کمینگی ہے، اور کمینگی بلاشبہ تمام غیر اخلاقی حرکتوں میں سب سے زیادہ بری اور ذلیل حرکت ہے۔

تنقید ہر آدمی کا فطری حق ہے۔ ہر آدمی کو یہ حق ہے کہ وہ دوسرے آدمی میں کوئی غلط بات دیکھے تو برملا اس کا اظہار کرے۔ مگر یہ حق مدلل اختلاف رائے کے لیے ہے نہ کہ عیب جوئی اور الزام تراشی کے لیے۔ جو لوگ اختلاف کے وقت کمینگی کی سطح پر اتر آئیں وہ خود اپنے بارہ میں زیادہ شدت کے ساتھ وہی الزام ثابت کر رہے ہیں جس کو وہ دوسرے کے اوپر چسپاں کرنا چاہتے تھے۔

کردار کی یہ قسم ہر دور میں پائی گئی ہے۔ رسولؐ اور اصحاب رسولؐ کے زمانہ میں بھی ایسے پست افراد موجود تھے، آج بھی ایسے لوگ موجود ہیں، اور وہ بدستور اسی طرح باقی رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے جب کہ لوگوں سے یہ موقع ہی چھن جائے گا کہ وہ کسی کے اوپر جھوٹا الزام لگائیں یا کسی کی کردار کشی کریں۔

صحت مند اختلاف سراپا خیر ہے مگر الزام تراشی سراپا شر ہے۔ جس سماج میں الزام تراشی کا رواج ہو۔ لوگ ایک دوسرے کو برا القاب دینے لگیں، وہ سماج کمینہ اخلاقیات کی تربیت گاہ بن جاتا ہے۔ اور کسی سماج کے لیے اس سے زیادہ بری حالت اور کوئی نہیں۔

تیسرا باب

واقعات کی زبان میں

کامیاب منصوبہ وہ ہے جو انسان کی خواہش اور فطرت کے قانون دونوں کے درمیان مطابقت کی بنیاد پر بنایا گیا۔

تعارف کا مسئلہ

ایک مقولہ ہے۔جیسا سماجی تعارف ویسا سماجی معاملہ۔یعنی آدمی اپنے ماحول میں جس طرح اپنے آپ کو متعارف کرے گا اسی کے مطابق ماحول میں اس سے معاملہ کیا جائے گا۔یہ ایک ایسا پختہ اصول ہے جس میں شاید کوئی استثناء نہیں۔ایک بار میں دہلی سے حیدر آباد جا رہا تھا۔ دہلی ایرپورٹ پر جب میں سیکورٹی چیک کے لیے اندر داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ دوسرے مسافروں کے بیگ کھول کر دیکھے جا رہے ہیں۔میرے ساتھ ایک چھوٹا سا بیگ تھا جس میں صرف ایک جوڑا کپڑا تھا اور قرآن کا ایک نسخہ۔چوں کہ میرے خیال کے مطابق میرے بیگ میں کوئی چیکنگ والی چیز نہیں تھی میری زبان سے نکلا۔کیا اس کو کھولنا ہوگا۔میز کے دوسری طرف پولیس کی وردی میں کھڑے ہوئے آدمی نے کسی قدر درشت لہجہ میں کہا کہ کیوں نہیں (Why not)

میں نے فوراً اپنا بیگ کھول دیا۔آدمی نے میرے بیگ کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو اس میں اسے کوئی قابلِ اعتراض چیز نظر نہیں آئی۔آخر میں اس نے اس میں رکھی ہوئی کتاب اٹھائی اور پوچھا کہ یہ کیا ہے۔میں نے کہا کہ قرآن۔جیسے ہی میری زبان سے قرآن کا لفظ نکلا آدمی کا موڈ بالکل بدل گیا۔جو آدمی پہلے سختی اور غیریت کے لہجہ میں بول رہا تھا وہ نرمی اور تواضع کے لہجہ میں بولنے لگا۔

یہ فرق کیوں پیش آیا۔اس کی وجہ سادہ طور پر یہ تھی کہ پہلے میں مذکورہ شخص کی نظر میں صرف صاحبِ بیگ تھا، مگر بعد کو میں اس کی نظر میں صاحبِ قرآن بن گیا۔جب تک میں اس کی نظر میں صاحبِ بیگ تھا، وہ مجھ کو عام مسافروں کی نظر سے دیکھ رہا تھا، لیکن جب اس نے مجھ کو صاحبِ قرآن کے روپ میں دریافت کیا تو اس کی نظر میں میری نوعیت بدل گئی اب وہ مجھ کو ایک اور نظر سے دیکھنے لگا۔

اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا ماحول آپ کے ساتھ اچھا معاملہ کرے تو ضروری ہے کہ آپ اس کے مطابق اپنی تصویر بنائیں۔اپنے ماحول کے اندر آپ اپنے کو جس طرح متعارف کریں گے اسی کے مطابق ماحول بھی آپ کے ساتھ معاملہ کرے گا، نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔

ترقی کا راز

مسٹر محمد حنیف (پیدائش ۱۹۵۱) دہلی میں رہتے ہیں۔ (Tel. 4690593) وہ کسٹم اینڈ سنٹرل اکسائز ڈپارٹمنٹ میں سپر نٹنڈنٹ ہیں۔ وہ اپنے آفس میں اپنی اسلامی پہچان کو چھپاتے نہیں ہیں بلکہ ہر موقع پر قرآن اور اسلام کا تعارف بھی کرتے رہتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کو ۱۹۹۹ کا صدارتی ایوارڈ (Presidential Award) دیا گیا جو ایک اعلیٰ سرکاری اعزاز سمجھا جاتا ہے۔

یہ ایک غیر معمولی واقعہ ہے۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ ۱۵ سالہ ریکارڈ کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جاتا ہے کہ یہ امتیازی ایوارڈ کس کو دیا جائے۔ ہر سال محکمہ کے تین سینئر افسر متعلق شخص کی کارکردگی کا جائزہ لے کر اس کی رپورٹ لکھتے ہیں۔ اس طرح ۱۵ سال کے اندر ۴۵ افسران رپورٹنگ کے اس کام میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک افسر کی رپورٹ بھی اگر غیر موافق ہو تو وہ شخص اس قومی ایوارڈ کا مستحق نہیں سمجھا جائے گا۔ کمیٹی کی طرف سے نامزدگی کے بعد یہ فائل مزید تقریباً نصف درجن سرکاری دفاتر میں کلیرنس کے لئے بھیجی جاتی ہے اور آخر کار وہ صدر جمہوریہ ہند کے پاس پہونچتی ہے۔

ہندستان کے ایک مسلمان کو اس غیر معمولی ایوارڈ کا استحقاق کیسے ملا۔ اس کا جواب صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے امتیازی کارکردگی اور خوش اخلاقی۔ اس معاملہ میں محمد حنیف صاحب کا ریکارڈ غیر معمولی طور پر ممتاز ہے۔ جہاں تک ان کے حسن اخلاق کا تعلق ہے اس کا اندازہ ایک واقعہ سے ہوتا ہے۔

۱۹۹۶ میں سوپیرس کی بھرتی کے دوران ان کے آفس میں ایک اونچی ذات کا ہندو لڑکا انٹرویو کے لئے آیا۔ حنیف صاحب نے اس سے کہا کہ سوپیرس کو نالی کی صفائی اور جھاڑو لگانے جیسا کام کرنا پڑتا ہے اور آپ کا تعلق ایک اونچی ذات سے ہے تو آپ یہ سارے کام کیسے کریں گے۔ اس نے جواب دیا کہ پیٹ کی خاطر میں سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہوں۔ محمد حنیف

صاحب نے اس لڑکے کو وہ سروس دلادی۔ لیکن محمد حنیف صاحب کو اس بات کا کافی احساس تھا لہذا انہوں نے اس کو نالی صاف کرنے اور جھاڑو لگانے کے بجائے دفتر میں ڈسٹنگ کے کام پر لگا دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد محمد حنیف صاحب کا اس دفتر سے تبادلہ ہو گیا اور ان کی جگہ ایک ہندو افسر آ گیا۔ اس کے بعد ایک دن اچانک وہ لڑکا محمد حنیف صاحب کے گھر آیا، اس نے بتایا کہ ہم کو دوبارہ نالی کی صفائی اور جھاڑو لگانے کا کام آپ کے جانے کے بعد دے دیا گیا ہے، جس سے آپ نے مجھے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ محمد حنیف صاحب کو اس کا ملال ہوا اور انہوں نے مذکورہ ہندو افسر سے ٹیلیفون پر اس لڑکے کے بارے میں بات کی اور کہا کہ میری خواہش ہے کہ آپ اس لڑکے کو نالی کی صفائی اور جھاڑو کے بجائے ڈسٹنگ کے کام پر ہی لگا رہنے دیں۔ محمد حنیف صاحب کے کہنے پر نئے افسر نے اس کو ڈسٹنگ کے کام پر بحال کر دیا۔

محمد حنیف صاحب اپنے دفتر میں ہر ایک کے ساتھ اسی طرح حسن سلوک کا معاملہ کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چھوٹے ملازمین سے لے کر بڑے افسروں تک ہر آدمی ان کی عزت کرتا ہے۔

اسی طرح محمد حنیف صاحب اپنی سرکاری خدمات کو پوری دیانت داری کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ سروس کے تحت ان کو بار بار مزید مالی فائدے حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے۔ مگر محمد حنیف صاحب اس قسم کی آمدنی سے مکمل طور پر دور رہتے ہیں۔ وہ اپنی جائز تنخواہ کے دائرہ میں زندگی گزارتے ہیں اور ناجائز آمدنی کو کبھی ہاتھ نہیں لگاتے۔

محمد حنیف صاحب کی اس قسم کی صفات ہی ان کا اصل سرمایہ ہیں۔ یہی وہ صفات ہیں جس نے ان کو مذکورہ قومی امتیاز کا مستحق بنایا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ملک میں ایک مسلمان کے لئے ہر قسم کے اعلیٰ مواقع پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اعلیٰ اخلاق اور اعلیٰ کارکردگی کا طریقہ اپنالے۔ اس کے بعد اس کو اپنے ماحول سے کسی قسم کی کوئی شکایت نہ ہو گی۔

رسک لیجئے

والٹر رسٹن نے کہا کہ ناکام ہو جانا کوئی جرم نہیں۔ اصل ناکامی یہ ہے کہ آدمی ناکامی سے سبق لینے میں ناکام رہے۔ جم برک جب جانسن اینڈ جانسن کے تجارتی ادارہ میں ایک نئے شعبہ کا افسر اعلیٰ مقرر ہوا تو اس کے ابتدائی منصوبوں میں سے ایک یہ تھا کہ بچوں کے سینہ کی مالش تیار کرے۔

اس کا تیار کیا ہوا سامان بری طرح ناکام ہو گیا۔ برک کا خیال تھا کہ اس کو ملازمت سے برخاست کر دیا جائے گا۔ جب اس کو بورڈ کے چیرمین سے ملاقات کے لیے بلایا گیا تو یہ ملاقات اس کے لیے ایک اچنبھے کی ملاقات بن گئی۔ کیا تم ہی وہ شخص ہو جس نے ہمیں اتنی بڑی رقم کا نقصان پہنچایا ہے۔ چیرمین رابرٹ وڈ جانسن نے اس سے سوال کیا۔ اور اس کے بعد کہا۔ بہت اچھا، میں تم کو صرف مبارک باد دینا چاہتا ہوں۔ اگر تم غلطیاں کر رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم رسک لے رہے ہو، اور ہم کبھی ترقی نہیں کر سکتے جب تک تم رسک نہ لو:

Walter Wriston, former chairman of Citicorp, said, "Failure is not a crime. Failure to learn from failure is." When Jim Burke became the head of a new products division at Johnson & Johnson, one of his first projects was the development of a children's chest rub. The product failed miserably, and Burke expected that he would be fired. When he was called in to see the chairman of the board, however, he met a surprising reception. "Are you the one who just cost us all that money?" asked Robert Wood Johnson. "Well, I just want to congratulate you. If you are making mistakes, that means you are taking risks, and we won't grow unless you take risks."

موجودہ دنیا جن قوانین کی بنیاد پر چل رہی ہے ان میں سے ایک یہ ہے کہ کسی کام کی کامیابی کے لیے جن عوامل کی موافقت درکار ہے وہ پیشگی طور پر کسی کو معلوم نہیں رہتے۔ ایسی حالت میں کسی اقدام کی واحد ممکن صورت یہ ہے کہ آیندہ پیش آنے والی باتوں کے بارہ میں بے خبری کے باوجود اقدام کیا جائے۔ اسی کا نام رسک ہے۔

رسک لینے میں بلاشبہ اندیشے ہیں۔ مگر موجودہ دنیا میں رسک لیے بغیر کوئی کام بھی نہیں کیا جا سکتا، اگر رسک نہیں تو کامیابی بھی نہیں۔

شہر کی تعمیر

شکاگو (Chicago) امریکہ کا ایک شہر ہے۔ شکاگو کے لفظی معنی جنگلی پیاز (wild onion) کے ہیں۔ پہلے یہ شہر اپنی گندگی اور جرائم اور ناقص مکانات کے لیے مشہور تھا۔ اس لیے اس کا یہ نام پڑ گیا۔ آج شکاگو ایک اعلیٰ درجہ کا خوب صورت شہر ہے۔

شکاگو کی جدید تاریخ رچرڈ ڈیلی (Richard J. Daley) کی طرف منسوب ہے۔ وہ ۱۹۰۲ میں پیدا ہوا، ۱۹۷۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ ۱۹۵۵ میں وہ شکاگو کا میئر منتخب ہوا، اور آخر عمر تک وہاں کا میئر رہا۔ میئر بننے کے بعد اس نے ازسر نو شہر کا منصوبہ بنایا۔ اس نے قدیم شکاگو کو ہر اعتبار سے نیا شکاگو بنا دیا۔

رچرڈ ڈیلی کی کامیابی کا خاص راز یہ تھا کہ اس نے شکاگو کی تعمیر جدید کو وہاں کے باشندوں میں سے ہر ایک کا ذاتی مسئلہ بنا دیا۔ اس نے ہر ایک کے اندر یہ ذہن پیدا کیا کہ یہ کام مجھے کرنا ہے، اور میں ہی اس کو انجام دوں گا۔ اس نے شکاگو میں بسنے والے ہر ہر شخص کو یہ ماٹو دیا ——— میں اس کو کروں گا:

I will do it.

کسی بڑے تعمیری کام کے لیے یہ صحیح ترین ماٹو ہے۔ ہر آدمی کے اندر یہ جذبہ ہونا چاہیے کہ جب وہ کسی معاملہ کو دیکھے تو وہ سمجھے کہ یہ میری ہی ذمہ داری ہے۔ یہ کام مجھ کو ہی انجام دینا ہے۔ اگر سوسائٹی کے ہر فرد کے اندر یہ جذبہ ابھر آئے تو اس کے بعد ہر منصوبہ کی تکمیل یقینی ہو جائے گی۔

شکاگو بظاہر ایک برا نام تھا۔ مگر اصل کام شہر کا نام بدلنا نہیں ہے بلکہ شہریوں کا مزاج بدلنا ہے۔ شہر کا نام بدلنا ایک بے نتیجہ کام ہے۔ لیکن اگر شہریوں کے مزاج کو بدل دیا جائے تو ایک تباہ حال شہر بھی ایک اچھا شہر بن جائے گا۔

دوسروں کے خلاف نعرہ سماج میں اکھیڑ پچھاڑ پیدا کرتا ہے۔ اپنے لیے نعرہ سماج کو ترقیاتی سرگرمیوں کی طرف لے جاتا ہے۔ پہلے قسم کے نعرے سے لیڈر کی شخصیت بنتی ہے اور دوسری قسم کے نعرہ سے ملک بنتا ہے۔ پہلا نعرہ تخریب ہے اور دوسرا نعرہ تعمیر۔

پچیس سال

البرٹ سابن (Albert Sabin) ایک امریکی سائنس داں ہے۔ وہ ۱۹۰۶ میں پولینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کی عمر پندرہ سال کی تھی کہ اس کے والدین ترک وطن کر کے امریکہ آ گئے۔ یہیں ۳ مارچ ۱۹۹۳ کو اس کی وفات ہوئی۔ اس نے پچیس سال کی لگاتار محنت اور تجربے سے ایک ایسا پولیو ویکسین (polio vaccine) تیار کیا جو کہ منہ کے راستہ سے استعمال کیا جا سکتا تھا۔ جب کہ عام طور پر ویکسین انجکشن کے ذریعہ اندر داخل کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اب تک ۵۰۰ ملین لوگ اس کی ایجاد سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔

استحقاق کے باوجود البرٹ سابن کو نوبیل انعام نہیں ملا۔ مگر اس نے اس کی پروا نہ کی۔ اس نے کہا کہ میرے لیے یہی کافی ہے کہ مجھے ایک ایسی جگہ مل جائے جہاں میں اپنا کام کر سکوں :

I only ask for a place to work.

اپنی تحقیق کے دوران اس کو بے شمار مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مگر مایوسیوں اور ناکامیوں سے بے پروا ہو کر اس نے اپنا عمل جاری رکھا۔ یہاں تک کہ اس کی تحقیق آخری کامیابی کی منزل تک پہنچ گئی۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ آپ کتنے ہی اچھے ہوں، آپ ایک سائنس داں نہیں بن سکتے جب تک مایوسیوں کے ساتھ جینا نہ سیکھیں :

No matter how good you are, you cannot be a scientist unless you learn to live with frustration.

یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا عام اصول ہے۔ یہاں کوئی قابل ذکر کامیابی صرف اس باہمت شخص کے لیے ہے جو "۲۵ سال" تک یکسو ہو کر عمل کر سکے۔ جو ناکامیوں کے درمیان اپنا سفر جاری رکھے۔ جو بار بار گرنے کے باوجود بار بار اٹھے۔ جو اعتراف اور تحسین سے بے پروا ہو کر اپنے مقصد کے حصول میں سرگرم رہے۔ جس کی طاقت کا خزانہ اس کے اپنے اندر ہو نہ کہ اس کے باہر۔

جو لوگ عدم اعتراف کی شکایت کریں۔ جو ناموافق حالات سے گھبرا اٹھیں۔ جن کی نظر مواقع سے زیادہ مسائل پر رہتی ہو، وہ اس دنیا میں کبھی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے۔

انسان کی کہانی

پبلی لیس سائرس (Publilius Syrus) پہلی صدی قبل مسیح کا ایک رومی مصنف ہے۔ اس کی تحریریں لاتینی زبان میں ہیں۔ اس کے ایک قول کا ترجمہ انگریزی زبان میں اس طرح کیا گیا ہے:

A good opportunity is seldom presented, and is easily lost.

یعنی ایک اچھا موقع مشکل سے آتا ہے اور وہ بہت آسانی سے چلا جاتا ہے۔

لاتینی مصنف نے یہ بات دنیا کے اعتبار سے کہی ہے۔ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے قیمتی مواقع ہر وقت موجود نہیں رہتے۔ وہ کبھی کبھی سامنے آتے ہیں۔ مگر اکثر لوگ اس کی اہمیت کو سمجھ نہیں پاتے۔ وہ بر وقت اس کو استعمال نہیں کر پاتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ موقع نکل جاتا ہے اور اس کے بعد لوگوں کے حصہ میں جو چیز باقی رہتی ہے وہ صرف یہ افسوس ہوتا ہے کہ کیسا قیمتی موقع میں نے کتنی نادانی سے کھو دیا۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر آخرت کا ہے۔ آخرت کے لئے کچھ کرنے کا موقع ہر آدمی کو ملتا ہے۔ مگر یہ موقع کسی آدمی کو صرف ایک بار ملتا ہے۔ پھر یہ موقع اچانک آدمی کی موت پر ختم ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد جب آدمی کی آنکھ کھلتی ہے تو اس کو سخت جھٹکا لگتا ہے۔ اب یہ ابدی افسوس اس کا مقدر بن جاتا ہے کہ آخرت کی نعمتوں کو کمانے کا کتنا قیمتی موقع اللہ تعالیٰ نے مجھے دیا تھا اور میں نے کتنی غفلت میں اسے کھو دیا۔

دنیا میں ہر آدمی کو یکساں مواقع دئے گئے ہیں۔ مگر آخرت میں کسی آدمی کا کیس ضائع شدہ مواقع (Missed opportunities) کا کیس ہوگا اور کسی آدمی کا کیس استعمال شدہ مواقع (Availed opportunities) کا کیس۔ یہی چند الفاظ میں ہر ایک کی کہانی ہے۔

یہ صورت حال دنیا میں زندگی کے معاملہ کو بے حد نازک بنا دیتی ہے۔ کیونکہ دنیا کے اعتبار سے تو ایک موقع کھونے کے بعد دوسرا موقع ملنے کا بھی امکان رہتا ہے۔ مگر آخرت کا موقع ایک بار ملنے کے بعد دوسری بار ملنے والا نہیں۔ یہاں جو شخص ایک بار کامیاب ہوا وہ ہمیشہ کے لئے کامیاب ہو گیا اور جو ایک بار ناکام ہوا وہ ہمیشہ کے لئے ناکام رہ گیا۔

ترقی کا زینہ

جی ڈی برلا ہندستان کے چند انتہائی بڑے صنعت کاروں میں سے ایک ہیں۔ انھوں نے برٹش دور میں معمولی حیثیت سے آغاز کیا اور اپنی زندگی ہی میں افسانوی حیثیت حاصل کرلی۔ وہ بجا طور پر ہندستانی صنعت کے معماروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔

برلا کی ایک سوانح حیات چھپی ہے جس کا نام ہے "کرم یوگی گھنشیام جی" اس کتاب کا دیباچہ ان کے صاحبزادہ کے کے برلا نے لکھا ہے۔ یہ دیباچہ ہندستان ٹائمس (۲۰ اپریل ۱۹۹۴) نے اپنے خصوصی شمارہ میں شائع کیا ہے۔ اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

جی ڈی برلا ابتداءً کلکتہ کی ایک برٹش فرم میں بروکر (دلال) تھے۔ وہ محنت اور دیانت داری کے ساتھ اپنا کام کرتے تھے اس لئے متعلق افراد ان سے خوش رہتے تھے۔ برلا بظاہر اپنے کام پر مطمئن تھے۔ ان کے دل میں کبھی کبھی خیال آتا تھا کہ خود اپنی کوئی انڈسٹری لگائیں۔ مگر حالات کے اعتبار سے اس طرح کا فیصلہ لینا آسان بھی نہ تھا۔ چنانچہ بروکر کی حیثیت سے وہ اپنے کام میں لگے رہے۔

ایک روز ایسا ہوا کہ کمپنی کی بلڈنگ میں اوپر جانے کے لئے برلا ایک لفٹ میں داخل ہوئے۔ اس میں ایک انگریز تھا۔ اس نے برلا کو یہ کہہ کر باہر نکال دیا کہ یہ لفٹ انڈین کے استعمال کے لئے نہیں ہے۔ یہ واقعہ توہین آمیز اور اشتعال انگیز تھا۔ لیکن برلا نے ایسا نہیں کیا کہ اس کے بعد وہ انگریزوں پر اپنا غصہ اتارنے میں مصروف ہوجائیں۔ اس کے بجائے یہ واقعہ ان کے لئے ایک مہمیز بن گیا۔ برلا کے فرزند کی زبان میں، لفٹ کے واقعہ نے انھیں شدید طور پر متاثر کیا۔ اور ان کو فوری فیصلہ تک پہنچانے کا سبب گیا:

The lift incident acted as a catalyst and made him take an early decision. (p. 8)

برلا نے کمپنی کا کام چھوڑ دیا۔ اور ذاتی کاروبار کے میدان میں داخل ہوگئے۔ وہ یکسوئی کے ساتھ محنت کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وہ ملک کے عظیم صنعت کار بن گئے۔ زندگی میں حادثات کا پیش آنا بھی فطری ہے۔ دانش مند وہ ہے جس کے لئے حادثہ مزید ترقی کا زینہ بن جائے۔

مایوسی نہیں

ایک شخص راستہ چل رہا تھا۔ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے آگے ایک کھائی ہے جس نے اس کے راستہ کو بند کر دیا ہے۔ اچانک اس کو محسوس ہوا کہ اب شاید اس کے لیے آگے بڑھنا ممکن نہیں۔ تھوڑی دیر ٹھہر کر اس نے سوچا۔ اس کی سمجھ میں آیا کہ اگر وہ چند قدم پیچھے چلا جائے تو عین ممکن ہے کہ اس کو دوسرا متبادل راستہ مل جائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ کچھ دور پیچھے چلا تھا کہ اس کو ایک اور راستہ مل گیا۔ اس نے اس راستہ کو پکڑ لیا اور اس پر چلتا ہوا آگے نکل گیا۔

جب ایک راستہ آپ کو بند نظر آئے تو آپ مایوس نہ ہوں۔ اس دنیا میں ہر طرف راستے کھلے ہوئے ہیں۔ آپ اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو کام میں لا کر اس دوسری جانب سے اپنی منزل کو پہنچ سکتے ہیں۔

اس دنیا میں راستہ صرف اس انسان کے لیے بند ہے جو رکاوٹ کو جانے اور امکان کو نہ جانے۔ امکان کو جاننے والے کے لیے اس دنیا میں کبھی کوئی راستہ بند نہیں ہوتا۔

تاریخ میں بے شمار ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ایک آدمی کو اپنے راستہ میں رکاوٹ پیش آئی یا کسی وجہ سے اس کا راستہ بند ہو گیا مگر وہ ہمت نہیں ہارا، اس نے اپنی عقل کو استعمال کیا۔ اس نے دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے لوگوں سے مشورہ کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے اپنی مشکل کا حل دریافت کر لیا۔ اس نے اپنے لیے ایک اور کھلا ہوا راستہ دریافت کر لیا جس پر چل کر وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے اور آخر کار کامیابی کی منزل تک پہنچ جائے۔

مقابلہ کی اہمیت

آدتیہ وکرم برلا آنجہانی گھنشیام داس برلا کے پوتے تھے۔ یکم اکتوبر ۱۹۹۵ کو بالٹی مور (امریکہ) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف ۵۱ سال تھی۔ وہ ۸ ہزار کرور روپیہ کے انڈسٹریل ایمپائر کے چیئر مین تھے۔ انہوں نے اپنی غیر معمولی لیاقت کے ذریعہ اپنے کاروبار کو ہندستان سے لے کر بیرونی ملکوں تک پھیلا دیا تھا۔

مسٹر آدتیہ برلا نہایت ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے بہت پہلے اس بات کو محسوس کر لیا تھا کہ تحفظ (protection) کی پالیسی انڈیا کی صنعت کے لئے مفید نہیں ہے۔ وہ کہتے تھے کہ بزنس میں صرف اس وقت ترقی ہو سکتی ہے جب کہ وہ بین الاقوامی معیار پر ٹھہر سکے:

Business can progress only when it is internationally competitive.

وہ نہایت حوصلہ مند انسان تھے۔ ان کے بارے میں ایک شخص نے کہا کہ دنیا ان کی مارکیٹ تھی اور اعلیٰ کارکردگی ان کا طریقہ تھا:

The world was his market and efficiency was his strategy.

وہ ہندستانی گورنمنٹ کی تحفظ کی پالیسی کے برابر خلاف تھے۔ انہوں نے ایک بار کہا کہ ہم مقابلہ سے نہیں ڈرتے بلکہ خود مقابلہ کو ہم سے ڈرنا چاہئے:

We are not afraid of competition let competition be afraid of us.

یہی اس دنیا میں زندگی اور ترقی کا راز ہے۔ خدا نے اس دنیا کا نظام مقابلہ کے اصول پر قائم کیا ہے۔ اس دنیا میں کوئی بڑی جگہ صرف اسی کو ملتی ہے جو مقابلہ کا سامنا کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ تحفظ اور مراعات کے ذریعہ اس دنیا میں کوئی بڑی کامیابی ملنا ممکن نہیں۔

مسائل کا سامنا کرنا آدمی کی قوت کو بڑھاتا ہے۔ وہ ایک عام انسان کو غیر معمولی انسان کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

کمزور بھی طاقتور

جارجز بیدات (۱۸۹۹ - ۱۹۸۳) ایک فرانسیسی سیاست داں ہے۔ اس کے عام خیالات سے اتفاق کرنا مشکل ہے۔ تاہم اس کا ایک قول بہت بامعنی ہے۔ اس نے کہا کہ کمزور آدمی کے پاس ایک ہتھیار ہوتا ہے، اور وہ ان لوگوں کی غلطیاں ہیں جو یہ سمجھیں کہ وہ طاقتور ہیں:

> The weak have one weapon, the errors of those who think they are strong.
>
> —George Bidault

اس دنیا میں سب سے بڑی کمزوری اپنے آپ کو طاقت ور سمجھ لینا ہے۔ جو آدمی اپنے کو طاقت ور سمجھنے لگے وہ ضرور غلطیاں کرے گا۔ ایسے آدمی کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ طاقت کے گھمنڈ میں تدبیر سے بے پروا ہو جاتا ہے۔ اور جو آدمی تدبیر کی طرف سے بے پروا ہو جائے اس کے لیے شکست یقینی ہے۔ کیوں کہ اس دنیا میں کوئی بھی شخص اتنا طاقت ور نہیں کہ اس کو تدبیر کی ضرورت ہی نہ ہو۔

جب بھی کوئی آدمی یہ محسوس کرے کہ اس کا حریف طاقت کے زعم میں آکر اس کو ستا رہا ہے تو آدمی کو سمجھ لینا چاہیے کہ اب خود اس کا حریف اس کو اپنے خلاف ہتھیار فراہم کر رہا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو چاہیے کہ وہ حریف کی سرگرمیوں سے بخوبی واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

آدمی کو اس کا مطالعہ لازمی طور پر اس نتیجہ پر یہاں پہنچائے گا کہ حریف کے اندر فلاں کمزوری پیدا ہو گئی ہے اور وہ دھیرے دھیرے بڑھ رہی ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ اس کمزوری کو جانے اور اس کو بھر پور طور پر استعمال کرے۔ وہ یقینی طور پر حریف کو زیر کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس دنیا میں کمزور بھی طاقتور ہے، اور طاقتور بھی کمزور۔ خدا نے کسی بھی شخص کو یہ حیثیت نہیں دی کہ وہ مطلق طور پر کمزور ہو جائے یا وہ مطلق طور پر طاقتور بن جائے۔ اس دنیا میں ہر ایک کو یہ موقع حاصل ہے کہ وہ بظاہر ناموافق ماحول میں بھی کامیابی کے مواقع پالے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اس نے اپنی خدا داد عقل کو درست طور پر استعمال کیا ہو۔

انتظار کیجئے

نومبر ۱۹۹۱ میں میرا ایک سفر بمبئی کے لیے ہوا تھا۔ وہاں میری ملاقات حاجی اکبر خان صاحب سے ہوئی۔ وہ بمبئی کے پرانے تاجر ہیں۔ انھوں نے ایک نیا آئٹم تیار کرایا اور اس میں اپنی بہت بڑی رقم لگادی۔ یہ آئٹم خلاف اندازہ مارکٹ میں نکل نہ سکا۔ حاجی صاحب پر اس نقصان کا بہت برا اثر پڑا۔ ان کا بلڈ پریشر بڑھ گیا۔ ان کو ذیابیطس کی شکایت ہوگئی۔ وغیرہ

حاجی صاحب کی رہائش گاہ پر ان سے میری ملاقات ہوئی۔ میں ان کی باتیں سنتا رہا اور دل کے اندر ان کے لیے دعا کرتا رہا، آخر میں جب روانگی کا وقت آیا تو میں نے ایک کاغذ لیا۔ اس پر ایک جملہ لکھا۔ اور اس کو بند لفافہ میں دیتے ہوئے ان سے کہا کہ اس کو میرے چلے جانے کے بعد کھول کر پڑھ لیں۔ وہ جملہ یہ تھا : آپ اپنے معاملہ کو غم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔

اس واقعہ کے ڈیڑھ سال بعد ۸ جون ۱۹۹۳ کی ڈاک سے حاجی اکبر خان صاحب کا ایک خط مجھے ملا۔ اس خط کا مضمون یہ تھا :

"۹ نومبر ۱۹۹۱ کے روز آپ میرے غریب خانہ پر تشریف فرما تھے، اور میری روداد غم سن کر مجھے یہ نسخۂ کیمیا عطا کر گئے تھے۔ "آپ اپنے معاملہ کو غم کے خانہ میں ڈالنے کے بجائے انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔"

یقین کیجئے، آپ کے اس جملہ کا مجھ پر حیرت انگیز اثر ہوا۔ نفسیاتی طور پر صبر کی بلندیوں کو چھونے کی کوشش میں، میں اپنے غم کو کافی ہلکا محسوس کرنے لگا۔ یہاں تک کہ آج جب جون ۱۹۹۳ کا الرسالہ میرے سامنے ہے اور سفر نامہ کے تحت اس واقعہ کو ڈیڑھ سال کا عرصہ گزر چکا ہے، الحمد للہ، اسی "صبر" یعنی انتظار کے خانہ میں ڈالنے والے عمل کی وجہ سے اس نقصان کی کافی تلافی ہوچکی ہے۔ حالات نے خوش گوار کروٹ لی ہے، اور قوی امید ہے ۱۹۹۱ میں نظر آنے والا نقصان ۱۹۹۳ میں انشاء اللہ بھرپور منافع کی صورت میں اجاگر ہوگا۔ یہ ایک درس عظیم ہے کہ دنیا کے معاملہ میں صبر کا جب یہ صلہ ہے تو آخرت کے معاملہ میں صبر کا کس درجہ کا صلہ ہوگا۔ (اکبر خاں، مجگاؤں، بمبئی ۱۰)

اغیار سے تعاون

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو یہ ایک بہت نازک سفر تھا۔ یہ سفر مکہ کے مشرکین کے ظلم وتشدد کی وجہ سے کرنا پڑا تھا۔ اس کے باوجود اس سفر کے لیے آپ نے جس گائڈ کا انتخاب کیا وہ مکہ کا ایک غیر مسلم عبد اللہ بن اریقط تھا۔ اسی غیر مسلم گائڈ نے آپ کی رہنمائی کرتے ہوئے آپ کو مکہ سے مدینہ پہنچایا۔

اس سنت سے معلوم ہوا کہ دوسروں سے تعاون لینے میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق کرنا درست نہیں۔ اس طرح کے تعاون کے معاملے میں اہلیت دیکھی جائے گی نہ کہ رشتہ اور مذہب۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی پالیسی ہمیشہ اختیار کی۔ مثال کے طور پر بدر کی لڑائی کے بعد ستر کی تعداد میں غیر مسلم گرفتار کر کے مدینہ لائے گئے۔ یہ لوگ اس زمانہ کے لحاظ سے پڑھے لکھے تھے۔ چنانچہ آپ نے اعلان کیا کہ ان میں سے جو شخص مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا اور پڑھنا سکھا دے اس کو ہم رہا کر دیں گے۔ اس طرح گویا اسلام کی تاریخ میں خود رسول اللہ کے حکم سے جو پہلا اسکول کھولا گیا اس کے تمام کے تمام ٹیچر غیر مسلم تھے۔

زندگی کے معاملات میں اس اصول کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ کسی کام میں ساتھی اور کارکن کا انتخاب کرتے ہوئے اگر یہ دیکھا جائے کہ وہ اپنے مذہب کا ہے یا غیر مذہب کا، یا اپنی برادری کا ہے یا غیر برادری کا، تو اس سے کام کا معیار ختم ہو جائے گا۔ اس طرح کبھی کوئی کام اعلیٰ معیار پر انجام نہیں دیا جا سکتا۔

صحیح طریقہ یہ ہے کہ کام کو کام کے طور پر دیکھا جائے۔ یہ دیکھا جائے کہ جو کام کرنا ہے اس کام کے لیے زیادہ بہتر اور زیادہ کار آمد کون لوگ ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ ایسے معاملات میں میرٹ کی بنیاد پر افراد کا انتخاب کیا جائے نہ کہ کسی اور بنیاد پر۔

میرٹ کی بنیاد انتخاب کرنے سے اصل کام کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ اور جب کسی اور چیز کو انتخاب کی بنیاد بنایا جائے تو اسی چیز کو فروغ حاصل ہوگا جس کو انتخاب کی بنیاد بنایا گیا ہے۔

سیکھنے کا مزاج

خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ وہ ہر ایک سے کچھ نہ کچھ سیکھتے تھے (کان یتعلّم من کل احد) اس معاملہ کی ایک مثال روایات میں اس طرح آئی ہے کہ ایک بار انھوں نے ایک صحابی سے پوچھا کہ تقویٰ کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اے امیرالمومنین کیا آپ کبھی ایسے راستہ سے گزرے ہیں جس کے دونوں طرف کانٹے دار جھاڑیاں ہوں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ہاں۔ انھوں نے پوچھا کہ پھر ایسے موقع پر آپ نے کیا کیا۔ حضرت عمر نے کہا کہ میں نے اپنے دامن سمیٹ لیے اور بچتا ہوا نکل گیا۔ انھوں نے کہا کہ یہی تقویٰ ہے (ذلك التقوىٰ)

حضرت عمر کا یہی طریقہ عام معاملات میں بھی تھا۔ وہ اونٹ والوں سے اونٹ کی بات پوچھتے تھے اور بکری والوں سے بکری کی بات۔ اسی طرح ان کو جو شخص بھی ملتا اس سے اسی کے میدان کی بات دریافت کرتے۔ اس طرح وہ ہر ایک سے اس کے معلومات کے دائرہ میں سوالات کرتے اور اس سے نئی نئی باتیں دریافت کرتے۔

موجودہ زمانہ میں اسی کو اسپرٹ آف انکوائری کہا جاتا ہے۔ سائنسی نقطۂ نظر سے اس کی بے حد اہمیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہی لوگ زیادہ بڑے عالم بنتے ہیں جن کے اندر یہ متجسسانہ اسپرٹ موجود ہو۔ اس قسم کی اسپرٹ ہر ایک کے لیے انتہائی ضروری ہے، خواہ وہ ایک عام آدمی ہو یا کوئی اونچے سطح کا آدمی۔

عام طور پر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ سننے سے زیادہ سنانے کے شوقین ہوتے ہیں۔ مگر اس قسم کا مزاج علم کی ترقی میں ایک مستقل رکاوٹ ہے ایسے لوگ کبھی زیادہ بڑی علمی ترقی حاصل نہیں کر سکتے۔ جب آپ بولتے ہیں تو آپ وہیں رہتے ہیں جہاں کہ آپ ہیں۔ مگر جب آپ سنتے ہیں تو آپ اپنے علم میں اضافہ کرتے ہیں۔ صحیح علمی مزاج یہ ہے کہ آدمی بولنے سے زیادہ سنے، وہ جب بھی کسی سے ملے تو سوالات کرکے اس سے معلومات لینے کی کوشش کرے۔

معلومات کا خزانہ ہر طرف اور ہر جگہ موجود ہے۔ مگر وہ صرف اس شخص کے حصہ میں آتا ہے جو اس کو لینے کے آداب کو جانتا ہو۔

تاریخی موڑ پر

امریکہ میں اٹھارویں صدی میں ایک جنگ پیش آئی جس کو وار آف انڈپنڈنس (۸۳-۱۷۷۵) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد امریکہ میں ایسے لیڈر ابھرے جنھوں نے جنگ کے بجائے امن کی حمایت کی۔ انھیں میں سے دوسرا امریکی صدر جان اڈمس ہے جس کو غیر سیاسی سیاست داں (nonpolitical politician) کہا جاتا ہے۔ ۱۷۸۳ میں پیرس معاہدہ کے تحت جب برطانیہ نے اس کو آزادی دے دی تو اس کے بعد امریکہ نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اب سارا زور تعلیم، سائنسی ریسرچ، انڈسٹری، سٹی پلاننگ اور نئی نسل کی کردار سازی پر دیا جانے لگا۔

یہی واقعہ جاپان میں بھی پیش آیا جس کو وہ لوگ عمل معکوس (reverse course) کا نام دیتے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ تک جاپان عسکریت کے راستہ پر چل رہا تھا۔ مگر دوسری عالمی جنگ کے تجربات کے بعد اس نے اپنا راستہ بدل دیا۔ اب اس نے جنگ کے طریقہ کو مکمل طور پر چھوڑ دیا۔ اس کے بجائے اس نے تعلیم کے میدان میں اپنی تمام توجہ موڑ دی۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں ترقی کو اپنا نشانہ بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس سال میں تاریخ بدل گئی۔

عمل معکوس کا یہ مرحلہ ہر قوم کے لیے پیش آتا ہے۔ جو لوگ ایسا کریں وہ کامیاب رہتے ہیں۔ اور جو لوگ ایسا نہ کرسکیں وہ ناکام ہو کر رہ جاتے ہیں۔ امریکہ اور جاپان دونوں اس عمل معکوس کو اختیار کرنے کی مثال ہیں۔ دوسری طرف انڈیا ہے۔ آزادی کے بعد مہاتما گاندھی نے انڈیا کو اسی راستہ پر چلانا چاہا تھا۔ مگر انڈیا عمل معکوس کے اس رخ پر نہ چل سکا، اسی لیے اس کو ترقی بھی حاصل نہ ہوسکی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے لیے بھی اب یہی وقت آگیا ہے۔ وہ لمبی مدت سے اغیار سے شاکی ہو کر ان کے ساتھ بے فائدہ مقابلہ آرائی کی پالیسی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اب ضرورت ہے کہ اس خارجی پالیسی کو ترک کر دیا جائے اور اس کے بجائے داخلی پالیسی اختیار کی جائے۔ یعنی اپنی کوتاہیوں کا اقرار کرتے ہوئے خود اپنی تعمیر میں ساری توجہ لگا دی جائے۔ مسلمانوں کے مسائل کا یہی واحد حل ہے، اور اسی کو انھیں ہمہ تن اختیار کر لینا ہے۔

ذاتی ذمہ داری

دوسری عالمی جنگ (۴۵-۱۹۳۹) کے دوران سر ونسٹن چرچل برطانیہ کے وزیر اعظم تھے۔ وہ عام طور پر تشدد پسند لیڈر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ایک بوڑھے برطانی شہری نے مجھے بتایا کہ چرچل نے اس جنگ کے زمانہ میں برطانی قوم کو جو ماٹو دیا وہ یہ تھا —— سب کچھ میرے اپنے اوپر منحصر ہے:

It all depends on me.

یہ ایک بہترین ماٹو ہے۔ یہ جنگ اور امن دونوں حالتوں میں یکساں طور پر مفید ہے۔ میرے بھائی عبد المحیط خاں (انجنیئر) نے بتایا کہ ایک بار وہ چنڈی گڑھ کے ایک ٹریننگ کیمپ میں شریک ہوئے۔ یہ کیمپ پالی ٹکنیک کے پرنسپلوں کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ اور اس میں لکچر دینے کے لئے ایک انگریز پروفیسر کو بلایا گیا تھا۔ اس کا افتتاح ایک ہندستانی منسٹر کو کرنا تھا۔ منسٹر جب مائک پر کھڑے ہوئے تو اچانک بجلی چلی گئی اور لاؤڈ اسپیکر نے کام کرنا بند کر دیا۔ وہاں متبادل انتظام کے طور پر بیٹری نہ تھی۔ البتہ کالج کے ورکشاپ میں بیٹری موجود تھی۔

اس وقت زیر تربیت پرنسپل صاحبان کالج کے کسی چپراسی یا ورکر کو تلاش کرنے لگے تاکہ اس کو ورکشاپ بھیج کر وہاں سے بیٹری منگوائیں اور اس سے لاؤڈ اسپیکر کو چلائیں۔ مگر انگریز پروفیسر کو جیسے ہی صورت حال کا علم ہوا وہ خود بھاگ کر ورکشاپ میں پہنچا اور بھاری بیٹری کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا کر دوڑتا ہوا آیا اور لاؤڈ اسپیکر کے نظام سے جوڑ کر اس کو چلا دیا۔

کسی قوم کے افراد میں یہی مزاج اس قوم کی اجتماعی ترقی کا سب سے بڑا راز ہے۔ افراد کے اندر یہ اسپرٹ جتنا زیادہ پائی جائے گی، اتنا ہی زیادہ وہ قوم ترقی کر سکے گی۔

عام طور پر لوگوں کا حال یہ ہے کہ جب وہ سماج میں کوئی خرابی دیکھتے ہیں تو ایک قانون بنانے کی تجویز پیش کرتے ہیں یا نظام میں تبدیلی لا کر اس کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں۔ مگر قانون اور نظام کی ایک حد ہے۔ اپنی حد پر پہنچ کر قانون اور نظام غیر موثر ہو جاتے ہیں۔ اصلاح کا اصل طریقہ یہ ہے کہ افراد کے اندر اصلاح کا جذبہ پیدا کر دیا جائے۔

ماضی کا ایک صفحہ

انگریزی روزنامہ ٹائمس آف انڈیا (جاری شدہ ۱۸۳۸) میں روزانہ اس کے قدیم فائل سے کوئی ایک شائع شدہ خبر نقل کی جاتی ہے۔ اس کے شمارہ ۱۸ جون ۱۹۹۳ میں اس کالم کے تحت وہ خبر نقل کی گئی ہے جو اخبار مذکورہ کے شمارہ ۳۱ مئی ۱۸۷۵ میں چھپی تھی۔ اس خبر کا عنوان تھا ———

مزید یورپی کا قبول اسلام :

More Europeans convert to Islam

اس خبر میں بتایا گیا تھا کہ بنگلور میں یورپی لوگ اکثر اسلام قبول کرتے رہتے ہیں۔ اس کے مطابق ۹، مئی ۱۸۷۵ کی صبح کو جب ایک ٹرین بنگلور اسٹیشن پر رکی تو اس سے چار یورپی افراد برآمد ہوئے۔ وہ اسٹیشن کے باہر آکر کینٹونمنٹ کے علاقہ میں جنرل بازار کی ایک مسجد میں پہنچے۔ وہاں بہت سے مسلمانوں نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا۔ وہاں ان کی ملاقات ایک مولوی سے کرائی گئی جو حیدرآباد سے بلایا گیا تھا۔ اس مولوی نے کلمہ پڑھا کر ان چاروں کو اسلام میں داخل کیا۔ ان کے نام کی تفصیل یہ ہے :

	Muslim name:
Captain J. Colin Campbell, 31	Mahomed Abdoolah
Francis O'Neill, Irish sailor, 20	Abdool Lateef
W. Elder, Irish sailor, 21	Abdoolah
F. White, German sailor, 20	Abdoos Salam

خبر میں مزید بتایا گیا ہے کہ ان نومسلموں میں سے دو آدمی اس کے بعد السور (Ulsoor) گئے۔ وہاں انھوں نے ایک انگریز اوورسیر کے پندرہ سالہ لڑکے کو آمادہ کیا کہ وہ بھی انھیں کی طرح اسلام قبول کرلے۔ اس کو راضی کرکے وہ اسے ایک مسجد میں لے گئے۔ مگر مسجد کے ذمہ داروں نے اس کو اسلام میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ لڑکا ابھی نابالغ ہے، اگر اس کے باپ کو معلوم ہوا تو وہ ہم کو پریشان کرے گا۔ مگر نومسلموں نے اس کی پروا نہیں کی۔ اس کے بعد انھوں نے خود ہی لڑکے کا بال مونڈا اور اس کو محمڈن مذہب میں داخل کرلیا۔

انیسویں صدی کے مسلم رہنماؤں نے انگریزوں کو اسلام کا دشمن قرار دے کر ان سے جنگ چھیڑ رکھی تھی۔ مگر اسلام دین فطرت ہے، اگر نفرت کا پردہ ہٹا دیا جائے تو ہر ایک کو اسلام اپنے دل کی آواز محسوس ہونے لگے گا۔

ایک سائنس داں

تھامس الوا ایڈیسن (۱۹۳۱۔۱۸۴۷) مشہور امریکی سائنس داں ہے۔ بچپن میں اس کے استاد نے اس کو ایک نااہل طالب علم قرار دیا تھا۔ مگر اپنی محنت کی بدولت ترقی کرتے کرتے وہ ایک عظیم سائنس داں بن گیا۔ تھامس الوا ایڈیسن جب آٹھ سال کا بچہ تھا اور اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ اس وقت کا واقعہ ہے۔ ایک روز اس کی خاتون ٹیچر نے اڑنے کے موضوع پر بات کرتے ہوئے بتایا کہ آدمی "پر" نہ ہونے کی وجہ سے نہیں اڑ سکتا جب کہ چڑیا "پر" ہونے کی وجہ سے اڑتی ہے۔ سارے بچے مطمئن ہوگئے مگر الوا کے ذہن میں ایک مختلف مثال آگئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا کہ میڈم مگر پتنگ تو اڑتا ہے حالانکہ اس کے "پر" نہیں ہوتے۔ ٹیچر بچہ کے اس سوال کا جواب نہ دے سکی۔ مگر اس نے اپنی لاعلمی کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا۔ اور بات کو یہاں تک بڑھایا کہ الوا کو اسکول سے نکلوادیا۔ اس نے کہا کہ یہ ایک بے وقوف لڑکا ہے اور بہت زیادہ بولتا ہے۔

تھامس الوا ایڈیسن نے بہت سی سائنسی چیزیں دریافت کیں۔ مثلاً وائرلیس، ٹیلی فون، بجلی، فوٹوگرافی، بجلی کی روشنی وغیرہ۔ تقریباً ایک سو چھوٹی بڑی ایجادات اس کی طرف منسوب ہیں۔
تھامس الوا ایڈیسن جب بچہ تھا تو وہ بہت زیادہ سوالات کرتا تھا۔ اسکول کی خاتون ٹیچر اس کے سوالات کا جواب نہ دے سکی تو اس نے اس معاملہ کو اپنے وقار کا مسئلہ بنالیا اس بنا پر وہ الوا کی صلاحیت کو دریافت کرنے میں ناکام رہی۔ مگر الوا کی ماں اس نفسیاتی پیچیدگی سے خالی تھی۔ اس لئے اس نے بہت جلد اس حقیقت کو جان لیا کہ الوا کا زیادہ سوال کرنا دراصل اس کی تخلیقی ذہانت کا ثبوت ہے۔ اس نے مادرانہ شفقت کے ساتھ الوا کو علم و تحقیق کے راستہ پر ڈال دیا۔ یہاں تک کہ وہ ایک عظیم سائنس داں بن گیا۔

اتحاد یا بھیڑ

شائستہ اکرام اللہ (عمر ۷۵ سال) مسٹر محمد علی جناح کی گہری عقیدت مندوں میں سے ہیں۔ انھوں نے ان کے تحت کام کیا ہے۔ وہ ۱۹۴۷ سے ۱۹۵۴ تک پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کی ممبر رہی ہیں۔ ۱۹۶۴ سے ۱۹۶۷ تک وہ مراکو میں پاکستان کی سفیر تھیں، وغیرہ۔

ریڈرس ڈائجسٹ (مئی ۱۹۹۱) میں ان کا ایک مضمون مسٹر محمد علی جناح کے بارے میں چھپا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے مسٹر جناح سے متعلق مختلف یادداشتیں نقل کی ہیں۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ابتداءً ہندستان کے مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ نہ تھے۔ مگر مسٹر جناح کی قیادت کا یہ کرشمہ تھا کہ ۴۶-۱۹۴۵ کا الکشن ہوا تو ہندستانی ریاستوں میں ۸۵ فی صد مسلم سیٹوں پر مسلم لیگ کا قبضہ ہوگیا۔

انھوں نے لکھا ہے کہ قائد (مسٹر جناح) یہ کہا کرتے تھے کہ انھوں نے ایک بھیڑ کو ایک قوم کی صورت دی ہے۔ آج پاکستان کے داخلی جھگڑوں کو دیکھتے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم دوبارہ بھیڑ کی حالت کی طرف واپس چلے گئے ہیں:

The Quaid used to say that he had fashioned a nation out of a mob. Today, seeing all our internal squabbles, I sometimes think that we have gone back to being a mob.

لوگ اکثر یہ غلطی کرتے ہیں کہ وہ جلسہ گاہ میں لوگوں کے جمع ہونے کو اتحاد سمجھ لیتے ہیں۔ حالاں کہ موجودہ قسم کے جلسے حقیقۃً بھیڑ کی وقتی یکجائی کے ہم معنیٰ ہیں۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔ بھیڑ کا ایک متحد قوم بننا جلسہ جلوس سے بالکل علاحدہ چیز ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ لوگوں کے درمیان مثبت سطح پر یکساں سوچ آجائے، ان کے اندر مستحکم کردار پیدا ہوجائے۔ وہ اختلاف کو نظرانداز کرتے ہوئے دوسروں کا ساتھ دینے پر راضی ہوں۔ ان کے اندر یہ مزاج پیدا ہوجائے کہ ذاتی مفادات سے اوپر اٹھ کر بلند تر انسانی مقاصد کے لیے جینے لگیں —— اتحاد وہ ہے جو روزانہ کی حقیقی زندگی میں دکھائی دے نہ کہ وقتی قسم کے جلسہ اور جلوس میں۔

کامیابی کی شرط

ایک شخص رات کے وقت سیڑھی سے نیچے اتر رہا تھا۔ اگرچہ وہ ایک بینا آدمی تھا۔ مگر سیڑھی پر روشنی نہ تھی۔ سیڑھی کا ایک زینہ کسی قدر ٹوٹا ہوا تھا۔ وہ اس کو نہ دیکھنے کی وجہ سے اس پر ٹھیک سے اپنا قدم نہ جما سکا۔ اور پھسل کر گر گیا۔

دوسرا شخص سڑک پر چل رہا تھا۔ دن کا وقت تھا۔ مگر چلنے والا اندھا تھا۔ سڑک کے ایک کنارے مین ہول کا ڈھکن کھلا ہوا تھا۔ وہ اندھا ہونے کی وجہ سے اس کو نہ دیکھ سکا۔ اور اس کا پاؤں گڑھے میں چلا گیا۔

اس دنیا میں راستہ طے کرنے کے لیے بیک وقت دو چیزوں کی ضرورت ہے —— آنکھ اور روشنی۔ اگر آنکھ ہو مگر روشنی نہ ہو، یا روشنی ہو مگر آنکھ نہ ہو، دونوں صورتوں میں انجام ایک ہوگا۔ آدمی گڑھے میں گر کر تباہ ہو جائے گا۔ وہ محفوظ طور پر اپنا راستہ طے نہیں کر سکتا۔

یہی معاملہ پوری انسانی زندگی کا ہے۔ زندگی میں کامیابی کے لیے بھی وہی اصول ہے جو مذکورہ دونوں واقعہ میں نظر آتا ہے۔ یعنی بیک وقت بینائی اور روشنی دونوں چیزوں کا حامل ہونا۔

ایک قوم ہے۔ اس کے افراد اللہ کا دیا ہوا دماغ رکھتے ہیں، مگر ان کے پاس علم نہیں، ایسی حالت میں گویا کہ ان کے پاس آنکھ ہے مگر روشنی نہیں۔ ایسے لوگ آنکھ رکھتے ہوئے بھی زندگی کے راستوں میں بھٹکتے رہیں گے۔

اسی طرح ایک قوم ہے۔ اس کے افراد تعلیم یافتہ ہیں، مگر ان کا ذہن بگڑا ہوا ہے۔ لوگوں کے دلوں میں نفرت اور جھنجلاہٹ کے جذبات بھرے ہوئے ہیں۔ ایسی قوم کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے پاس روشنی ہے مگر وہ آنکھ سے محروم ہے۔ یہ لوگ بھی کامیابی کے ساتھ زندگی کا راستہ طے نہیں کر سکتے۔ کسی نہ کسی موڑ پر وہ ٹکرا کر تباہ ہو جائیں گے۔

کسی قوم کی ترقی کے معاملہ میں یہی جڑ کی بات ہے۔ جو لوگ قوم کو اٹھانا چاہتے ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ یہاں محنت کریں، کسی اور میدان میں تقریریں کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز ہے۔

ایک فرق

۱۵ اگست ۱۹۹۵ کو دہلی میں ایک میٹنگ میں مسٹر راج موہن گاندھی سے ملاقات ہوئی۔ وہ مہاتما گاندھی کے پوتے ہیں اور اب ان کی عمر ۶۰ سال ہو چکی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار وہ جاپان کی ایک کانفرنس میں شریک تھے۔ وہاں ایک جاپانی ڈیلی گیٹ نے ان سے کہا کہ میں پچھلے پندرہ سال سے مختلف مقامات پر ہونے والی کانفرنسوں میں شریک رہا ہوں۔ میں نے پایا کہ کسی انٹرنیشنل کانفرنس میں، جہاں جاپانی اور ہندستانی دونوں شرکت کر رہے ہوں، وہاں صدر کو ہمیشہ دو مشکل پیش آتی ہے۔ ایک، شرمیلے جاپانی کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ بولے۔ دوسرے، ہندستانی ڈیلی گیٹ کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ اپنی تقریر کو تمام کرے:

Chairperson of international seminars has two difficulties:
(1) To persuade the shy Japanese to speak.
(2) To persuade the Indian delegate to complete his speech.

ایک انسان وہ ہے جس کے مزاج میں سنجیدگی ہو۔ جو سیکھنا چاہتا ہو اور جس کے اندر کام کرنے کا شوق ہو۔ اس کا حال وہی ہوگا جو مذکورہ قول میں جاپانی کا حال بتایا گیا ہے۔ ایسا انسان بولنے سے زیادہ سننا چاہے گا۔ کیوں کہ سننا اس کے علم میں اضافہ کرتا ہے۔ اس کا دھیان اپنی عملی ذمہ داریوں پر ہوگا۔ اور جس آدمی کا ذہن اپنی عملی ذمہ داریوں پر لگا ہوا ہو، اس کا بولنا کم ہو جاتا ہے۔ عمل کا مزاج اپنے آپ قول کو گھٹا دیتا ہے۔

دوسرا انسان وہ ہے جو سنجیدگی سے خالی ہو۔ جس کے اندر یہ شوق نہ ہو کہ وہ اپنے علم میں اضافہ کرے۔ جو محنت سے دور بھاگتا ہو۔ ایسے آدمی کا حال وہ ہوتا ہے جو مذکورہ قول میں ہندستانی کا بتایا گیا ہے۔ ایسا انسان سب سے زیادہ بولنے میں دلچسپی رکھتا ہے کیونکہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ کچھ اور باتیں ہیں جن کو اسے جاننا چاہئے۔ وہ بے تکان بولے گا، کیونکہ اس کا احساس ہوگا کہ زیادہ بول کر وہ اپنے کم کام کی تلافی کر سکتا ہے۔

زیادہ بولنا اور کم کرنا غیر سنجیدہ انسان کی علامت ہے، اور کم بولنا اور زیادہ کرنا سنجیدہ انسان کی علامت۔

فطری زندگی

ایک بار میں ایک صاحب کے گھر پر ان سے ملنے کے لیے گیا۔ وہاں ان کے چار چھوٹے بچے (دو لڑکی، دو لڑکا) کھیل رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ وہ بار بار اپنے والد سے ایک دوسرے کی شکایت کرتے ہیں ——— اس نے مجھے مار دیا، اس نے میرا کھلونا لے لیا، اس نے مجھے دھکیل دیا، اس نے مجھے ایسا کہہ دیا، وغیرہ۔ ان شکایتوں کے باوجود وہ سب مل کر کھیلتے رہے۔ ان کے باہمی تعلق میں پھر بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

شکایتوں کے باوجود ان کی باہمی محبت کیوں باقی رہی۔ اس کی وجہ خونی تعلق ہے۔ وہ سب بھائی اور بہن تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خون کا رشتہ رکھتے تھے۔ یہ خونی تعلق شکایتوں کے اوپر غالب رہتا تھا۔ اختلاف کے باوجود وہ انھیں آپس میں جوڑے رکھتا تھا۔

یہ فطرت کی ایک نشانی ہے جو بتاتی ہے کہ دنیا میں آدمی کو کس طرح رہنا چاہیے۔ دنیا میں لوگوں کو اس طرح رہنا چاہیے کہ ان کے درمیان اختلاف اور شکایت کی صورتیں پیدا ہوں، اس کے باوجود ان کا باہمی تعلق نہ ٹوٹے، اس کے باوجود وہ محبت کے ساتھ مل جل کر زندگی گزاریں۔

دنیا میں ایسا بہر حال ہوگا کہ جب لوگ مل جل کر رہیں گے تو ایک کو دوسرے سے شکایت پیدا ہوگی۔ شکایت کے واقعات سے خالی زندگی اس دنیا میں ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں جو چیز مطلوب ہے وہ یہ نہیں کہ انسانی سماج شکایت کے واقعات سے خالی ہو جائے۔ بلکہ اصل مطلوب یہ ہے کہ شکایت کو نفرت تک پہنچنے سے بچایا جائے۔

بھائی بہن کے معاملہ میں جو چیز شکایت کو نفرت تک پہنچنے سے روکتی ہے وہ خونی تعلق ہے۔ اور عام انسان کے لیے اخلاقی اصول اسی روک کا کام کرتا ہے۔ خونی تعلق ایک طبعی تقاضا ہے، اس لیے اس کے اوپر کوئی ثواب یا انعام نہیں۔ مگر اخلاقی اصول کو آدمی خود اپنے ارادہ سے اختیار کرتا ہے، ایسا آدمی خود اپنے اختیار سے اپنے آپ کو ایک ڈسپلن میں باندھتا ہے، اس لیے جو آدمی اس اخلاقی ڈسپلن کا ثبوت دے اس کے لیے بہت بڑا انعام ہے، دنیا میں بھی اور آخرت کی ابدی زندگی میں بھی۔

خود اعتمادی

۱۹۷۵ میں ساؤتھ کوریا نے اسٹیل فیکٹری کا ایک منصوبہ بنایا۔ اس کے لیے انھیں ورلڈ بینک کے قرض کی ضرورت تھی۔ انھوں نے اس کی درخواست بھیجی۔ اس کے بعد حسب قاعدہ بینک کے ماہرین کی ایک پارٹی کوریا گئی تاکہ وہ برسرِ موقع حالات کا مطالعہ کرے۔ اس پارٹی نے حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ رپورٹ دی کہ کوریا کے موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے یہ منصوبہ قابل عمل (feasible) نہیں ہے، چنانچہ ورلڈ بینک نے کوریا کو اس مقصد کے لیے قرض دینے سے انکار کر دیا۔

مگر ساؤتھ کوریا کے لوگوں نے ہمت نہیں ہاری۔ انھوں نے دوسرے ذرائع تلاش کیے اور کسی نہ کسی طرح اپنی فیکٹری قائم کر دی۔ ۲۰ سال بعد کوریا کی یہ فیکٹری دنیا کی دوسری سب سے بڑی اسٹیل فیکٹری بن چکی تھی۔ ورلڈ بینک کا ایک ایکسپرٹ دوبارہ کوریا آیا تاکہ وہ قائم شدہ فیکٹری کو دیکھے۔ اس نے قریب سے فیکٹری کا معائنہ کرنے کے بعد دوبارہ لکھا کہ ۲۰ سال پہلے ہم نے جو بات کہی وہ بجائے خود صحیح تھی۔ مگر ہم اپنے جائزہ میں ایک چیز کو شامل نہ کر سکے تھے، وہ یہ کہ کوریا کے لوگ خود اعتمادی (self-confidence) کا لامحدود ذخیرہ اپنے پاس رکھتے ہیں۔

خود اعتمادی خدا کی دی ہوئی ایک صفت ہے۔ وہ ہر ایک کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ البتہ کچھ لوگ اس کو استعمال کرتے ہیں اور کچھ لوگ اس خداداد صفت کو استعمال کرنے میں ناکام ثابت ہوتے ہیں۔ مثلاً کوریا کے لوگ بینک کے انکار کے بعد اگر یہ کہنا شروع کرتے کہ بینک والے متعصب ہیں۔ وہ ہماری ترقی نہیں چاہتے۔ وہ ہم کو اقتصادی پس ماندگی میں مبتلا رکھنا چاہتے ہیں۔ تو ان کی خود اعتمادی کی صفت دب کر رہ جاتی۔ ان کا ذہن عمل کے رخ پر چلنے کے بجائے شکایت اور احتجاج کے رخ پر چل پڑتا۔ اور جب وہ ایسا کرتے تو ان کے اندر خود اعتمادی والے جذبات ابھرنے سے رہ جاتے۔ یہ خداداد صفت ان کے اندر چھپی ہوئی موجود رہتی مگر وہ اس کے عملی استعمال سے محروم رہتے۔ کوریا کی فضا شکایتی الفاظ سے بھر جاتی مگر وہاں کوئی اسٹیل فیکٹری کام کرتی ہوئی نظر نہ آتی۔

خدا نے انسان کو ہر قسم کی اعلیٰ صلاحیتیں وافر مقدار میں عطا کی ہیں۔ مگر ان کو استعمال کرنا صرف انھیں بلند حوصلہ لوگوں کے لیے مقدر ہے جو مثبت طرز فکر کے حامل ہوں، جو منفی طرز فکر سے آخری حد تک پاک ہوں۔

شرافت کی طاقت

سابق وائس پریسیڈنٹ آف انڈیا محمد ہدایت اللہ صاحب (۱۹۹۲-۱۹۰۵) کا ایک واقعہ ہے۔ یہ واقعہ ان کے پی اے مسٹر اطہر صدیقی ایم اے نے مجھے بتایا۔ انھوں نے بتایا کہ ایک بار پنجاب کے سکھ پیشواؤں کا ایک وفد ہدایت اللہ صاحب سے ملنے کے لیے نئی دہلی آیا۔ وہ لوگ اپنی روایات کے مطابق، کرپان لگائے ہوئے تھے۔ وائس پریسیڈنٹ کی سرکاری رہائش گاہ پر سیکوریٹی کے جو لوگ تھے، انھوں نے سکھوں سے کہا کہ آپ لوگ اپنی یہ کرپانیں باہر ہمارے پاس رکھ دیں۔ اس کے بعد وائس پریسیڈنٹ سے ملنے کے لیے اندر جائیں۔ وہ لوگ اپنی کرپانیں باہر چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔

اب بات بڑھی۔ سیکوریٹی افسر نے ٹیلی فون کے ذریعہ وائس پریسیڈنٹ کے سکریٹری سے رابطہ قائم کیا اور صورت حال بتائی۔ سکریٹری نے آرڈر دے دیا کہ انھیں کرپانوں کے ساتھ اندر مت جانے دو، اور اگر وہ اس طرح اندر جانے پر اصرار کریں تو ان کو گرفتار کر لو۔

اطہر صدیقی صاحب نے بتایا کہ میں نے موقع کی نزاکت کو محسوس کیا۔ چنانچہ میں فوراً اندر گیا اور ہدایت اللہ صاحب سے مل کر انھیں بتایا کہ یہاں اس قسم کی صورت حال پیدا ہوگئی ہے۔ اور سیکوریٹی افسر اور سکریٹری کا رویہ سراسر حکمت کے خلاف ہے۔ آپ ملٹری افسر سے براہ راست کہہ دیں کہ وہ ان لوگوں کو نہ روکیں اور انھیں کرپانوں کے ساتھ اندر آنے دیں۔ ہدایت اللہ صاحب معاملہ کی نزاکت کو سمجھ گئے۔ اور اس کے مطابق ٹیلی فون پر سیکوریٹی افسر کو ہدایت دے دی۔

اس کے بعد سکھ وفد اپنی کرپانوں کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ہدایت اللہ صاحب کے سامنے پہنچتے ہی انھوں نے اپنی کرپانوں کو اتار کر ہدایت اللہ صاحب کے قدموں میں رکھ دیا۔ انھوں نے کہا کہ کیا ہم کمینہ پن کریں گے کہ یہاں آکر آپ کے اوپر ان کرپانوں سے حملہ کر دیں۔ آپ ہمارے لیے باپ کے برابر ہیں۔ ہم تو ایسا کبھی سوچ بھی نہیں سکتے۔

حکمت سب سے بڑی طاقت ہے۔ اگر آپ حکمت کا طریقہ اختیار کریں تو مسلح دشمن بھی اپنے ہتھیاروں کو پھینک دے گا اور آپ کی انسانیت کے اعتراف میں آپ کے قدموں پر گر جائے گا۔

مستقبل بینی

مئی ۱۹۹۲ میں ایک صاحب آندھرا پردیش سے دہلی آئے۔ وہ بطور تحفہ ہمارے لیے آم بھی لائے تھے۔ آم کی ٹوکری پیش کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ یہ آم جب میں نے اپنے یہاں کے بازار سے لیے تو وہ بالکل اچھے تھے۔ مگر راستہ میں شدید گرمی پڑی جس کی وجہ سے اکثر آم خراب ہو گئے۔

میں خاموش رہا۔ اس وقت مجلس میں ایک "باغبان" بھی موجود تھے۔ انھوں نے آم کو دیکھتے ہوئے کہا کہ بھائی صاحب، یہ آم گرمی کی وجہ سے خراب نہیں ہوئے ہیں بلکہ آپ کی ایک غلطی کی وجہ سے خراب ہوئے ہیں۔

پھر باغبان نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اپنے یہاں کی مارکٹ سے جب آم لیے تو کیا وہ پکے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ باغبان نے کہا کہ خراب ہونے کی وجہ یہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ پکے ہوئے آم مقامی استعمال کے لیے ہوتے ہیں۔ جب آم کو دور لے جانا ہو تو اس وقت کچے آم خریدے جاتے ہیں۔ اگر آپ نے کچے آم لیے ہوتے تو ایک آم بھی خراب نہ ہوتا۔ سب کے سب اچھی حالت میں یہاں تک پہنچ جاتے۔

اس واقعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معاملات میں مستقبل بینی کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ جب بھی آپ ایک ایسا منصوبہ بنائیں جس کی تکمیل آئندہ ہونے والی ہو تو ایسی صورت میں صرف حال کا علم کافی نہیں۔ ایسی صورت میں ضروری ہے کہ آپ مستقبل کو جانیں، آج کے دائرے سے اوپر اٹھ کر کل پیش آنے والے واقعات سے واقفیت حاصل کریں۔

منصوبہ حال میں بنایا جاتا ہے مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ مستقبل میں نکلتا ہے۔ منصوبہ بندی حقیقتاً نام ہی مستقبل کی منصوبہ بندی کا ہے۔ اس قسم کا کامیاب منصوبہ بنانے کے لیے ضروری ہے کہ وقتی جوش کے بجائے سوچ سے کام لیا جائے، جذباتیت کے بجائے حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ حال کے مسائل کو اہمیت دینے سے زیادہ مستقبل میں پیش آنے والے حالات کا لحاظ کیا جائے۔

پر عافیت زندگی

ایک عالم کے حلقہ میں ایک شخص تھا جو ان سے بہت زیادہ قریب تھا۔ وہ اس کو دوسروں سے زیادہ مانتے تھے، اور دوسروں سے زیادہ ان پر بھروسہ کرتے تھے۔ عالم نے اس شخص کو ایک کاروبار پر لگا دیا۔ اس میں اسے کامیابی ہوئی اور وہ پیسہ والا آدمی بن گیا۔

اس کے بعد ایک روز وہ مذکورہ عالم کی صحبت میں تھا۔ کسی بات پر عالم نے اس کو سختی سے منع کیا۔ وہ شخص بگڑ گیا۔ اس نے سخت انداز میں جواب دیا اور اٹھ کر عالم کے پاس سے چلا گیا۔ چند دن کے بعد اس کا غصہ ٹھنڈا ہوا تو وہ دوبارہ آیا اور عالم سے معذرت کرنے لگا۔ عالم نے جواب دیا کہ تم کو معذرت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں پہلے ہی اس معاملہ کو اس طرح ختم کر چکا ہوں کہ اب تک میں تم کو اپنے معیار سے دیکھتا تھا، اب میں تم کو تمہارے معیار سے دیکھوں گا۔

اس دنیا میں عافیت کی زندگی گزارنے کا یہی واحد کامیاب اصول ہے۔ ایک لفظ میں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ــــــ لوگوں سے خود ان کے لحاظ سے معاملہ کرو نہ کہ اپنے لحاظ سے۔

ایک آدمی زیادہ امید پر پورا نہیں اترتا تو اس سے اپنی امید کو کم کر لیجئے۔ ایک آدمی آپ کی پابندی کو قبول نہیں کرتا تو اس سے پابندی کا مطالبہ کرنا چھوڑ دیجئے۔ ایک شخص آپ کا خاص آدمی بننے کے لئے تیار نہیں ہے تو اس کو عام آدمیوں میں شمار کرنا شروع کر دیجئے۔ ایک آدمی پر آپ کا قابو نہیں چلتا تو اس سے موافقت کی روش اختیار کر لیجئے۔ ایک آدمی آپ کو دینے کے لئے تیار نہیں ہے تو اس سے اپنی توقعات کو ختم کر دیجئے۔ ایک آدمی اس خانہ کا اہل نظر نہیں آیا جہاں آپ نے اس کو رکھا تھا تو آپ سادہ طور پر صرف یہ کیجئے کہ ایک خانہ سے نکال کر اس کو دوسرے خانہ میں ڈال دیجئے۔

زندگی خارجی حقیقتوں سے موافقت کرنے کا نام ہے۔ سورج اور ہوا اور بارش اور پہاڑ اور سمندر سے موافقت کر کے ہی ہم اس دنیا میں زندگی گزارتے ہیں۔ یہی اصول انسانوں کے بارہ میں بھی ہے۔ آپ انسانوں سے موافقت کے اصول پر معاملہ کیجئے، اور دنیا آپ کے کے لئے خوشی اور عافیت کا گہوارہ بن جائے گی۔

فرضی اندیشے

۲۱ جولائی ۱۹۹۶ کو بنگلور (سبرامنیم پورہ) میں ایک عبرت انگیز واقعہ ہوا۔ ایک لڑکا جی ہریش بابو دیویکا نند ہائر پرائمری اسکول میں فورتھ اسٹینڈرڈ (چوتھے درجہ) کا طالب علم تھا۔ اس نے اپنے گھر کے ایک کمرہ میں اپنے کو بند کرکے اپنے اوپر مٹی کا تیل (کروسین) انڈیل لیا اور اپنے کپڑوں کو آگ لگالی۔ اس طرح وہ جل کر مرگیا۔ اخباری رپورٹر کے الفاظ میں، اس کا سبب، امتحان میں ناکام ہوجانے کا اندیشہ تھا :

Fear of failure in examinations.

لڑکے کے باپ جی گوپی ناتھ نے بتایا کہ ہریش حسب معمول اپنے اسکول سے واپس آیا۔ اس نے اپنی ماں لیلا سے کہا کہ اس کی ٹیچر اس سے ملنا چاہتی ہے۔ اس کے مطابق لیلا اسکول چلی گئی۔ اس کے بعد ہریش نے کچن میں داخل ہوکر دروازہ بند کرلیا اور اپنے آپ کو آگ لگالی۔ آواز سن کر پڑوسی دوڑ پڑے۔ مگر جب کچن کا دروازہ توڑ کر لڑکے کو نکالا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ جل کر مرچکا ہے۔

لڑکے کی ماں لیلا جب اسکول پہنچی تو وہاں اس کو نتیجہ کا پرچہ (marks card) دیا گیا۔ وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ کیوں کہ اس کے لڑکے نے ۶۰۰ میں ۴۷۹ نمبر حاصل کیے تھے۔ مگر جب وہ گھر پہنچی تو اس کی خوشیاں غم میں تبدیل ہوگئیں۔ کیوں کہ اس نے دیکھا کہ اس کا لڑکا خودکشی کرکے اپنی جان دے چکا ہے (ٹائمس آف انڈیا ۲۲ جولائی ۱۹۹۶)

ہریش بابو اگر چند گھنٹے اور انتظار کرلیتا تو اس کو معلوم ہوجاتا کہ اس کا اندیشہ بالکل بے بنیاد تھا۔ امتحان میں وہ اچھے نمبر لاکر پاس ہوچکا تھا، مگر وہ فرضی اندیشے میں مبتلا رہا۔ یہاں تک کہ اس نے خوف کے تحت اپنی جان دے دی۔

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ حالات کا غلط اندازہ کرکے آدمی اندیشوں میں مبتلا ہوجاتا ہے۔ حالاں کہ مستقبل بتاتا ہے کہ وہ اندیشے سرے سے پیش آنے والے ہی نہ تھے۔

جو چیز آج نہ مل رہی ہو اس کو انتظار کے خانہ میں ڈال دیجئے۔ بجائے اس کے کہ اس کو نہ ملنے والی چیز سمجھ کر آپ مایوسی اور بے ہمتی کا شکار ہوجائیں۔

دوسرا چانس

دہلی میں ایک ڈگری کالج ہے جس کو ایک ہندو سنستھا چلاتی ہے۔ اس میں لکچرر شپ کی ایک جگہ نکلی۔ جن لوگوں نے درخواست دی ان میں سے ایک مسلمان بھی تھے۔ انٹرویو ہوا تو ایک ہندو امیدوار کو چن لیا گیا۔ مسلم امیدوار ناکام کر دیے گئے۔

مذکورہ مسلمان سے میری ملاقات ہوئی تو وہ بہت جھنجلائے ہوئے تھے۔ انھوں نے اس کو تعصب کا معاملہ سمجھا۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اس کے خلاف اخبار میں لکھیں اور مذکورہ کالج کے تعصب کو اکسپوز کریں۔ میں نے انھیں منع کیا۔ میں نے کہا کہ ابھی تو آپ نے صرف ایک چانس کو کھویا ہے۔ زندگی میں ہمیشہ ایک چانس کے بعد دوسرا چانس آتا ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ پہلے چانس کے کھوئے جانے پر بد دل نہ ہو بلکہ دوسرے چانس کا انتظار کرے۔

ایک سال کے بعد پھر اسی کالج میں ایک لکچرر کی جگہ نکلی۔ اس کا اعلان اخبار میں چھپا تو مذکورہ مسلمان نے دوبارہ اس کے لیے اپنی درخواست بھیج دی۔ اس بار ایسا ہوا کہ لکچرر شپ کی اس جگہ کے لیے مذکورہ مسلمان کے علاوہ دو ہندو امیدوار بھی تھے۔ دونوں کو دو طاقتور ہندوؤں کا سپورٹ حاصل تھا۔ یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ کالج کے ذمہ دار دونوں ہندوؤں کو نہیں لے سکتے تھے اور ان میں سے ایک کو لینے کا مطلب یہ تھا کہ دوسرے ہندو امیدوار کا سپورٹر ناراض ہو جائے۔ اس نزاکت کا حل انھوں نے یہ تلاش کیا کہ دونوں ہندوؤں کو چھوڑ کر مذکورہ مسلمان کو منتخب کر لیا۔ یہ مسلمان ابھی تک اسی کالج میں کام کر رہے ہیں اور اب انھوں نے دلّی میں اپنا ذاتی گھر بنا لیا ہے۔

یہی زندگی میں کامیابی کا راز ہے۔ اگر آپ سے پہلا چانس کھو جائے تو آپ ہرگز بد دل نہ ہوں۔ بلکہ سادہ طور پر صرف یہ کریں کہ دوسرے چانس کا انتظار کریں۔ اگر آپ ایسا کر سکیں تو یقینی طور پر دوسرا چانس آپ کے لیے آئے گا اور جو کامیابی آپ کو پہلی کوشش میں نہیں ملی تھی وہ بلاشبہہ دوسری کوشش میں آپ کو مل جائے گی۔

دنیا مواقع سے بھری ہوئی ہے۔ یہاں ہر ایک موقع کے بعد دوسرا موقع آتا ہے، ٹھیک اسی طرح جیسے تاریک شام کے بعد روشن صبح۔

ماضی اور حال

ایک باپ کے پاس ایک زرخیز زمین تھی اس نے اس میں کچھ بیج بوئے اور اپنے بیٹوں سے کہا کہ میں تو شاید زندہ نہ رہوں لیکن بیس سال بعد تم یہاں پھل دار درختوں کا ایک باغ دیکھو گے اور اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔ ۲۰ سال گزرنے کے بعد بیٹوں نے اس زمین کو دیکھا، وہاں صرف چٹیل میدان تھا وہاں نہ کوئی درخت تھا اور نہ پھل۔

بیٹوں نے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ باپ نے نادانی کے تحت پتھروں کے ٹکڑوں کو بیج سمجھ لیا تھا۔ باپ نے زمین میں پانی دیا اور کچھ چیز بکھیری، مگر وہ بیج نہیں تھے، پتھر کے ٹکڑے تھے۔ ظاہر ہے کہ درخت کا باغ بیج سے نکلتا ہے نہ کہ پتھر کے ٹکڑوں سے۔

اگر کسی قوم کو آپ دیکھیں کہ اس کے رہنما ماضی میں سو سال تک بڑی بڑی تحریکیں اٹھاتے رہے۔ وہ قوم کے سامنے خوشنما الفاظ بولتے رہے اور اس کو بڑی بڑی امیدیں دلاتے رہے۔ مگر حال میں وہ قوم اس طرح داخل ہوتی ہے کہ اس کی حیثیت صرف ایک تباہ حال گروہ کی ہے۔ اس کا کوئی بھی معاملہ درست نہیں۔ کسی بھی پہلو سے اس کے قدموں کے نیچے وہ مستحکم زمین نہیں۔ جس پر قومیں کھڑی ہوتی ہیں۔

ایسی حالت میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ماضی کے رہنماؤں نے درخت کے بیج نہیں بوئے تھے بلکہ بیج کے نام پر پتھر کے ٹکڑے بکھیرے تھے اور پتھر کے ٹکڑے کبھی کسی قوم کے لیے لہلہاتے ہوئے باغ نہیں بنتے۔

حال ہمیشہ ماضی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جیسا ماضی ویسا حال۔ کوئی فرد یا کوئی گروہ اگر ایسے حال کا وارث بنے، جس میں اس کے لیے کچھ نہ ہو تو ایسے فرد یا گروہ کو اغیار کے ظلم اور سازش کی شکایت نہیں کرنا چاہیے بلکہ یہ اعتراف کرنا چاہیے کہ وہ ماضی میں کوئی حقیقی عمل نہ کر سکا۔ اس لیے حال میں کوئی حقیقی نتیجہ بھی اس کے حصہ میں نہیں آیا۔

ماضی کے لیے اپنی کوتاہی کا اعتراف حال میں عمل کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ ایسا آدمی از سرِ نو عمل کر کے حال میں وہ چیز پا لیتا ہے جس کو وہ ماضی میں نہ پا سکا تھا۔

ایک واقعہ

مسٹر عبد المجید خاں (ریٹائرڈ جوائنٹ ڈائرکٹر) آجکل فیض آباد میں رہتے ہیں۔ ۲۸ جون ۱۹۹۵ کی ملاقات میں انھوں نے اپنی سروس کے زمانہ کے کئی سبق آموز تجربات بتائے۔ ان میں سے ایک تجربہ یہاں درج کیا جاتا ہے۔

مسٹر اے ایم خان نے ۱۹۵۵ میں بنارس ہندو یونیورسٹی سے الکٹریکل انجینیرنگ میں بی ای کی ڈگری لی۔ ۱۹۶۳ میں چندولی (ضلع بنارس) کے پرائیویٹ پالی ٹکنیک میں ایک جگہ خالی ہوئی۔ یہ سینیر لکچرر کی جگہ تھی۔ اسی کے ساتھ کامیاب امیدوار کو الیکٹریکل انجینیرنگ ڈپارٹمنٹ کے ہیڈ کا عہدہ بھی سنبھالنا تھا۔

اس کا انٹرویو بنارس کے کمشنر جے بی ٹنڈن کی سرکاری رہائش گاہ پر تھا۔ کمشنر صاحب چندولی پالی ٹکنیک میں بحیثیت عہدہ اس کی مینجنگ کمیٹی کے صدر بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی انٹرویو میں شریک تھے۔ انٹرویو بورڈ کے ایک رکن پروفیسر رام سرن تھے۔ دوسرے رکن پروفیسر گیرولا تھے۔ پروفیسر گیرولا بنارس ہندو یونیورسٹی میں مسٹر خان کے استاد رہ چکے تھے۔

پروفیسر رام سرن نے مسٹر خان سے سوال کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا آپ جانتے ہیں کہ انسٹرومنٹ ٹرانسفارمر کیا ہوتا ہے:

Mr. Khan, do you know what is instrument transformer?

مسٹر خان نے ابھی سوال کا جواب نہیں دیا تھا کہ پروفیسر گیرولا نے کمشنر ٹنڈن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ وہ سب سے بہتر امیدوار ہیں۔ ان کے لئے انٹرویو دینے کا کوئی سوال نہیں:

He is the best candidate There is no question of interview.

اس کے بعد انھوں نے اے ایم خان سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مسٹر خان، آپ جا سکتے ہیں:

Mr. Khan, you can go.

پروفیسر سرن جنھوں نے سوال کیا تھا وہ خاموش رہے۔ مسٹر خان اپنے کاغذات لے کر کمرہ سے باہر آگئے۔ ایک ہفتہ کے بعد ان کو حسب قاعدہ اپائنٹمنٹ لیٹر مل گیا۔ وہ چندولی پالی ٹکنیک میں سینیر لکچرر

مع ہیڈ آف دی ڈپاٹمنٹ الکٹریکل انجنیئرنگ مقرر ہو گئے۔ اس کے بعد ان کی ترقی ہوتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ جوائنٹ ڈائرکٹر (ٹکنکل ایجوکیشن) کی حیثیت سے ریٹائر ہوئے۔

آجکل اکثر نوجوان یہ کہتے ہوئے ملیں گے کہ روزگار نہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ قابل روزگار افراد نہیں۔ مسٹر اے ایم خان کے ساتھ مذکورہ واقعہ اسی لئے پیش آیا کہ انھوں نے محنت کے ساتھ تعلیم حاصل کی۔ ہمیشہ اچھے نمبروں سے پاس ہوئے۔ تعلیم کے دوران ان کا کردار نہایت عمدہ رہا۔ پروفیسر گیرولا اور دوسرے متعلق لوگوں کے درمیان ان کی تصویر نہایت عمدہ بنی۔ اسی کی وہ قیمت تھی جو مذکورہ شاندار واقعہ کی صورت میں انھیں ملی۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر ادارہ اور ہر دفتر اچھے کارکنوں کو چاہتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر اس کا کام درست طور پر نہیں چل سکتا۔ کوئی بھی آدمی اپنا دشمن نہیں، اس لئے کوئی بھی آدمی اچھے کارکن کو نظر انداز کرنے والا نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اچھا اور قابل اعتماد کارکن دوسروں کی ضرورت ہے۔ آپ دوسروں کی ضرورت بن جائیے، اور پھر آپ کے لئے روزگار حاصل کرنا کچھ بھی مشکل نہ ہوگا۔

اس دنیا کا نظام دو طرفہ لین دین پر چل رہا ہے۔ یہاں شکایت اور احتجاج اور مطالبہ کی کوئی قیمت نہیں۔ اس دنیا کا سادہ اصول یہ ہے کہ ـــــ جتنا دینا اتنا پانا۔ اگر آپ روزگار حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو دوسروں کے لئے مفید بنائیے۔ اپنے اندر وہ مہارت پیدا کیجئے جس کی دوسروں کو ضرورت ہے۔ اور پھر آپ کو کسی سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

اس کے بعد آپ دیکھیں گے آپ کو روزگار تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس کے بعد روزگار خود آپ کو تلاش کرے گا۔ حتی کہ یہ حال ہو جائے گا کہ آپ آگے ہوں گے اور روزگار آپ کے پیچھے۔

جب بھی آپ دنیا میں کوئی جگہ چاہیں اور دنیا والے آپ کو وہ جگہ دینے پر تیار نہ ہوں تو دوسروں کی شکایت نہ کیجئے بلکہ، یہ یقین کر لیجئے کہ آپ کے اندر کوئی کمی ہے جس کی بنا پر آپ دوسروں کے لئے قابل قبول نہ ہو سکے۔ اور پھر اس کمی کو دور کرنے میں لگ جایئے۔ اس کے بعد آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔

امن کی ضرورت

۲۵ جون ۱۹۹۴ کو دہلی میں ایک عرب پروفیسر سے ملاقات ہوئی۔ گفتگو کے دوران کسی وجہ سے یہ ذکر آیا کہ اگست کے پہلے ہفتہ میں مجھے لندن جانا ہے۔ انھوں نے پوچھا کہ کس لئے۔ میں نے کہا کہ ایک بین اقوامی کانفرنس میں شرکت کے لئے۔ انھوں نے دوبارہ پوچھا کہ اس کانفرنس کا موضوع بحث کیا ہوگا۔ میں نے کہا کہ امن (سلام) انھوں نے فوراً کہا : السلام بَین مَن بین القوی و الضعیف أو بین الظالم و المظلوم (امن کن لوگوں کے درمیان۔ کیا طاقتور اور کمزور کے درمیان یا ظالم اور مظلوم کے درمیان)

میں نے کہا کہ اصل سوال یہ نہیں کہ امن کن لوگوں کے درمیان۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ امن کس مقصد کے لئے (لیست القضیة ، السلام بَین مَن ۔ و انما القضیه هی، السلام لِاَیّ غرض)

آجکل کے مسلم دانشوروں کے ذہن پر یہ چھایا ہوا ہے کہ موجودہ زمانہ میں مسلمان ہر جگہ زیردست ہیں اور غیرمسلم قومیں ہر جگہ ان پر غالب ہیں۔ ایسی حالت میں جو امن ہوگا وہ دو نامساوی فریقوں کے درمیان ہوگا۔ یہ گویا فریق ثانی کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حیثیت کو تسلیم کرلینا ہے۔ پھر ایسا کھلا ہوا گھاٹے کا معاملہ ہم کیونکر کرسکتے ہیں۔

مگر یہ سوچ کا غلط رخ ہے۔ صحیح رخ یہ ہے کہ ہم سوچیں کہ آج ہم کو وقفۂ امن کی ضرورت ہے۔ ہم سو برس سے بھی زیادہ عرصہ سے فریق ثانی سے ٹکراؤ کر رہے ہیں۔ ہمارا یہ ٹکراؤ، غیرمعمولی قربانیوں کے باوجود، صرف ہماری مزید تباہی کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس مقابلہ میں وہ ہتھیار غیر استعمال شدہ پڑا ہوا ہے جو ہمارا سب سے زیادہ طاقت ور ہتھیار تھا۔ یعنی اسلام کی برتر آئیڈیالوجی۔ مگر اس ہتھیار کے استعمال کے لئے معتدل فضا درکار ہے، اور معتدل فضا صرف امن کے حالات میں قائم ہوتی ہے۔ داعی قوم اور مدعو قوم کے درمیان معتدل حالات قائم کرنا اسلام کے دعوتی عمل کو زندہ ہونے کا موقع دینا ہے، اور جب اسلام کا دعوتی عمل موافق فضا میں جاری ہوجائے تو کوئی چیز نہیں جو اسلام کو غلبہ کی منزل تک پہنچنے سے روک سکے۔

خدمت میں عزت

پٹنہ کے جناب محمد منہاج اختر، ایم اے (پیدائش ۱۹۷۹) سے یکم جنوری ۱۹۹۷ کو ملاقات ہوئی۔ وہ ایک تاجر ہیں اور پٹنہ میں رہتے ہیں (Tel. 654462)

انھوں نے بہار کا ایک واقعہ بتایا۔ ایک باپ کے دو لڑکے تھے۔ ایک لڑکے نے تعلیم کی طرف رخ کیا۔ محنت کرتے کرتے وہ ڈاکٹر بن گیا۔ اس کے بعد اس نے پریکٹس کرلی اور الگ گھر لے کر اپنے بیوی بچوں کے ساتھ رہنے لگا۔ دوسرا لڑکا تعلیم حاصل نہ کرسکا۔ وہ جاہل رہ گیا۔ آخر کار لوگوں کے مشورہ سے اس نے بستی کے اندر حجامت کی دکان کرلی۔

ڈاکٹر بیٹے کو آبادی کے اندر معزز حیثیت حاصل ہوگئی۔ اس کے مقابلہ میں حجام بیٹا لوگوں کے درمیان ایک غیر معزز فرد بن کر رہ گیا۔ کچھ لوگوں نے ان کے والد سے کہا کہ حجام بیٹا آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ اس بنا پر آپ کو اکثر لوگ فلاں حجام کا والد کہنے لگے ہیں۔ آپ اپنے اس بیٹے کو گھر سے نکال دیجئے۔ اس کے بعد لوگ خود ہی آپ کو "ڈاکٹر صاحب کے والد" کہنا شروع کر دیں گے۔ اور پھر آپ کو سماج کے اندر باعزت جگہ حاصل ہو جائے گی۔ مذکورہ شخص نے جواب دیا۔ میں خود اس کو پسند نہیں کرتا کہ مجھ کو حجام کا والد کہا جائے اور یقیناً اب تک میں اس کو گھر سے نکال چکا ہوتا۔ مگر مجبوری یہ ہے کہ گھر کا خرچ وہی چلاتا ہے۔ اگر میں اس کو گھر سے نکال دوں تو گھر کا کام چلنا ہی مشکل ہو جائے گا۔

یہ خدمت کا کرشمہ ہے۔ خدمت (service) اپنے اندر معجزاتی تاثیر رکھتی ہے۔ آپ خواہ کچھ بھی ہوں، اگر آپ لوگوں کی خدمت کرنے لگیں، لوگوں کی حاجتوں میں ان کے کام آئیں، ماحول کے اندر آپ کی تصویر یہ بن جائے کہ آپ سے لوگوں کی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں تو آپ کسی مزید کوشش کے بغیر خود لوگوں کے درمیان عزت اور برتری کا مقام حاصل کرلیں گے۔

خدمت کرنا لوگوں کا دل جیتنا ہے۔ اور جو آدمی لوگوں کا دل جیت لے وہ سب کچھ پالیتا ہے، اس کے بعد کوئی اور چیز پانے کے لیے باقی نہیں رہتی۔

فتح کا راز

جناب جمیل احمد صاحب (مدراس) نے بتایا کہ وانمباڑی کے ایک مسلمان تاجر حاجی محمد ابراہیم صاحب نے ۱۹۱۰ میں یہاں ایک اسکول قائم کیا جو اب ترقی پاکر کالج بن چکا ہے اور کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ حاجی محمد ابراہیم صاحب نے اپنے آپ کو اس اسکول کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ اس وقت مالیات کی سخت کمی تھی چنانچہ وہ روزانہ اپنے گھر سے اس طرح نکلتے کہ ان کے ہاتھ میں ایک کشکول ہوتا تھا وہ لوگوں سے مل مل کر اسکول کے لیے چندہ مانگتے۔ کوئی تھوڑا دیتا اور کوئی زیادہ۔ وہ سارا پیسہ اس کشکول سے ڈالتے رہتے اور شام کو واپس آکر اس کو اسکول کے حساب میں جمع کر دیتے۔

ایک دن وہ وانمباڑی کے ایک دولت مند تاجر کے پاس پہنچے۔ حسب معمول ان کا کشکول ان کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے مذکورہ مسلمان تاجر سے اسکول کے لیے چندہ مانگا۔ تاجر نے چندہ نہیں دیا۔ اس کے بجائے وہ محمد ابراہیم صاحب کو سخت سست کہتے رہے کہ تم اپنا کاروبار خراب کر کے اسکول کے پیچھے دوڑ رہے ہو۔ محمد ابراہیم صاحب مذکورہ تاجر کی بات کو نہایت خاموشی کے ساتھ سنتے رہے۔ انھوں نے ان کی باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ آخر میں محمد ابراہیم صاحب نے ان سے کہا: ہر آدمی جو کچھ دیتا ہے اُس کو میں اِس کشکول میں ڈال لیتا ہوں۔ آپ نے جو کچھ دیا اس کو بھی میں نے کشکول میں ڈال دیا۔ یہ کہہ کر انھوں نے مذکورہ تاجر کو سلام کیا اور اطمینان کے ساتھ واپس آگئے۔

یہ سادہ سا جملہ مذکورہ تاجر کے لیے اتنا سخت ثابت ہوا کہ وہ رات بھر سو نہیں سکے۔ اگلے دن اور رات بھی ان کی بے چینی بدستور جاری رہی، یہاں تک کہ تیسرے دن انھوں نے حاجی محمد ابراہیم صاحب کو بلایا۔ ان سے اپنے رویہ کی معافی مانگی۔ اس کے بعد انھوں نے گھر کے اندر سے اشرفیاں منگائیں اور ان کا کشکول اشرفیوں سے بھر دیا۔ محمد ابراہیم صاحب اگر مذکورہ تاجر کی بات پر مشتعل ہو جاتے تو بے فائدہ ٹکراؤ کے سوا اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلتا مگر جب انھوں نے منفی رویہ کا جواب مثبت رویہ سے دیا تو صرف الفاظ ہی ان کی جیت کے لیے کافی ہو گئے۔

قناعت کیجیے

بنگلہ دیش کے سابق فوجی صدر جنرل محمد ارشاد ایک فوجی بغاوت کے ذریعہ اقتدار میں آئے۔ اس کے بعد دوسری فوجی بغاوت ہوئی۔ جس کے تحت قائم شدہ حکومت نے ان پر بدعنوانی کے کئی مقدمات چلائے۔ پہلے غیر قانونی اسلحہ رکھنے کے الزام میں تیرہ برس قید کی سزا ہوئی تھی، مالی بدعنوانی کے تحت انھیں مزید سات سال کی سزا کا حکم سنایا گیا۔

لاہور کے روزنامہ نوائے وقت (۸ جون ۱۹۹۳) میں اس سلسلے میں جو خبر چھپی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے: جنرل محمد ارشاد اور ان کی اہلیہ روشن کو ڈھاکہ کی خصوصی عدالت نے زمینوں کے لین دین کے سلسلہ میں بدعنوانیوں کا مرتکب قرار دے کر ۷، ۷ برس کی قید کی سزا سنائی۔ جنرل ارشاد نے کئی افراد کو ڈھاکہ کے قیمتی علاقہ میں زمینیں دلوائیں اور پھر ان کا کچھ حصہ ان افراد سے سستے داموں میں خرید کر اس زمین پر "جنتا ٹاور" کے نام سے ایک عمارت تعمیر کروائی اور اس پر خرچ ہونے والی رقم کا بڑا حصہ انھوں نے خود اپنی جانب سے ادا کیا۔ چوں کہ یہ رقم ان کی آمدنی سے زیادہ تھی، عدالت نے مذکورہ تمام آراضی اور جنرل ارشاد کی عمارت کو بحق سرکار ضبط کا حکم دے دیا ہے اب وہ اور ان کی بیوی دونوں جیل میں ہیں۔

اس طرح کے واقعات بتاتے ہیں کہ انسان کی زندگی میں اس چیز کو کتنی زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ جس کو دینی اصطلاح میں قناعت کہا جاتا ہے۔ جنرل ارشاد کا یہ افسوس ناک انجام اس لیے ہوا کہ وہ قناعت نہ کر سکے۔ انھوں نے جنرل کے عہدہ پر قناعت نہ کر کے صدر کے عہدے پر پہنچنا چاہا۔ انھوں نے چھوٹی زمین پر قناعت نہ کر کے بڑی زمین حاصل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے ایک منزلہ مکان پر قناعت نہ کر کے تیرہ منزلہ مکان کا مالک بننا چاہا۔

انھیں جو کچھ فطری طور پر ملا تھا، اگر وہ اسی پر قناعت کرتے تو وہ اطمینان کے ساتھ ایک پُرمسرت زندگی گزار سکتے تھے، مگر وہ ملے ہوئے پر قناعت نہ کر کے نہ ملے ہوئے پر دوڑے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزید کی حرص میں وہ ملے ہوئے سے بھی محروم ہو کر رہ گئے۔

زندگی کے مسائل کا حل قناعت ہے نہ کہ حرص۔

اعراض کا فائدہ

پونہ کے ایک سفر میں وہاں کے لوگوں نے بتایا کہ ۲۲ ستمبر ۱۹۹۱ کو پونہ میں گنیش چترتھی کا جلوس نکلنے والا تھا۔ اسی دن ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ بھی تھی، اور اس کی نسبت سے مسلمان اپنا میلاد النبیؐ کا جلوس نکالنا چاہتے تھے۔ اگر دونوں جلوس ایک ہی دن نکلتا تو یقینی تھا کہ دونوں میں ٹکراؤ ہو اور فرقہ وارانہ فساد کی صورت پیدا ہو جائے۔ اور پھر جشن کا دن شہر کے لیے غم کا دن بن جائے۔

پونہ کی سیرت کمیٹی کی دانش مندی سے یہ خطرہ ٹل گیا۔ انھوں نے ایک اجتماع کر کے مشورہ کیا کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ اتفاق رائے سے فیصلہ ہوا کہ ہم لوگ اس معاملہ میں اعراض کا طریقہ اختیار کریں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی تاریخ بدل دی۔ انھوں نے میلاد النبی کا جلوس چند دن کی تاخیر کے ساتھ ۲۷ ستمبر کو نکالا۔ اس طرح ہندو جلوس اور مسلمان جلوس دونوں پر امن طور پر دو الگ الگ تاریخوں میں نکلے اور کسی ٹکراؤ کی نوبت نہیں آئی۔

اس واقعہ پر شہر کے تمام لوگ بہت خوش ہوئے۔ اور مسلمانوں کی دانش مندی کو سراہا۔ خاص طور پر پولیس کے لوگوں نے بہت زیادہ خوشی کا اظہار کیا۔ اور مسلمانوں کے اس عمل کی تعریف کی۔ انھوں نے مسلمانوں سے مل کر ان کا شکریہ ادا کیا۔ فساد نہ ہونا پولیس کے لیے ایک ذاتی کارنامہ کی حیثیت رکھتا ہے، اور یقینی طور پر پولیس کے لوگ چاہتے ہیں کہ یہ کارنامہ ان کی فہرست اعمال میں لکھا جائے۔

پونہ کی سیرت کمیٹی نے جب تاریخ کی تبدیلی کا فیصلہ کیا تو اسی وقت انھوں نے اس کی خبر مراٹھی اخباروں میں شائع کرا دی۔ اس طرح پورے مہاراشٹر کے مسلمانوں کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ چنانچہ دوسرے جن مقامات پر دونوں جلوس ایک ہی دن نکلنے والے تھے، وہاں بھی اسی طرح مسلمانوں نے اپنے جلوس کی تاریخ کو بدل دیا۔ اس کے نتیجہ میں پورا مہاراشٹر فساد کے نقصان سے بچ گیا۔

فرقہ وارانہ فساد سے بچنے کی سب سے زیادہ کارگر تدبیر یہی اعراض کا طریقہ ہے۔ جہاں بھی لوگوں نے اس تدبیر کو استعمال کیا ہے وہاں فساد نہیں ہوا۔ فساد کے بم کو ناکارہ کرنے کی یہی واحد تدبیر ہے۔ فساد ہمیشہ غصہ کے تحت ہوتا ہے نہ کہ سازش کے تحت۔

خودکشی کی چھلانگ

دہلی کے روزنامہ ہندستان ٹائمس (۱۷ نومبر ۱۹۹۵) کے پہلے صفحہ پر ایک باتصویر کہانی چھپی ہے۔ یہ ایک مُردہ کی کہانی ہے جو زندہ لوگوں کو دردناک سبق دے رہی ہے۔

دہلی کے مسٹر ایم این اورا کی ۲۰ سالہ بھتیجی سار یکا ہورا (Sarika Hora) پونہ میں انجینئرنگ کے تیسرے سال کی اسٹوڈنٹ تھی۔ اکتوبر ۱۹۹۵ میں وہ اپنی فیملی کے ساتھ دیوالی منانے کے لیے دہلی آئی۔ ۲۷ اکتوبر کو نظام الدین ریلوے اسٹیشن سے وہ گوا اکسپرس پر سوار ہوئی تاکہ پونہ پہنچ کر وہ دوبارہ اپنے اکیڈمک سیشن میں شامل ہو سکے۔

ریلوے اسٹیشن پر اس کے گھر والوں نے اس کو رخصت کیا۔ وہ اپنے ایک ساتھی طالب علم کے ہمراہ نہایت خوش و خرم اپنی منزل کی طرف جا رہی تھی۔ اس ٹرین کے ہر دو ڈبہ کے درمیان اندرونی گزر گاہ بنی ہوئی تھی۔ ٹرین گوالیار اور جھانسی کے درمیان تھی کہ پرشوق لڑکی اٹھی تاکہ ایک کوچ سے دوسری کوچ میں جا سکے۔ وہ کوچ کی دہلیز (vestibule) میں پہنچی۔ یہاں قاعدہ کے مطابق، دونوں کوچ کے درمیان گزرنے کی پلیٹ (stepping plate) ہونی چاہیے تھی۔ مگر کسی وجہ سے وہ وہاں موجود نہ تھی۔ لڑکی نے اس کی پروا نہ کی۔ اس نے چاہا کہ قدم بڑھا کر وہ اِس کوچ سے اُس کوچ میں پہنچ جائے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئی۔ اس کا پاؤں اگلی کوچ تک پہنچنے کے بجائے درمیان کی خالی جگہ پر پڑ گیا۔ اچانک وہ تیز دوڑتی ہوئی ریل کے نیچے چلی گئی اور سکنڈوں میں اس کا جسم ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

یہ صرف ریل کے سفر کی بات نہیں۔ زندگی کے وسیع تر سفر میں بھی بار بار ایسے مواقع آتے ہیں جب کہ ہمیں ایک حالت سے دوسری حالت تک پہنچنے کے لیے کسی گزرنے والی پلیٹ (stepping plate) کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے موقع پر سب سے پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ ٹھہر کر دیکھا جائے کہ ہمارے لیے فی الواقع کوئی قابل اعتماد پلیٹ موجود ہے جس سے گزر کر ہم آگے کی طرف جا سکیں۔ ایسی قدم گاہ کی غیر موجودگی میں گزرنے کی کوشش کرنا خودکشی کی چھلانگ لگانا ہے نہ کہ ترقی اور کامیابی کی طرف اپنا سفر طے کرنا۔

کیا کوئی سبق لینے والا ہے جو اس واقعہ سے سبق لے۔

ایک دن

دہلی میں مہرولی کے علاقہ میں ایک اسلامی ادارہ مدرسہ اسلامیہ عربیہ فیض القرآن کے نام سے ہے۔ اس کو مولانا محمد طلحہ صاحب اور مولانا بشیر احمد راشد الامینی نے ۱۹۹۲ میں قائم کیا تھا۔ ۲۴ جولائی ۱۹۹۴ کو اس کا پہلا دینی تعلیمی جلسہ ہوا۔ اس کے مہمان خصوصی مولانا محمد صدیق باندوی تھے۔ اس کی دعوت پر راقم الحروف نے بھی اس میں شرکت کی۔

نظام الدین سے روانہ ہو کر ہم دہلی کے مختلف حصوں سے گزرے۔ جب ہم مہرولی میں داخل ہوئے تو قطب مینار پر نظر پڑی جو اس علاقہ کی سب سے بلند عمارت کے طور پر دور دور سے دکھائی دیتا ہے۔ قطب مینار تیرھویں صدی عیسوی میں قطب الدین ایبک نے بنوایا تھا۔ اس کی بابت تاریخ میں یہ الفاظ درج ہیں کہ دہلی کا قطب مینار ابھی تک قطب الدین ایبک کی فتوحات کی یاد دلاتا ہے:

The Qutub Minar in Delhi still stands to commemorate his victories. (VIII/362)

مگر اس کو دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ یہ مینار اپنی بلندیوں کے ساتھ اس سے بھی زیادہ بڑی ایک حقیقت کی یادگار ہے۔ اور وہ یہ کہ کامیابی عمل سے ملتی ہے نہ کہ پیدائش سے۔

قطب الدین ایبک ابتداءً ایک غلام کی حیثیت سے محمد غوری کی ملازمت میں آیا۔ اس کے بعد اپنی ممتاز کارکردگی کی بنا پر اس نے ترقی شروع کی۔ یہاں تک کہ سلطان محمد غوری کے قتل (۱۲۰۶ء) کے بعد وہ اس کا جانشیں بنا۔ اور پھر اپنی حکیمانہ تدبیروں سے وہ دہلی کی سلطنت کا مالک بن گیا۔ اگرچہ وہ زیادہ دنوں تک حکومت نہ کر سکا۔ گھوڑوں کے ایک کھیل میں وہ شدید طور پر زخمی ہو گیا۔ اسی میں ۱۲۱۰ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔

اس دنیا میں کامیابی کے امکانات بے شمار ہیں۔ یہاں ایک معمولی انسان بھی بادشاہ کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد صلاحیتوں کو حکیمانہ طور پر استعمال کرے۔

کمال پیدا کیجئے

۲۵ مارچ ۱۹۹۲ کو ملبورن میں ورلڈ کرکٹ کپ کا فائنل مقابلہ تھا۔ پاکستان کی ٹیم نے انگلینڈ کی ٹیم کو ہرا کر ورلڈ کپ جیت لیا۔ پاکستان کی ٹیم کو یہ غیر معمولی کامیابی اس کی ٹیم کے کیپٹن عمران خاں کی قیادت کے تحت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد نہ صرف پاکستان بلکہ ساری دنیا سے عمران خاں کے لئے مبارک باد کے پیغامات کا سیلاب امنڈ پڑا۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۶ مارچ) نے اس خبر کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی:

Pakistan rule the world with a flawless display.

اس سلسلہ میں ہندستان کے مشہور کھلاڑی مسٹر منوج پربھاکر کا انٹرویو اخباروں میں شائع ہوا ہے۔ اس کو ویڈیو میگزین اسپورٹس چینل (Sports Channel) نے ریکارڈ کیا تھا۔ مسٹر پربھاکر نے کہا:

India needed an Imran Khan-like captain to motivate the team. I think there should be some gap like age between the team and captain. You can see the way Imran is doing his job. He is marvellous. We need that type of captain who can be a good leader. That is what we need. Otherwise we have the best team.

انڈیا کو عمران خاں جیسے ایک کیپٹن کی ضرورت ہے جو ہماری ٹیم کو متحرک کرے۔ میرا خیال ہے کہ ٹیم اور کیپٹن میں عمر کی طرح کچھ فرق ہونا چاہئے۔ آپ دیکھ سکتے ہیں کہ عمران کس طرح اپنا کام کر رہے ہیں۔ وہ ایک حیرت انگیز شخص ہیں۔ ہم کو اسی قسم کے کیپٹن کی ضرورت ہے جو ایک اچھا قائد بن سکے۔ یہ ہے وہ چیز جس کی ہمیں ضرورت ہے۔ ورنہ ہمارے پاس بہترین ٹیم ہے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ہندستان ٹائمس ۲۶ مارچ ۱۹۹۲)

انسان کمال کو پسند کرتا ہے۔ کوئی شخص کمال کا مظاہرہ کرے تو دیکھنے والا اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ کمال موافقت اور مخالفت سے بلند ہو کر اپنے آپ کو منوا لیتا ہے۔ کسی بھی میدان میں اگر آپ کمال پیدا کرلیں تو انسان آپ کی قدردانی اور اعتراف پر مجبور ہو جائے گا، خواہ بظاہر آپ غیر قوم کے فرد کیوں نہ ہوں۔

خدا کا قانون

یہ ایک دکان دار کا قصہ ہے۔ اس کے یہاں گھی کا کاروبار تھا۔ پہلے وہ ایک معمولی خوردہ فروش تھا۔ دھیرے دھیرے اس کا کاروبار بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ گھی کا ہول سیل بیوپاری بن گیا۔ اس کے یہاں ایک منیم جی (اکاؤنٹنٹ) تھے جو شروع سے ان کے یہاں کام کر رہے تھے۔

منیم جی کا دوپہر کا کھانا روزانہ ان کے گھر سے آیا کرتا تھا۔ ان کا لڑکا روزانہ ٹفن کیریر میں کھانا لے کر آتا۔ یہ ٹفن کیریر غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ لوگ مذاق میں منیم جی سے کہا کرتے تھے کہ تم اکیلے کھانے والے ہو اور روزانہ دس آدمی کا کھانا گھر سے منگاتے ہو۔ یہ معمول برسوں تک جاری رہا۔ یہاں تک کہ ایک روز ایسا ہوا کہ ان کا لڑکا کھانے کے بعد ٹفن کیریر لے کر واپس جا رہا تھا کہ وہ دکان کی سیڑھی پر لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کے ساتھ ہی ٹفن کیریر بھی گر گیا۔ اور سارے ڈبے کھل گئے۔ معلوم ہوا کہ ان تمام ڈبوں میں گھی بھرا ہوا تھا۔

دکان دار نے یہ منظر دیکھ لیا۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ منیم جی اتنے بڑے ٹفن کیریر میں کھانا کیوں منگاتے تھے۔ اس کے بعد وہ منیم جی کو لے کر اندر گودام کے کمرے میں گیا۔ اس نے منیم جی سے کہا کہ تم دیکھ رہے ہو کہ کتنے زیادہ کنستر یہاں میرے گودام میں بھرے ہوئے ہیں۔ تمہارے ساتھ میرا تعلق شروع سے رہا ہے۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ ۱۵ سال پہلے جب میں نے یہ کاروبار شروع کیا تو میرے پاس پونجی کم تھی۔ میں گھی کا صرف ایک کنستر لا کر اس کو پھٹکر میں بیچتا تھا۔ پھر دھیرے دھیرے میرا کاروبار بڑھا۔ یہاں تک کہ آج میں شہر کا ایک بڑا ہول سیل ڈیلر ہوں۔ اب تم اپنی حالت کا اور میری حالت کا مقابلہ کرو۔ تم برسہابرس سے روزانہ اپنے ٹفن کیریر میں گھی بھر کر یہاں سے لے جا رہے ہو، مگر حال یہ ہے کہ تمہاری جو حالت پہلے تھی وہی حالت آج بھی ہے۔ اور اسی مدت میں مجھ کو خدا نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اب تم خود اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہو کہ لٹنے والا فائدہ میں ہے یا لوٹنے والا۔

دنیا کو بنانے والے نے اس دنیا کو جس ڈھنگ سے بنایا ہے وہ یہ ہے کہ یہاں صرف جائز کمائی کرنے والا ترقی کرے۔ ناجائز کمائی کرنے والا یہاں تباہ و برباد ہو کر رہ جائے۔

مسائل پر صبر

ایک بستی تھی۔ وہاں کے لوگ بہت تیز زبان تھے۔ وہاں دو آدمیوں نے دکان کھولی۔ ایک نوجوان تھا اور دوسرا بوڑھا۔ نوجوان کی دکان جلد ہی ختم ہوگئی۔ بوڑھے کی دکان چلتی رہی۔ آج وہ اس بستی میں سب سے بڑا دولت مند بنا ہوا ہے۔ اب ہر آدمی اس سے ادب کے ساتھ بات کرتا ہے۔

اس کی وجہ یہ تھی کہ نوجوان دکان دار نے جب دیکھا کہ جو گاہک آتا ہے وہ تیز زبان میں بات کرتا ہے تو اس نے لوگوں کی تیز کلامی کے خلاف جنگ شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف لوگوں کی تیز کلامی تیز دستی تک پہنچ گئی۔ لوگوں نے اس کو پکڑکر مارا، یہاں تک کہ وہ دکان بند کرکے وہاں سے بھاگ گیا۔

بوڑھے دکان دار کی کامیابی کا راز یہ تھا کہ اس نے لوگوں کی تیز زبان اور درشت کلام کو نظرانداز کیا۔ اس نے اپنی نظر صرف لوگوں کی "جیب" پر رکھی، اور لوگوں کی "زبان" سے اپنی نظر ہٹالی۔ اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ اس نے اپنی دکان داری میں شاندار کامیابی حاصل کی۔

یہ دنیا کی کامیابی کا واقعہ ہے۔ آخرت کی کامیابی کا اصول بھی یہی ہے۔ آخرت کی کامیابی کے لیے بھی اسی طرح لوگوں کی زیادتیوں پر صبر کرنا پڑتا ہے۔ جو شخص دنیا میں صبر کا طریقہ اختیار نہ کرے اس کے لیے آخرت کی "تجارت" کو کامیاب بنانا ممکن نہیں۔

آخرت کی کامیابی کے لیے اہلِ ایمان کو جو فرض سونپا گیا ہے، وہ دعوت الی اللہ ہے۔ اسی فرض کی انجام دہی پر ان کو وہ کامیابی ملنے والی ہے جس کو آخرت کی جنّت کہا گیا ہے۔ نیز جب اہل ایمان یہ خدائی ذمہ داری ادا کرتے ہیں تو ابتدائی انعام کے طور پر انھیں دنیا میں بھی سربلندی دیدی جاتی ہے۔ لیکن اگر وہ صبر پر قائم نہ ہوسکیں تو وہ دنیا میں بھی محروم رہتے ہیں اور آخرت میں بھی۔

موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا کیس، ایک لفظ میں، یہ ہے کہ جن باتوں پر انھیں صبر کرنا تھا ان پر وہ لڑرہے ہیں، اور اس کو غلط طور پر جہاد کہتے ہیں۔ اس دنیا میں لازماً ایسا ہوگا کہ مسلمانوں کو دوسروں کی طرف سے زیادتیوں کا تجربہ ہوگا۔ اہلِ ایمان کو لازماً ایسا کرنا ہے کہ وہ مسائل سے اپنی نظریں ہٹالیں اور اپنی ساری توجہ صرف فرض کی ادائگی پر لگادیں۔

صبر کا کرشمہ

۲۳ جولائی ۱۹۹۴ کو میں نے جمعہ کی نماز دہلی کی مسجد سنگ تراشان (پہاڑ گنج) میں پڑھی۔ اس مسجد کے چاروں طرف صد فی صد ہندوؤں کی آبادی ہے۔ ۱۹۴۷ کے بعد یہ مسجد بند ہوگئی تھی۔ یہاں محلہ کے لوگ کوڑا ڈالا کرتے تھے۔ ۱۹۸۲ میں دہلی کے ایک مسلمان جناب محمود سعید بلالی (پیدائش ۱۹۵۲) کو خیال ہوا کہ اس مسجد کو واگزار کیا جائے۔

انھوں نے کوشش کرکے اس مسجد کو کھلوایا۔ اس کی صفائی اور مرمت کرائی۔ اب سوال یہ تھا کہ اس کو آباد کس طرح کیا جائے، کیوں کہ یہاں قریب میں کوئی مسلمان نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایک استاد رکھ کر یہاں ایک مدرسہ قائم کردیا۔ دو درجن مسلمان بچے یہاں رہنے اور پڑھنے لگے۔ اس طرح یہاں پنج وقتہ نماز قائم ہوگئی۔

محمود سعید بلالی صاحب (Tel. 3260028) نے اپنے واقف کاروں کے حلقہ میں اس مسجد کے بارہ میں بتایا تو جمعہ کے دن کافی لوگ یہاں آنے لگے۔ یہاں تک کہ مسجد نمازیوں سے بھر جاتی تھی۔ بلالی صاحب نے طلبہ اور نمازیوں کی سہولت کے لیے یہ منصوبہ بنایا کہ صحن کے نصف حصہ میں چھت ڈال کر ایک سائبان بنا دیا جائے۔ انھوں نے کام شروع کرادیا۔ سانچہ بن گیا اور اس پر چھت کی تعمیر کی جانے لگی۔

یہ ۹ مارچ ۱۹۹۱ کا واقعہ ہے۔ اچانک تقریباً ڈیڑھ سو ہندو جمع ہوگئے جن میں زیادہ تر نوجوان تھے۔ انھوں نے کہا کہ ہم چھت بننے نہیں دیں گے۔ تم اس چھت کو اتارو، ورنہ یہاں خون ہو جائے گا اور تمہاری مسجد بھی باقی نہیں رہے گی۔ ایک طالب علم نے پولس اسٹیشن جاکر انھیں خبر کردی۔ اس کے بعد بڑی تعداد میں پولس آگئی۔ ان میں پولیس افسران بھی تھے۔ پولیس نے موقع کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ یہ تعمیر قانون کے دائرہ میں ہو رہی ہے، اس لیے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ پولیس نے مسلمانوں سے کہا کہ تم لوگ چھت بناؤ، ہم یہاں کھڑے ہوئے ہیں۔

محمود سعید بلالی نے سوچا کہ اگر میں پولیس کے کہنے سے چھت کا کام جاری رکھوں تو یہ پولیس والے یہاں کب تک میری حفاظت کریں گے، آخر کار تو سابقہ انھیں پڑوس کے ہندوؤں سے رہے گا۔

اور وہ چھت تو کیا، مسجد بھی توڑ کر رکھ دیں گے۔ اور کوئی انھیں روک نہ سکے گا۔ بلالی صاحب انھیں خیالات میں تھے کہ ہندو مجمع میں سے ایک بوڑھا آدمی آگے آیا۔ اس نے کہا کہ میاں جی، اس وقت یہ لوگ بہت جوش میں ہیں۔ وہ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ تم ضد نہ کرو اور اپنی چھت اتار دو۔

بلالی صاحب نے فوراً اس کو استعمال کیا۔ انھوں نے کہا کہ یہ بڑے میاں جس طرح تمہارے بڑے ہیں اسی طرح وہ میرے بھی بڑے ہیں۔ میں ان کی بات مانتا ہوں۔ اور اسی وقت اپنے مزدوروں سے کہہ دیا کہ چھت اتار دو چنانچہ چھت اتار دی گئی۔ اس وقت تک اس چھت پر ۲۵ ہزار روپے خرچ ہو چکے تھے۔

اس واقعہ کا علاقہ کے تمام ہندوؤں پر بہت اچھا اثر پڑا۔ سب کے سب مسجد اور مسجد والوں کے ہمدرد بن گئے۔ اب یہاں لاؤڈ اسپیکر کی اذان کے ساتھ پنج وقتہ نماز ہوتی ہے۔ باقاعدہ جمعہ ہوتا ہے۔ اسلامی تعلیم کا ایک مدرسہ چل رہا ہے۔ رمضان میں شاندار تراویح ہوتی ہے۔ وغیرہ۔ مگر ہندوؤں کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں، وہ لوگ اکثر کہتے رہتے ہیں کہ آپ کی کوئی ضرورت ہو تو ہم کو بتائیے۔ اگر کوئی ہندو آپ کو پریشان کرے تو فوراً ہم کو بتائیے۔ ہم اس سے نمٹ لیں گے۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب یہ خبر پھیلی کہ اجودھیا کی بابری مسجد توڑ دی گئی۔ ساری دہلی میں تناؤ کی صورت پیدا ہوگئی۔ کئی جگہ ہندو مسلم فسادات بھی ہوئے۔ اس علاقہ میں بھی تناؤ کی حالت تھی جبکہ اس وقت مسجد میں ۲۳ مسلم بچے موجود تھے۔

محمود سعید بلالی صاحب اس وقت جامع مسجد کے علاقہ میں تھے اور کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ مگر پڑوس کے ہندو ان کا بدل بن گئے۔ وہ خود مسجد میں آئے۔ بچوں کو لے جا کر ایک قریبی اسکول میں رکھا۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام کیا۔ اور پھر تمام بچوں کو حفاظت کے ساتھ ان کے گھروں تک پہنچایا۔

بلالی صاحب اگر ضد کرتے اور اکڑ دکھاتے تو دوسری طرف بھی ضد اور اکڑ پیدا ہوتی۔ اور پھر فساد برپا ہو جاتا۔ مگر جب انھوں نے نرمی اور تواضع کا انداز اختیار کیا تو دوسری جانب بھی نرمی اور تواضع پیدا ہوگئی۔ اس کے بعد فساد کا ماحول امن کے ماحول میں تبدیل ہو گیا۔

آگ ٹھنڈی ہوگئی

جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) کے کانفرنس ہال میں ۸ فروری ۱۹۹۲ کو ایک سیمینار تھا۔ یہ سیمینار ذاکر حسین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے تحت کیا گیا تھا۔ اس کا موضوع تھا : مذہب اور انسان دوستی۔ اس موقع پر جن لوگوں نے تقریریں کیں ان میں سے ایک ڈاکٹر بشمبھر ناتھ پانڈے بھی تھے۔ ڈاکٹر پانڈے نے اپنی تقریر میں کچھ واقعات سنائے۔ ان میں سے ایک واقعہ یہ تھا کہ بالاگھاٹ (مدھیہ پردیش) میں ۱۹۲۶ میں ہندوؤں کا ایک جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس کی قیادت سوامی ستیہ دیو کر رہے تھے۔ ان لوگوں کا منصوبہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو بھڑکا کر شہر میں فرقہ وارانہ فساد کریں۔ یہ جلوس قصداً جمعہ کے دن نکالا گیا۔ تقریباً دس ہزار ہندو باجا بجاتے ہوئے اور نعرہ لگاتے ہوئے عین جمعہ کی نماز کے وقت مسجد کے سامنے پہنچے۔ اور وہاں ٹھہر کر شور وغل کرنے لگے۔

کرامت حسین صاحب شہر کے ایک معروف سیاسی کارکن تھے۔ ان کو پہلے سے مذکورہ منصوبہ کا حال معلوم ہوگیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنے سو ساتھیوں کو لے کر پہلے سے اس مسجد میں آگئے تھے۔ انھوں نے پیشگی طور پر اپنے ہر ساتھی کو پھولوں کا ایک ایک ہار دے دیا تھا۔ جب جلوس مسجد کے سامنے آکر ٹھہر گیا تو انھوں نے عام مسلمانوں سے کہا کہ آپ لوگ بالکل خاموش رہیں۔ اس کے بعد کرامت حسین صاحب سوچے سمجھے نقشہ کے مطابق، اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسجد سے نکل کر سڑک پر آئے۔ ان لوگوں نے جلوس سے نہ روٹ بدلنے کی بات کی اور نہ نعرہ بند کرنے کا مطالبہ کیا۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ جلوس کے سامنے آگئے اور ایک ایک ہندو کو ہار پہنانا شروع کیا۔ اس کے بعد پوری فضا بدل گئی۔ جلوس کے لوگوں کے سر شرم سے جھک گئے۔ ان کے نعرے اپنے آپ بند ہوگئے۔ جو لوگ مرنے مارنے کے ارادہ سے آئے تھے، وہ مسلمانوں سے گلے ملنے لگے۔ دشمنی کا ماحول اچانک دوستی کے ماحول میں تبدیل ہوگیا۔

ہر انسان انسان ہے۔ کوئی انسان جب کسی دوسرے انسان کا دشمن بنتا ہے تو وہ محض وقتی اشتعال کے تحت ہوتا ہے۔ اگر حکمت کے ساتھ اس وقتی آگ کو ٹھنڈا کر دیا جائے تو اس کے بعد انسان اپنی اصل فطرت پر لوٹ آئے گا۔ اور پھر وہی انسان آپ کا دوست بن جائے گا جو وقتی طور پر بظاہر آپ کا دشمن دکھائی دینے لگا تھا۔

تین منٹ

سید امتیاز الدین دسنوی ایک انجنیئر ہیں۔ ۱۹۶۷ میں وہ سروس کے تحت ضلع پونہ کی ایک بستی لونولہ (Lonavla) میں تھے۔ ایک روز جب کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے، سڑک پر شور وغل کی آواز آئی۔ ہندوؤں کا ایک جلوس مسجد سے ملی ہوئی سڑک سے گزر رہا تھا۔ مسجد کے سامنے پہنچ کر وہ لوگ ٹھہر گئے اور زور زور سے باجا بجانے لگے۔

تراویح میں ہر دو رکعت پر سلام پھیرا جاتا ہے۔ چنانچہ امام صاحب نے جب دو رکعت پوری کر کے السلام علیکم ورحمۃ اللہ کہا تو اچانک نمازی غصہ ہو گئے۔ کچھ لوگ اٹھنے لگے کہ جا کر جلوس والوں سے کہیں کہ یہ مسجد ہے، یہاں شور نہ کرو، آگے جاؤ۔ سید امتیاز الدین صاحب نے کہا کہ چند منٹ بیٹھ کر آپ ذکر کر لیجئے، یہ لوگ اپنے آپ یہاں سے چلے جائیں گے۔ چنانچہ تمام نمازی خاموش ہو کر بیٹھ گئے۔

۲۰ مارچ ۱۹۹۴ کی ملاقات میں سید تمیز الدین صاحب نے بتایا کہ مشکل سے تین منٹ گزرے ہوں گے کہ آواز کم ہونے لگی اور تھوڑی دیر میں بالکل ختم ہو گئی۔ جلوس صرف تین منٹ مسجد کے سامنے ٹھہرا۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ ہی آگے چلا گیا۔

اس کے برعکس اگر کچھ مسلمان سڑک پر آکر روک ٹوک کرتے تو وہ لوگ ضد میں پڑ جاتے۔ اب دونوں طرف سے اصرار بڑھتا۔ یہاں تک کہ جلوس کا مسئلہ دونوں کے لئے وقار کا مسئلہ بن جاتا۔ اس کے بعد معاملہ اور آگے بڑھتا اور آخر کار وہ چیز ظہور میں آجاتی جس کو فرقہ وارانہ فساد کہا جاتا ہے۔ ایک طرف مسجد کی تراویح ادھوری رہ جاتی۔ دوسری طرف بستی آگ اور خون کے طوفان میں نہا اٹھتی۔

اسی قسم کا برعکس واقعہ ۱۹۸۰ میں مرادآباد میں پیش آچکا ہے۔ رمضان کے مہینہ میں غیر مسلموں کا جلوس مسجد کے سامنے آگیا اور باجا بجانے لگا۔ مسجد میں جو مسلمان نماز کے لئے جمع تھے وہ "تین منٹ" کے صبر پر راضی نہیں ہوئے۔ باہر نکل کر انھوں نے جلوس کو روکنا شروع کیا۔ اس کا انجام مرادآباد کو بھیانک فساد کی صورت میں برداشت کرنا پڑا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امن اور فساد کے درمیان صرف تین منٹ کا فاصلہ ہے۔ اگر آپ تین منٹ کے اشتعال کو برداشت کر لیں تو ہر طرف امن ہی امن ہوگا، اور اگر آپ تین منٹ کے اشتعال کو برداشت نہ کریں تو ہر طرف فساد ہی فساد۔

دو خبریں

آپ ۱۶ جون ۱۹۹۳ کا ہندستان ٹائمس یا ٹائمس آف انڈیا دیکھیں تو آپ کو دو بالکل مختلف قسم کی خبریں پڑھنے کو ملیں گی۔ ایک طرف دونوں میں یہ خبر ہے کہ دہلی کا ایک تاجر کرشن کمار (۵۴ سال) پنجاب نیشنل بنک (کیشو پورم) سے چار لاکھ پینتالیس ہزار روپیہ لے کر واپس آ رہا تھا کہ راستہ میں ۱۲ بجے دن کو چار نوجوان سفید ماروتی کار پر آئے۔ انھوں نے تاجر کے اسکوٹر کو روکا۔ ریوالور سے گولیاں چلا کر اسے گرا دیا اور اس کا بریف کیس لے کر فرار ہو گئے۔

دوسری طرف دونوں ہی اخباروں میں ایک اور خبر ہے۔ دہلی کا ایک ہیڈ کانسٹبل پریم پال (قرول باغ) رات کو گشت کر رہا تھا۔ اس کو سوریہ کرن ہوٹل کے پاس ایک بریف کیس پڑا ہوا ملا۔ اس نے کھولا تو اس کے اندر دوسرے کاغذات کے علاوہ ۹۷ ہزار ۴ سو روپیہ نقد رکھا ہوا تھا۔ اس نے فوراً بریف کیس کو بند کیا اور اس کو لا کر اسی طرح تھانہ میں جمع کر دیا۔ تھانہ کے ذمہ دار اب بریف کیس کے اصل مالک کو تلاش کر رہے ہیں۔

یہ ایک علامتی خبر ہے جو بتاتی ہے کہ سماج میں ہمیشہ دونوں قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اچھے بھی اور برے بھی۔ اس لیے کسی سماج کے بارہ میں رائے قائم کرتے ہوئے آدمی کو بہت زیادہ محتاط ہونا چاہیے۔ اس کو نہ ایک طرف پوری طرح جھک جانا چاہیے اور نہ دوسری طرف۔

مذکورہ خبروں میں اگر کوئی شخص ایسا کرے کہ وہ صرف کرشن کمار کے واقعہ کو لے لے اور اس کو عام بنا کر یہ کہے کہ ہندستان کے لوگ تو سب کے سب قاتل اور لٹیرے ہیں۔ تو اس کی یہ رائے درست نہ ہو گی۔ اسی طرح کوئی شخص پریم لال کے واقعہ کو لے اور اس کو عمومی صورت دے کر یہ کہنے لگے کہ ہندستان کے تمام آدمی انتہائی دیانت دار ہیں تو یہ بات بھی واقعہ کے مطابق نہ ہو گی۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ہر سماج میں دونوں ہی طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ہمیں اس دنیا میں اس طرح رہنا ہے جیسے کہ ہم ایک ایسے راستہ میں چل رہے ہوں جس میں کانٹے بھی ہوں اور اسی کے ساتھ پھول بھی۔ ایسے راستہ کے مسافر کے لیے کامیاب سفر کی تدبیر صرف ایک ہے۔ وہ کانٹوں سے اپنا دامن بچائے، اور پھولوں سے محظوظ ہوتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتا رہے۔

تعمیری طریقہ

سید منصور آغا دہلی میں رہتے ہیں (Tel. 6927118) ان کا وطن میرٹھ ہے (پیدائش ۱۹۴۵) یکم جولائی ۱۹۹۶ کی ملاقات میں انھوں نے اپنا ایک تجربہ بتایا جس میں ایک قیمتی سبق موجود ہے۔

۶۴-۱۹۶۳ میں وہ میرٹھ کالج کے طالب علم تھے۔ ان کے پولیٹکل سائنس کے استاد مسٹر کے سی گپتا تھے۔ ہندستان کی سیاسی تاریخ پر جب انھوں نے لکچر دینا شروع کیا تو یہ آغا صاحب کے لیے بہت پریشان کن ثابت ہوا۔ یہی حال ان کے ساتھی مستعین الرحمٰن صاحب کا تھا۔ مسٹر گپتا نے اپنے لکچر میں تقسیم اور سیاسی تاریخ کو اس طرح بتایا جس میں سارا الزام مسلمانوں پر آتا تھا۔ دونوں طالب علموں نے آپس میں مشورہ کیا کہ کیا کرنا چاہیے۔ آخر میں انھوں نے طے کیا کہ غصہ ہونے یا مشتعل ہونے سے کوئی فائدہ نہیں۔ ہم لوگوں کو اپنے آپ کو اس کے لیے تیار کرنا چاہیے کہ ہم مسٹر گپتا کی علمی کاٹ کر سکیں۔

طے شدہ پروگرام کے مطابق، اب دونوں اپنا خالی وقت لائبریری میں گزارنے لگے۔ وہ ہندستان کی سیاسی تاریخ اور تقسیم ہند کے تاریخی ریکارڈ کا مطالعہ کرتے۔ اس طرح وہ پوری ذہنی تیاری کے ساتھ کلاس میں جانے لگے۔ انھوں نے یہ کیا کہ جب گپتا صاحب تاریخ کی کوئی غلط تعبیر پیش کرتے تو آغا صاحب اور ان کے ساتھی فوراً انھیں ٹوکتے اور پورے حوالہ کے ساتھ کہتے کہ آپ ایسا کیوں کر کہتے ہیں۔ فلاں کتاب میں تو یہ بات اِس طرح لکھی ہوئی ہے۔ اور فلاں مورخ نے تو اس کو اِس طرح بیان کیا ہے۔

کچھ دن ایسا چلتا رہا۔ آخر کار ایک دن مسٹر گپتا نے دونوں طالب علموں کو اپنے کمرہ میں بلایا۔ انھوں نے کہا کہ میرے دل میں تم لوگوں کی بہت قدر ہے۔ تم لوگوں نے میری تصحیح کر دی اور مجھے روشنی دکھائی۔ اس کے بعد مسٹر گپتا کے لکچر کا انداز بالکل بدل گیا۔ وہ آخر وقت تک دونوں مسلم طالب علموں کے ساتھ نہایت عزت کا سلوک کرتے رہے۔

اس طرح کے کسی مسئلہ کے حل کا یہی تعمیری طریقہ ہے۔ اور مسائل ہمیشہ تعمیری طریقہ سے حل ہوتے ہیں نہ کہ تخریبی طریقہ سے۔

اعزاز یا ذمہ داری

وزیر اعظم نرسمہا راؤ نے حال میں مرکزی کیبنٹ میں اضافہ کیا ہے۔ جو نئے وزیر لیے گئے ہیں ان میں سے ایک ۲۹ سالہ خاتون سیلجا چودھری (Selja Chaudhary) ہیں۔ وہ حکومت ہند کی وزارت تعلیم میں اسٹیٹ منسٹر مقرر کی گئی ہیں۔ ایک انٹرویو میں انھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جب میں نے ٹیلی فون کے دوسری طرف سے کیبنٹ سکریٹری کی آواز سنی جس میں یہ خبر دی گئی تھی کہ مجھے وزارت کے عہدہ پر مقرر کیا گیا ہے تو مجھے یقین نہیں آیا کہ یہ صحیح ہے۔ بظاہر میں اچھل تو نہیں پڑی مگر واقعہ یہ ہے کہ مجھے اس خبر سے بے حد خوشی ہوئی :

> I didn't believe it was true when I heard the Cabinet Secretary's voice on the other end of the line informing me of my new office. I did not exactly jump but I was really very happy.
>
> *The Pioneer*, New Delhi, July 12, 1992, p. 5.

یہ ایک علامتی واقعہ ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ ہمارے حکمراں نصف صدی گزرنے کے بعد بھی ملک کو امن اور ترقی کا ملک نہ بنا سکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد جن لوگوں کو اقتدار کا منصب ملا ان کی نظر منصب کے اعزاز پر چلی گئی نہ کہ منصب کی ذمہ داریوں پر۔ اور جن لوگوں کا یہ حال ہو وہ کبھی ملک میں ترقی اور خوش حالی کا دور نہیں لا سکتے۔ جن لوگوں کی نظر منصب کے اعزاز پر ہو وہ منصب کو صرف اپنی ترقی کا ذریعہ بنائیں گے۔ اپنی ذات کو نمایاں کرنے کے سوا کسی اور چیز سے انھیں کوئی حقیقی دل چسپی نہیں ہو سکتی۔ وہ اپنے ذاتی فائدہ کی خاطر پورے ملک کو قربان کر سکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے لیے پوری قوم کا سودا کر سکتے ہیں۔

اس کے برعکس جس آدمی کی نظر منصب کی ذمہ داریوں پر ہو، وہ جب کسی منصب کو پاتا ہے تو وہ کانپ اٹھتا ہے۔ اس کے لیے منصب ایک ایسا بوجھ بن جاتا ہے جس کے نیچے اس کی شخصیت دب کر رہ جائے۔ اول الذکر اگر قہقہوں کے ساتھ منصب کا استقبال کرتا ہے تو ثانی الذکر غم کے آنسوؤں کے ساتھ۔ جو لوگ منصب کو ذمہ داری سمجھیں ان کے لیے منصب کو پانا اپنی زندگی کی ویرانی کے ہم معنی بن جاتا ہے۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جو ملک کو ایک سرسبز و شاداب باغ میں تبدیل کرنے کا کارنامہ انجام دیتے ہیں۔

ڈائری ساتھ رکھئے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر ہجرت کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو سراقہ بن مالک بن جُعشم سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ واقعہ ابن ہشام نے کسی قدر تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اس واقعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے نکل کر مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے، تو قریش مکہ نے اعلان کیا کہ جو آدمی آپ کو پکڑ کر لائے گا اس کو ایک سو اونٹ انعام دیا جائے گا۔ سراقہ انعام کے شوق میں گھوڑے پر سوار ہو کر آپ کے پیچھے دوڑا۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے قریب پہنچ گیا۔ مگر عین اس وقت اس کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور وہ زمین پر گر پڑا۔ اس واقعہ سے سراقہ بد دل ہو گیا۔ اس نے اپنے دل میں کہا کہ آپ مجھ سے محفوظ کر دیے گئے ہیں اور یہ بات بالکل واضح ہے (فعرفتُ حين رأيتُ ذلك انه قد مُنِعَ منّي وانه ظاهر)

اس کے بعد سراقہ نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ رسول اللہؐ اور حضرت ابو بکرؓ کو آواز دے کر اس نے کہا کہ اے لوگو، میں سراقہ بن جعشم ہوں۔ مجھے اتنی مہلت دو کہ تم سے بات کروں۔ خدا کی قسم، میں تم سے کوئی دغا نہیں کروں گا اور نہ میری جانب سے تمہیں کوئی ایسی بات پہنچے گی جو تم پسند نہ کرو۔ رسول اللہؐ نے حضرت ابو بکرؓ سے کہا کہ اس سے پوچھو کہ وہ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ سراقہ نے پوچھنے پر جواب دیا کہ مجھے آپ ایک تحریر لکھ دیں جو میرے پاس ایک نشانی کے طور پر رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اكتب له يا ابابكر (اے ابو بکر، اس کو لکھ کر دے دو) سراقہ کا بیان ہے کہ اس کے بعد ابو بکرؓ نے کسی ہڈی یا کاغذ یا ٹھیکری پر ایک تحریر لکھی اور میری طرف اس کو پھینک دیا۔ میں نے اس کو لے لیا اور اس کو اپنے ترکش میں رکھ کر واپس آگیا

(سیرۃ ابن ہشام ۲/۱۰۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر و حضر میں اپنے ساتھ قلم اور کاغذ رکھنا بھی رسول اللہؐ کی ایک سنت ہے۔ موجودہ زمانہ میں اس کی آسان صورت یہ ہے کہ آدمی ایک پاکٹ ڈائری اور ایک قلم ہمیشہ اپنی جیب میں رکھے۔ اور روزانہ کی ضروری باتیں اس میں درج کرتا رہے۔ ڈائری کا استعمال ایک نہایت مفید عادت ہے اور اسی کے ساتھ ایک سنتِ رسولؐ بھی۔

ترقی کے مواقع

۱۹۹۹ کے سروے کے مطابق، ہندستان میں اس سال کا سب سے زیادہ امیر بنگلور کا ایک مسلمان تھا جس کا نام عظیم ہاشم پریم جی ہے۔ اس سال اس کا سرمایہ ۷۶ ابلین روپئے تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دنیا میں ترقی کے مواقع لامحدود ہیں۔ حتی کہ یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ اقلیتی فرقہ کا ایک فرد ترقی کر کے اکثریتی فرقہ سے آگے بڑھ جائے۔ (ٹائمس آف انڈیا، ۲۷ جون ۱۹۹۹)

ممتاز تعلیمی ادارہ انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی (بمبئی) کے ۳۷ ویں جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر اپنے کانوکیشن ایڈریس میں جناب عظیم ہاشم نے اپنے تجربات بتائے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عظیم ہاشم کی ترقی ۲۵ سال کی لگاتار محنت کا نتیجہ ہے۔ انھوں نے لمبی مدت تک یہ کیا کہ ایک طرف خود اپنی صلاحیتوں کو آخری حد تک اپنے کاروبار میں لگادیا۔ دوسری طرف انھوں نے بار بار سفر کر کے ملک بھر سے اعلیٰ قابلیت کے نوجوان حاصل کئے اور ان کے ذریعہ ایک بہترین ٹیم تیار کی۔ انھوں نے اپنے اور دوسروں کے تجربات سے سبق سیکھا۔ ان کا کہنا ہے کہ کامیابی کا سب سے بڑا راز کبھی ختم نہ ہونے والی سخت محنت ہے۔ اس طرح طویل منصوبہ بند عمل کے ذریعہ انھوں نے اپنی موجودہ کامیابی حاصل کی۔ عظیم ہاشم نے کہا کہ: ”مستقبل وہ نہیں ہے جو آپ کے ساتھ پیش آتا ہے بلکہ مستقبل وہ ہے جسے آپ خود بناتے ہیں۔“

اس دنیا میں ہر آدمی وہی ترقی حاصل کر سکتا ہے جو ترقی کسی دوسرے نے حاصل کی ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ اپنی مطلوب کامیابی کے لئے اس کے مطابق ضروری عمل کیا جائے۔

وہ عمل کیا ہے۔ وہ عمل ہے— مقصد کا واضح تصور، اس کو پانے کا عزم مصمم، اپنی پوری صلاحیت کو اس میں لگادینا، لائق افراد کے ذریعہ متحدہ کوشش کرنا، ہر چیلنج سے نیا حوصلہ لینا، اپنی معلومات میں برابر اضافہ کرتے رہنا، یہی اس دنیا میں کامیابی کے اصول ہیں۔ اور جو آدمی ان اصولوں کو بھرپور طور پر اپنالے اس کے لئے ترقی اتنا ہی زیادہ یقینی بن جاتی ہے جتنا کہ شام کے بعد اگلی صبح کا طلوع ہونا۔

مستقبل کو جانئے

جان بیٹ (John Bate) سترھویں صدی عیسوی کا ایک برٹش مرچنٹ تھا۔ ۱۶۰۶ کا واقعہ ہے کہ اس نے باہر سے کچھ کشمش (Currants) امپورٹ کی۔ ملک میں داخل ہونے کے بعد جب اس کے سامان پر ٹیکس لگایا گیا تو اس نے ٹیکس کی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ یہ ایک شاہی ٹیکس ہے جس کو کنگ جیمز فرسٹ (۱۶۲۵-۱۵۶۶) نے خود اپنے اختیار سے جاری کیا ہے۔ پارلیمنٹ نے اس کے حق میں قانون نہیں بنایا ہے۔ انگلستان کے حکمراں جیمز فرسٹ نے شاہی مالیات کے مسائل کو حل کرنے کے لیے اس قسم کے کچھ ٹیکس نافذ کیے تھے۔

عدالت زیریں کے جج نے کنگ کے مطلق اختیار (absolute power) کا حوالہ دیتے ہوئے اس ٹیکس کو جائز قرار دے دیا۔ جان بیٹ اس کے بعد عدالت عالیہ میں گیا۔ اس وقت سر ایڈورڈ کوک (Sir Edward Coke) عدالت عالیہ کے چیف جسٹس تھے۔ انھوں نے مقدمہ کی سماعت کرنے کے بعد جان بیٹ کے حق میں فیصلہ دیا۔ انھوں نے کہا کہ بادشاہ کو پارلیمنٹ کی اجازت کے بغیر از خود کوئی ٹیکس عائد کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

جسٹس کوک کے اس فیصلہ پر بادشاہ بہت برہم ہوا۔ اس نے اپنے شاہی اختیارات سے جسٹس کوک کو عدالتی عہدہ سے ڈسمس کر دیا، اور اپنے حکم کے تحت شاہی ٹیکس کے قانون کو دوبارہ بحال کر دیا (3/240-14)

اس واقعہ کو اب تقریباً چار سو سال گزر چکے ہیں۔ آج صورت حال مکمل طور پر بدل چکی ہے۔ آج برطانیہ میں اور دوسرے ملکوں میں مسلّم طور پر مان لیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ سب سے بڑا قانونی ادارہ ہے۔ بادشاہ یا کوئی بھی شخصیت اس کے ماتحت ہے نہ کہ اس کے اوپر۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی کا یہ حال ہے کہ وہ ایسے الفاظ بول رہا ہے جو آئندہ بے حقیقت ہو جانے والے ہیں۔ ہر انسان ایسے عمل میں سرگرم ہے جس کی کوئی قیمت اس کو موت کے بعد کی زندگی میں ملنے والی نہیں۔ کامیاب وہ ہے جس کا قول و عمل آخرت کی دنیا میں باوزن ٹھہرے، اور ناکام وہ ہے جس کا قول و عمل آخرت میں بے وزن ہو جائے۔

کامیاب فارمولہ

بنگلور کے ڈاکٹر احمد سلطان انوکھی شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ٹیپو سلطان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر ان کا مزاج بر عکس طور پر یہ تھا کہ محبت سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ ۱۳ دسمبر ۱۹۹۹ کو تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

وہ جب بھی دہلی آتے تو مجھ سے ملتے اور اپنے "کامیاب فارمولہ" کی سبق آموز مثالیں بیان کرتے۔ ایک بار ان کے صاحبزادے رات کے وقت گاڑی لے کر باہر نکلے۔ وہ گیارہ بجے واپس آئے تو وہ گاڑی باہر کھڑی کر کے گھر میں داخل ہوئے اور تیزی سے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازے پر دستک کی آواز آئی۔ ڈاکٹر احمد سلطان صاحب نے دروازہ کھولا تو دو ہندو نوجوان باہر کھڑے ہوئے تھے۔ انھوں نے غصہ کے لہجے میں بتایا کہ آپ کے صاحبزادہ نے ہمارے اسکوٹر کو ٹکر ماری اور پھر بھاگ آئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کوئی جواب دینے کے بجائے نرمی سے کہا کہ اندر تشریف لائیے، بیٹھ کر بات ہو گی۔ دونوں اندر آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کو ایک میز کے کنارے کرسی پر بٹھایا اور کہا کہ اس وقت سردی کا موسم ہے۔ آیئے ہم لوگ پہلے چائے پئیں پھر بات کریں گے۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا غصہ ختم ہو چکا تھا، دونوں خوش خوش واپس چلے گئے۔

ایک بار ایک ہندو نوجوان ان کے پاس آیا۔ اس نے رو کر کہا کہ میں ایک بڑے مسئلہ سے دوچار ہوں۔ آپ میرا مسئلہ حل کیجئے۔ اس نے بتایا کہ مجھ سے ایک غلطی ہو گئی۔ اس کے بعد میرے باپ نے مجھ کو گھر سے نکال دیا۔ چھ مہینے ہو چکے ہیں اور ابھی تک وہ راضی نہیں ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ تم انھیں سمجھانے کی کوشش نہ کرو۔ تم خاموشی سے جاؤ اور اپنے باپ کے قدموں پر سر رکھ کر کہو کہ اے باپ، میری غلطی کے لئے مجھے معاف کر دیجئے۔ نوجوان نے ایسا ہی کیا۔ جب وہ اپنے گھر گیا تو اس کے باپ نے اس کو ڈانٹا۔ بیٹا کوئی جواب نہ دیتے ہوئے باپ کے

قدموں پر گر پڑا۔ اس کے بعد باپ کا جذبۂ پدری ابھر آیا۔ اس نے بیٹے کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ چند منٹوں کے اندر ساری بات ختم ہو گئی۔

ایک بار ڈاکٹر صاحب ایک شہر میں گئے۔ وہاں کے مسلمانوں نے بتایا کہ جلد ہی یہاں کٹر ہندوؤں کا ایک جلوس نکلنے والا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ لوگ زبردست تیاری کر رہے ہیں۔ وہ اپنا جلوس مسلم محلّہ سے لے جائیں گے اور کوئی نہ کوئی بہانہ نکال کر فساد کریں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ لوگ میرا ایک مشورہ مان لیجئے اور پھر یہاں کوئی فساد نہیں ہوگا۔ آپ لوگ ایسا کیجئے کہ جس دن جلوس نکلنے والا ہو، بازار سے دو درجن پھولوں کے ہار لے آیئے۔ جب ان کا جلوس آپ کی مسجد کے سامنے پہنچے تو آپ لوگ پھولوں کا ہار لے کر باہر آئیں اور جو ہندو جلوس کے آگے آگے چل رہے ہیں ان سے کہیں کہ ہم آپ کا سواگت کرتے ہیں اور پھر ان کے گلے میں ایک ایک ہار ڈال دیں۔ مسلمانوں نے ایسا ہی کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ جس دن وہاں ہندو مسلم ٹکراؤ ہونے والا تھا، وہ ان کے لئے ہندو مسلم ملاپ کا دن بن گیا۔

ایک بار بنگلور میں وہ اپنے گھر کے قریب سڑک پر چل رہے تھے۔ پیچھے سے شہر کے ایک ہندو کی گاڑی آئی جو مسلمانوں کا مخالف سمجھا جاتا تھا۔ اس کی گاڑی ڈاکٹر صاحب سے ٹکرا گئی اور ڈاکٹر صاحب سڑک پر گر پڑے۔ ان کو کئی جگہ زخم آئے۔ مذکورہ ہندو اپنی گاڑی روک کر ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا اور کہا کہ آپ میری گاڑی پر بیٹھ جائیں میں آپ کو لے کر اسپتال چلتا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ تم فوراً یہاں سے چلے جاؤ۔ یہ مسلم علاقہ ہے۔ مسلمانوں نے اگر تم کو دیکھ لیا تو وہ تم کو مارے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔ ڈاکٹر صاحب نے سخت اصرار کر کے اس کو وہاں سے بھیج دیا۔ اس کے بعد مذکورہ ہندو ہمیشہ کے لئے ڈاکٹر صاحب کا دوست بن گیا۔

ڈاکٹر سلطان کے دل میں کسی کے لئے نفرت نہ تھی۔ وہ ہر ایک کو پیار و محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مذکورہ کامیاب فارمولہ اپنانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس دنیا میں محبت سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ مگر نادان لوگ نفرت کو سب سے بڑا ہتھیار سمجھ لیتے ہیں۔

ایک مثال

یہ غالباً ۱۹۸۱ کی بات ہے۔ ایک مسلم نوجوان مجھ سے دہلی میں ملا۔ وہ اپنی کہانی بتاتے ہوئے رونے لگا۔ وہ تعلیم یافتہ تھا اور اس کے پاس ایک اچھا جاب تھا مگر کسی وجہ سے اس کا جاب اس سے چھوٹ گیا۔ اس حادثہ سے وہ اتنا مایوس ہوا کہ اس نے بتایا کہ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ میں خودکشی کرلوں۔ میں نے کہا کہ یہ تو مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ ابھی آپ نوجوان ہیں اور انشاء اللہ آپ بہت دن تک کام کریں گے۔ پھر آپ کو پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے ان سے ان کی ڈائری مانگی اور اس پر یہ جملہ لکھ دیا: باغ کا مالی کبھی ایک پودے کو اس کی جگہ سے اکھاڑتا ہے، صرف اس لیے کہ اس کو زیادہ بہتر جگہ پر لگائے۔

پھر میں نے کہا کہ آپ خلیج کے ملکوں میں سے کسی ملک میں جائیے اور وہاں کام حاصل کرنے کی کوشش کیجئے۔ وہ ایک عرب ملک میں گئے اور کچھ دنوں بعد لوٹ کر آئے اور بتایا کہ وہاں مجھ کو کوئی کام نہیں ملا۔ میں نے کہا کہ کوشش صرف ایک بار نہیں کی جاتی، بلکہ بار بار کی جاتی ہے۔ میرے اصرار پر وہ دوبارہ گئے۔ اب وہاں ان کو ایک اچھا کام مل گیا ہے۔ تقریباً بیس سال سے وہ وہاں ہیں اور نہایت کامیاب ہیں۔

اس طرح کے کثیر واقعات ہیں جو آدمی کو یہ سبق دیتے ہیں کہ کوشش کے بعد اس کی کامیابی یقینی ہے۔ مگر کوشش صرف ایک بار عمل کرنے کا نام نہیں۔ کوشش ایک مسلسل عمل ہے۔ کوشش کا عمل ہر حال میں جاری رہتا ہے، نہ صرف ناکامی کے بعد بلکہ کامیابی کے بعد بھی۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی جس مقصد کے لیے کوشش کرے، وہ اس کے خلاف عمل نہ کر رہا ہو۔ مثلاً ایک ڈاکٹر جب کلینک کرے تو اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ لوگوں میں اس کی تصویر یہ نہ بنے کہ اس کو صرف مال سے دلچسپی ہے، مریضوں کی شفایابی سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں۔

چوتھا باب

کامیابی کا راز

بیج کا درخت بننا کوئی اتفاقی بات نہیں۔ اسی طرح ایک شخص کا کامیاب ہونا بھی کوئی اتفاقی بات نہیں، بلکہ وہ کچھ اصولوں کی پابندی کا لازمی نتیجہ ہے۔

علم کی اہمیت

دنیا کی تمام دولتوں میں سب سے بڑی دولت عمل ہے، اس دنیا میں علم سے زیادہ بڑی اور کوئی دولت نہیں، ایک مفکر کا قول ہے کہ علم ایک معمولی آدمی کو غیر معمولی آدمی بنا دیتا ہے: (Learning makes a man super man.)

جانور اور انسان میں یہ فرق ہے کہ جانور کی معلومات محدود ہوتی ہیں۔ جانور کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی معلومات میں اضافہ کر سکے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی معلومات میں اضافہ کرتا رہتا ہے، اس معاملہ میں انسانی دماغ کی صلاحیت لامحدود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انسان آخر عمر تک اپنی معلومات کو بڑھاتا رہتا ہے۔ دماغ کی کوئی حد نہیں، اس لئے اضافۂ معلومات کی بھی کوئی حد نہیں۔

انسانی شخصیت کی تکمیل میں سب سے زیادہ حصہ اسی علم کا ہے۔ یہ دراصل علم ہی ہے جو ایک عام آدمی کو عظیم آدمی بناتا ہے، جو ایک معمولی انسان کو غیر معمولی انسان بنا دیتا ہے۔

علم کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ آدمی اپنی شخصیت کی توسیع کر سکے۔ وہ گزری ہوئی تاریخ کو کتابوں میں پڑھ کر جان لے۔ وہ مطالعہ کر کے دنیا بھر میں ہونے والے واقعات سے باخبر ہو جائے۔ علم کے ذریعہ آدمی اس قابل بنتا ہے کہ وہ باتوں کا تجزیہ کر کے نئی نئی حقیقتیں دریافت کرے۔ وہ ماضی اور حال سے سبق لے کر مستقبل کا اندازہ کر سکے۔ وہ عالمی دماغوں کے افکار کو جان کر تاریخ کے اگلے زینہ پر قدم رکھ سکے۔

علم آدمی کو حیوانیت کے درجہ سے اٹھا کر حقیقی انسانیت کے درجہ پر پہنچاتا ہے۔ علم آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ ساری دنیا سے ذہنی غذا لے کر زیادہ بہتر طور پر اپنی زندگی کی تعمیر کرے۔ وہ اپنی زندگی کی زیادہ بہتر اور زیادہ کامیاب منصوبہ بندی کر سکے۔ علم کے بغیر ہر آدمی غیر کامل انسان ہے اور علم کے ساتھ ہر آدمی کامل انسان۔

محبت فاتح عالم

ایک انسانی مجسمہ کے سامنے کھڑے ہو کر آپ اس کو سخت الفاظ میں خطاب کریں یا اس کے سامنے محبت کے الفاظ بولیں، دونوں حالتوں میں وہ کوئی ردّ عمل ظاہر نہیں کرے گا، وہ نہ آپ کی سخت کلامی پر برہم ہوگا اور نہ آپ کی نرم کلامی پر خوشی کا اظہار کرے گا۔ مگر ایک زندہ انسان کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ وہ سخت کلامی پر غصہ ہوتا ہے اور میٹھے بول کو سن کر نرم پڑ جاتا ہے۔

سماجی زندگی کے بیشتر واقعات اسی انسانی صفت کا اظہار ہیں۔ جب آپ ایک آدمی کے ساتھ سخت کلامی کرتے ہیں تو وہ آپ کا دشمن بن جاتا ہے۔ وہ آپ کے خلاف انتقام کا منصوبہ بناتا ہے۔ لیکن اسی آدمی سے محبت کے انداز میں بات کیجئے تو وہ آپ کا دوست بن جائے گا۔ ایک قسم کا کلام لوگوں کو آپ سے دور کر دینے والا ہے اور دوسری قسم کا کلام لوگوں کو آپ سے قریب کر دینے والا۔

سماجی زندگی کو کامیاب بنانے کا یہ سب سے زیادہ آزمایا ہوا نسخہ ہے۔ اگر آپ سماج کے اندر باعزت زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ آپ کے خلاف رکاوٹ نہ بنیں بلکہ وہ آپ کے مددگار بن جائیں تو صرف ایک اصول کو اپنی زندگی میں اختیار کر لیجئے اور وہ ہے ہر ایک کے ساتھ نرمی اور محبت کے ساتھ پیش آنا۔

یہ اصول تباہ کن حد تک غلط ہے کہ —— نرمی کرنے والوں کے ساتھ نرمی اور سختی کرنے والوں کے ساتھ سختی، اس کے برعکس صحیح اصول یہ ہے کہ نرمی کرنے والوں کے ساتھ بھی نرمی اور جو لوگ سختی کریں ان کے ساتھ بھی نرمی۔ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے آپ کے خلاف برہم ہو جائے تو آپ اس کے ساتھ جوابی برہمی نہ دکھائیں۔ بلکہ اس کے برے سلوک کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں۔ اس کے کڑوے بول کا جواب میٹھے بول سے دیں۔ اگر وہ آپ کو نقصان پہنچائے تب بھی آپ اس کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کریں۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جو آدمی بظاہر آپ کا دشمن دکھائی دیتا تھا، وہ آپ کا قریبی دوست بن گیا۔

حسن تدبیر

تاجر لوگ ایسا نہیں کرتے کہ وہ اپنا تجارتی کام شروع کر کے بیٹھ جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ اب دوسروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ آئیں اور ہمارے یہاں سے اپنی مرضی کا سامان خرید کر لے جائیں۔ بلکہ اس کے بعد وہ ایک اور کام کرتے ہیں جس کو تجارت کو فروغ دینا کہا جاتا ہے۔ وہ اپنی تجارت کو ترقی اور فروغ دینے کے لیے مزید مختلف قسم کی کوششیں کرتے ہیں۔

انھیں میں سے ایک ہے —— قیمت گھٹا کر سامان فروخت کرنا۔ مثلاً ایک شخص ایک پندرہ روزہ میگزین نکالے گا۔ اس کی اصل قیمت فی کاپی دس روپے ہوگی۔ مگر ایک مخصوص مدت تک وہ اس کی قیمت کم کر کے صرف دو روپیہ میں فروخت کرے گا۔ اس کمتر قیمت کو عام طور پر ترغیبی قیمت (invitation price) کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک شخص بازار میں ایک دکان کھولے گا۔ ابتدا میں وہ کچھ دنوں ایسا کرے گا کہ اس کا سامان جس کی اصل قیمت سو روپیہ ہے، اس کو وہ صرف ۷۵ روپیہ میں دے گا۔ اس کو افتتاحی رعایت (inaugural discount) کہا جاتا ہے۔

یہ طریقہ صرف تجارت کے لیے نہیں ہے۔ اس کا تعلق تمام اجتماعی معاملات سے ہے۔ جب بھی آپ کسی سے تعلقات بڑھانا چاہیں۔ کسی حلقہ میں نفوذ حاصل کرنا چاہیں۔ کسی کو اپنی طرف مائل کرنا چاہیں تو آپ کو یہی طریقہ اختیار کرنا ہوگا۔ دوسروں کو رعایت دے کر ہی اس دنیا میں دوسروں کے درمیان مقام حاصل ہوتا ہے۔

ہندستان میں بعض تاریخی یا غیر تاریخی اسباب سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو گئے ہیں۔ اِس کشیدگی کا سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ اب دونوں فرقوں کے درمیان تعلق کو معتدل بنانے کی عملی صورت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ مسلمان اس معاملہ میں پہل کر کے وہی تدبیر اختیار کریں جس کو مذکورہ مثال میں ترغیبی قیمت یا افتتاحی رعایت کہا گیا ہے۔

یہ کوئی دَبنے یا جھکنے کی بات نہیں۔ بلکہ وہ حسن تدبیر ہے۔ ذاتی معاملہ میں ہر آدمی اسی تدبیر کو اختیار کرتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ملی معاملہ میں بھی اس کو اختیار کر لیا جائے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسری تدبیر موجودہ حالت کو ختم کرنے والی نہیں۔

شام کے بعد صبح

ایک شخص نے کہا کہ شام ہوگئی۔ دوسرا شخص بولا: یوں کہو کہ صبح آنے والی ہے ــــــ اگر آپ معاملات کو حال کے اعتبار سے دیکھیں تو بظاہر آپ کو تاریکی دکھائی دے گی۔ لیکن اگر آپ معاملہ کو مستقبل کے اعتبار سے دیکھیں تو سامنے کے افق پر روشنی ابھرتی ہوئی نظر آنے لگے گی۔

بیشتر لوگوں کی نظر اپنے آج پر ہوتی ہے۔ اس لئے اگر ان کے آج کے حالات اچھے نہ ہوں تو وہ سمجھ لیتے ہیں کہ انھیں اچھی زندگی حاصل نہیں۔ حالاں کہ عقلمندی کی بات یہ ہے کہ آنے والے کل پر نظر رکھی جائے۔ تجربات بتاتے ہیں کہ اکثر آنے والا کل ایسے مواقع لے کر آتا ہے جس کو اس سے پہلے آدمی نے سوچا بھی نہیں تھا۔

زمین ہر لمحہ گھوم رہی ہے۔ زمین کے اوپر بار بار شام بھی آتی ہے اور صبح بھی طلوع ہوتی ہے۔ جن لوگوں کی نظر صرف قریب پر ہو، وہ جب شام کو دیکھیں گے تو کہہ دیں گے کہ اب تو زندگی کی شام آگئی۔ مگر جو لوگ دور تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتے ہوں، وہ کہہ اٹھتے ہیں کہ شام کو شام کے اعتبار سے نہ دیکھو۔ اس کو اس نظر سے دیکھو کہ وہ آنے والی صبح کی تمہید ہے۔

زندگی میں جب بھی کوئی ناموافق صورت حال پیش آئے تو وہ ایک نئی موافق صورتحال کی تمہید ہوتی ہے۔ وہ ایک نئے مستقبل کی خبر دیتی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ مایوسی کا شکار ہونے کے بجائے اپنے ذہن کو استعمال کرے۔ وہ اپنی سوچ کو حرکت میں لاکر آگے بڑھ جائے۔

اس دنیا میں آدمی جو کچھ پاتا ہے، اس سے بہت زیادہ وہ ہے جس کو اس نے نہیں پایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تھوڑے کو کھو کر زیادہ کو پانے کا موقع پھر بھی آدمی کے لئے باقی رہتا ہے۔ آدمی ذرّہ کو کھو کر افسوس کرتا ہے حالاں کہ ابھی پورا پہاڑ اس کے حوصلوں کے امتحان کے لئے موجود ہے۔ وہ ایک قطرہ سے محرومی پر فریاد کرتا ہے، وہ بھول جاتا ہے کہ ابھی تو خدا کی دنیا میں پورا سمندر باقی ہے جس کو پانے کے لئے وہ از سر نو اپنی کوششوں کو جاری کرسکے۔

دنیا میں کوئی کھونا آخری کھونا نہیں۔ ہر کھونے کے بعد پانے کا نیا امکان آدمی کے لئے موجود رہتا ہے۔ عقل مند وہ ہے جو کھونے کو بھلا دے، وہ ہمیشہ پانے کی طرف دیکھتا رہے۔

نادانی اور دانش مندی

نادان نے کہا کہ میں نے اپنے ماضی اور حال کو برباد کر دیا۔ دانش مند بولا، مگر مستقبل تو برباد نہیں ہوا ــــــ آدمی کی زندگی صرف ماضی اور حال کے اوپر ختم نہیں ہو جاتی۔ اس کی لمبی زندگی میں مستقبل بھی لازمی طور پر شامل ہے۔ پھر کوئی شخص ماضی اور حال کے کھونے کا غم کیوں کرے، جب کہ مستقبل اب بھی آپ کے پاس پوری طرح موجود ہے۔

کوئی شخص اپنے گزرے ہوئے دنوں کو گنوا سکتا ہے۔ مگر اس کے آنے والے دن تو اب بھی اس کے پاس باقی ہیں۔ اگر آدمی اپنے احساس کی شدت کو پچھلے دنوں کی تلخ یاد میں نہ لگائے بلکہ اس شدت کو آنے والے دنوں کو استعمال کرنے میں لگا دے تو ہو سکتا ہے کہ پہلے اس نے جو کچھ کھویا ہے، اس کو وہ آئندہ مزید اضافہ کے ساتھ حاصل کر لے۔

ماضی آپ کے ہاتھ سے نکل چکا، حال بھی آپ کا ساتھ چھوڑ رہا ہے۔ اب جو چیز آپ کے پاس باقی ہے وہ صرف آپ کا مستقبل ہے۔ آپ بیتے ہوئے دن یا جانے والے لمحات کا غم کیوں کریں۔ آنے والے دن جو اب بھی پوری طرح آپ کے قبضہ میں ہیں، ان پر اپنی ساری توجہ لگا دیجئے۔ یہی ممکن بھی ہے اور یہی عقل کا تقاضا بھی۔

نادان کی نظر ہمیشہ پیچھے کی طرف ہوتی ہے اور دانش مند کی نظر ہمیشہ آگے کی طرف۔ نادان آدمی صرف اس کو جانتا ہے جو ہو چکا۔ دانش مند اس کو بھی جانتا ہے جو ہو سکتا ہے۔ آپ نادان نہ بنئے، آپ کوشش کیجئے کہ آپ کا نام دانش مندوں کی فہرست میں لکھا جائے۔

جب آدمی کے لئے دانش مند بننے کا موقع بھی موجود ہو اور اسی کے ساتھ نادان بننے کا موقع بھی، تو وہ نادان کیوں بنے، کیوں نہ وہ دانش مند بننے کی کوشش کرے۔ وہ تاریکیوں میں کیوں بھٹکے، جب کہ روشنی کے دروازے بھی اس کے لئے کھلے ہوئے ہیں۔

زندگی ایک مسلسل سفر ہے جو ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کی طرف جاری ہے۔ جو شخص ماضی اور حال میں اٹک کر رہ جائے وہ گویا زندگی کی حقیقت کا انکار کر رہا ہے۔ اور حقیقت کا انکار کرنے والا خود اپنا انکار کرتا ہے، حقیقت کو بدلنا اس کے لئے کسی طرح ممکن نہیں۔

ناکامی نہیں

پیغمبرانہ نگاہ کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ وہ نہیں کو بھی ہے کی صورت میں دیکھتا ہے۔ اس کی بنیاد یہ ہے کہ خدا نے دنیا کو اس ڈھنگ پر بنایا ہے کہ یہاں کوئی چیز آخری طور پر مشکل نہیں۔ بلکہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی بھی شامل ہے۔ زندگی کی یہ حقیقت قرآن میں ان لفظوں میں بتائی گئی ہے کہ پس بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے، بے شک مشکل کے ساتھ آسانی ہے (الانشراح)

ابن اسحاق کہتے ہیں کہ ۸ھ میں مکہ سے طائف جاتے ہوئے پیغمبر اسلام ایک ایسے پہاڑی راستہ سے گزرے جو تنگ اور دشوار گزار تھا۔ آپ نے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے۔ لوگوں نے کہا کہ الضیقہ (مشکل) آپ نے فرمایا نہیں بلکہ اس کا نام الیسریٰ (آسان) ہے۔

یہ واقعہ پیغمبرانہ طرز فکر کو بتاتا ہے۔ پیغمبر دنیا کی ہر چیز کو خدا کی نظر سے دیکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو مشکل بھی آسانی کے روپ میں دکھائی دیتی ہے۔ کیوں کہ خدا نے اپنی دنیا کو اسی قانون کے تحت بنایا ہے کہ یہاں ہر مشکل کے ساتھ آسانی بھی ہمیشہ موجود رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ کو اپنے وطن میں سخت ترین مشکل سے سابقہ پیش آیا۔ اس کے باوجود آپ نے دنیا کی سب سے بڑی کامیابی حاصل کی۔ یہ ایک ایسا مسلّم واقعہ ہے جس سے انکار کرنا ممکن نہیں۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ رسول کی زندگی میں تمہارے لیے اسوہ ہے (الاحزاب) یہ اسوہ یا نمونہ کسی محدود معنیٰ میں نہیں ہے۔ بلکہ وہ زندگی کے ہر معاملے کے بارے میں ہے۔ آپ نے جس طرح نماز اور حج کا طریقہ بتایا اسی طرح آپ نے اپنے عمل سے یہ بھی بتایا کہ مسائل کا مقابلہ کس طرح کیا جائے۔ اور مشکل کو آسان کس طرح بنایا جائے۔

پیغمبر اسلام ؐ نے اپنے عمل سے موجودہ دنیا کے بارہ میں اس امکان کی ممتاز ترین مثال قائم کی ہے۔ آپ نے مشکل ترین حالات میں اعلیٰ ترین کامیابی حاصل کی۔ حتیٰ کہ آپ نے اپنے دشمنوں کو اپنا ساتھی بنالیا۔ آپ نے اپنی مخالف صف کے لوگوں کو اپنی صف میں شامل کرلیا۔ آپ کو اپنے ماحول میں انتہائی ناموافق حالات پیش آئے مگر آپ نے اپنی فراست کے تحت ان کو کامل طور پر اپنی موافقت میں تبدیل کرلیا۔

اپنے اوپر فتح

ایڈمنڈ ہلیری (Edmund Hillary) ۲۰ جولائی ۱۹۱۹ کو نیوزی لینڈ کے شہر آکلینڈ میں پیدا ہوا۔ اس کو پہاڑوں پر چڑھنے کا شوق تھا۔ پہلے وہ اپنے ملک کے پہاڑوں پر چڑھائی کیا کرتا تھا۔ اس نے پہلی بار ۱۹۵۱ میں ایک ٹیم کے ساتھ ہمالیہ کی چوٹی ایورسٹ پر چڑھنے کی کوشش کی جو ۲۹۰۲۸ فیٹ اونچی ہے۔ پہلی بار اس کو کامیابی نہیں ہوئی۔ دوسری بار وہ ۱۹۵۳ میں ایک برٹش ٹیم کے ساتھ ایورسٹ پر چڑھائی کے لیے روانہ ہوا۔ اس بار اس نے ایک نیپالی تنزنگ نارگے کو بطور رہنما ساتھ لیا۔ ۲۹ مئی ۱۹۵۳ کو وہ ایورسٹ کی بلندی پر پہنچ گیا، وہ پہلا انسان تھا جس نے دنیا کی سب سے بلند چوٹی پر اپنا قدم رکھا۔ چنانچہ فوراً ہی وہ ساری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ برطانی حکومت نے ۱۶ جولائی کو اسے سر کا خطاب دیا۔ اس نے اپنی پہاڑی مہم پر ایک کتاب لکھی جو ۱۹۵۵ میں ہائی ایڈونچر (High Adventure) کے نام سے شائع ہوئی۔

سر ایڈمنڈ ہلیری نے اپنی کتاب میں جو باتیں لکھی ہیں ان میں سے ایک سبق کی بات یہ ہے کہ ہم پہاڑ کو فتح نہیں کرتے ہیں بلکہ ہم خود اپنے آپ کو فتح کرتے ہیں :

It is not the mountain we conquer but ourselves.

یہ ایک سادہ سی بات ہے مگر وہ بے حد اہم بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دنیا میں ہر فتح دراصل اپنے آپ پر فتح پانے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ ہر فتح سب سے پہلے یہ چاہتی ہے کہ اس کے لیے ضروری جدوجہد کی جائے۔ گویا کہ آدمی کو سب سے پہلے اپنے آپ کو جدوجہد کا اہل ثابت کرنا پڑتا ہے، اس کے بعد ہی اس دنیا میں وہ اس کا اہل قرار پاتا ہے کہ اس کو فتح و کامیابی کا مقام عطا کیا جائے۔

خواہ پہاڑ پر چڑھنا ہو یا اور کوئی کامیابی حاصل کرنا ہو، آدمی کو سب سے پہلے محنت اور مشقت کے امتحان میں پاس ہونا پڑتا ہے۔ اس کو یہ ثبوت دینا پڑتا ہے کہ وہ صبر اور برداشت کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جس دن آدمی اپنے اندر ضروری اہلیت کا ثبوت دے دیتا ہے اس کے اگلے دن دنیا دیکھتی ہے کہ وہ کامیابی کی بلند چوٹی پر فاتحانہ کھڑا ہوا ہے۔

تجارتی شعور

دہلی کے ایک مسلمان ہیں جو کامیاب موٹر میکینک سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی کامیابی کا راز کیا ہے، اس کا اندازہ ان کے ایک واقعہ سے ہوتا ہے:

۱۹۸۲ میں یہ خبر پھیلی کہ جلد ہی جاپانی کمپنی سوزوکی کی بنائی ہوئی ماروتی کار بازار میں آنے والی ہے۔ مذکورہ مسلمان کے دماغ میں فوراً یہ بات آئی کہ جب ماروتی گاڑی انڈیا کی سڑکوں پر دوڑنے لگے گی تو ساتھ ہی اس کی سروس اور مرمت کا کام بھی شروع ہو جائے گا۔ اس وقت جو آدمی اس کام کو جانتا ہوگا وہ یقیناً بہت کامیاب رہے گا۔

مذکورہ مسلمان کو معلوم تھا کہ جاپان کی سوزوکی کمپنی پچھلے دس سال سے پاکستان میں یہی گاڑی بنا کر بیچ رہی ہے۔ وہاں کی سڑکوں پر ہزاروں کی تعداد میں یہ گاڑیاں چل رہی ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اس کا کام سیکھنے کے لئے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا۔ وہ دہلی سے کراچی گئے۔ وہاں وہ دو مہینہ رہ کر سوزوکی کار کی مرمت اور سروس کا کام سیکھتے رہے۔ اور پھر دوبارہ دہلی واپس آ گئے۔

ہندستان میں بنی ہوئی ماروتی گاڑی جب یہاں کی سڑکوں پر چلنے لگی، اس وقت وہ اس کا کام سیکھ چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے ماروتی کا کام لینا شروع کر دیا۔ گاہکوں کو ان کا کام پسند آگیا۔ انھوں نے ماروتی کار کی سروس میں کافی پیسے کمائے۔

غور کیجئے تو مذکورہ مسلمان کی اس کامیابی میں تین چیزیں شامل ہیں واقفیت، پیش بینی، اور اقدام۔ وہ اس سے واقف تھے کہ پاکستان میں سوزوکی کمپنی کی گاڑیاں چل رہی ہیں۔ پھر انھوں نے پیشگی طور پر یہ اندازہ کیا کہ جلد ہی ہندستان میں ان گاڑیوں کی سروس اور مرمت کا کام شروع ہونے والا ہے۔ پھر ان کے اندر یہ جرأت تھی کہ وہ اس کی طرف اقدام کر سکیں۔

انھیں اوصاف کا نام تجارتی شعور ہے۔ اور جس آدمی کے اندر یہ تجارتی شعور ہو وہ اس دنیا میں کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ کامیابی ایک ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ اس کا تعلق پچاس فیصد امکانات سے ہے، اور پچاس فیصد اس کو استعمال کرنے کی صلاحیت سے۔

غیرضروری ٹکراؤ

مسٹرالبرٹ ہورانی (Albert Hourani) مغربی ایشیا کے امور کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کی مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے ـــــ عرب قوموں کی ایک تاریخ:

A History of the Arab Peoples

اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ عرب ملکوں کے لئے بہترین سیاسی پالیسی سیکولرزم ہے۔ ان کے الفاظ میں، مذہب اور سیاسی زندگی کی علیحدگی موجودہ دنیا میں کامیاب قومی زندگی کی واحد شرط ہے:

The separation of religion from political life seemed to be a condition of successful national life in the modern world.

موجودہ زمانہ میں روشن خیال طبقہ کا یہ کہنا ہے کہ مذہب کو نجی دائرہ میں محدود رہنا چاہئے۔ مذہب اور سیاست کے درمیان علیحدگی پرامن سماج کی تعمیر کے لئے لازمی شرط ہے۔ اس کے جواب میں موجودہ زمانہ کے اسلام پسند شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مذہب اور سیاست دونوں لازم اور ملزوم ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔

یہ غیرضروری بحث ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ صرف دو باتوں کے درمیان سوچ پاتے ہیں۔ یا مذہب مع سیاست یا مذہب بغیر سیاست۔ اسی لئے وہ ایک دوسرے کو اپنا مخالف سمجھ کر ان سے لڑنے لگتے ہیں۔ حالاں کہ یہاں ایک تیسرا نقطۂ نظر بھی ہے۔ اور وہ تدریج سے تعلق رکھتا ہے۔ یعنی رائج الوقت نظام عملی طور پر مذہب کو جس دائرہ میں کام کا موقع دے رہا ہو اس دائرہ کو بلا بحث قبول کرلینا اور اس کو نقطۂ آغاز سمجھ کر اپنا کام فکری انداز میں شروع کر دینا۔

اس نزاع کا آسان حل یہ ہے کہ جس چیز کو سیکولر طبقہ اصولی تقسیم کے طور پر پیش کر رہا ہے اس کو اسلامی طبقہ عملی تقسیم کے طور پر مان لے۔ اس عملی بندوبست کے باوجود اسلامی طبقہ اپنے فکر کی پرامن تبلیغ بدستور جاری رکھ سکتا ہے جس کی موجودہ زمانہ میں اسے پوری آزادی حاصل ہے۔ ایسی حالت میں پریشان ہونے کی کیا ضرورت۔

شعور نہ کہ نظام

موجودہ زمانہ میں جاپان کی غیر معمولی ترقی ایک تسلیم شدہ حقیقت بن چکی ہے۔ جاپان نے یہ ترقی احتجاجی مظاہروں کے ذریعہ حاصل نہیں کی۔ بلکہ اپنے افراد کے اندر شعور پیدا کرکے حاصل کی ہے۔ جاپانی امور کے ایک ماہر رابرٹ ہیز (Robert Hayes) نے لکھا ہے کہ جاپان نے اپنے افراد کے لئے معیار کو ایک طرز فکر (Way of thinking) بنا دیا۔ اس سلسلہ میں انھوں نے یہ الفاظ لکھے ہیں:

> You don't get quality into a product by inspection,
> you have to build it in.

معیاری پیداوار کو آپ انسپکٹروں کی جانچ کے ذریعہ حاصل نہیں کرسکتے۔ آپ کو ہر ایک کارکن کے اندر اس کا احساس پیدا کرنا ہوگا (ہندستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۶، صفحہ ۹)

امریکہ نے دوسری عالمی جنگ میں اور اس کے بعد جاپان کے ساتھ جو کچھ کیا تھا، اس کے مطابق امریکہ جاپان کے لئے دشمن نمبر ایک کی حیثیت رکھتا تھا۔ جاپان نے جنگ کے بعد جو اپنی تعمیر نو شروع کی تو پہلا کام یہ کیا کہ اپنے افراد کو منفی طرز فکر سے پاک کیا۔ اس نے نفرت اور انتقام کے احساسات سے اوپر اٹھ کر امریکیوں سے معاملہ کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جاپان اس سے بچ گیا کہ وہ اپنی طاقت کو غیر ضروری قسم کی منفی کارروائیوں میں صرف کرے۔ منفی نفسیات سے اوپر اٹھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے خود اپنے دشمن کو اپنی خوراک بنالیا۔

امریکہ کی بیل لیبارٹریز (Bell Laboratories) نے سب سے پہلے ٹرانسسٹر ایجاد کیا تھا۔ جاپانی اگر امریکہ کے خلاف نفرت کے جذبات اپنے سینہ میں لئے ہوئے ہوتے تو وہ امریکہ سے کچھ سیکھ نہیں سکتے تھے۔ مگر ان کے مثبت طرز فکر کا یہ نتیجہ ہوا کہ انھوں نے فوراً اس ایجاد کو پکڑ لیا۔ قبل اس کے کہ بیل لیبارٹریز ٹرانسسٹر بنائے جاپانیوں نے بہت بڑی مقدار میں ٹرانسسٹر بنا کر عالمی مارکیٹ پر قبضہ کرلیا۔ اسی طرح فبکس کی تکنیک امریکہ میں دریافت ہوئی۔ مگر جاپان نے سب سے پہلے اس کا تجارتی فائدہ حاصل کیا۔

اعلیٰ مقصد

ایک عرب ملک کی ٹیم بمبئی آئی اور ایک ہوٹل میں ٹھہری۔ ان کو اپنے ملک کے لیے کچھ کارکنوں کی ضرورت تھی۔ انھوں نے انگریزی اخبارات میں اشتہار چھپوایا۔ اس کو دیکھ کر دہلی کے ایک تعلیم یافتہ نوجوان نے بھی اپنے کاغذات انھیں بھیجے۔ اس کے جواب میں اس کے پاس بمبئی سے انٹرویو کارڈ آگیا۔ مذکورہ نوجوان رکشہ پر بیٹھ کر اپنے گھر سے ریلوے اسٹیشن کی طرف روانہ ہوا۔ اس کے ہمراہ اس کا ایک ساتھی بھی تھا جو اس کو چھوڑنے کے لیے اسٹیشن تک جا رہا تھا۔ سڑک پر ایک جگہ کچھ جاہل قسم کے لڑکے کھیل رہے تھے۔ رکشہ ان کے پاس سے گزرا تو ایک لڑکے نے ان کے خلاف برے الفاظ کہے۔ دوسرے نے کنکر پھینک دیا۔ اب نوجوان کے ساتھی کو غصہ آگیا۔ اس نے چاہا کہ رکشہ روک کر اترے اور لڑکوں کو مارے۔ نوجوان نے اس کا ہاتھ پکڑ کر بٹھالیا اور کہا: چھوڑو ہمارے پاس اس کا وقت کہاں ہے۔

مذکورہ نوجوان کے سامنے ایک منزل تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ وقت پر اسٹیشن پہونچ کر ٹرین پکڑے۔ بمبئی جاکر انٹرویو دے اور پھر عرب پہونچ کر دس ہزار روپیہ مہینہ کمائے۔ اس مقصد نے اس کی نظر میں لڑکوں کی گالی یا ان کی کنکری کو حقیر بنا دیا۔ وہ ان کو نظر انداز کرکے آگے بڑھ گیا۔

یہی معاملہ زیادہ بڑے پیمانہ پر اہل اسلام کا ہے۔ اہلِ اسلام وہ لوگ ہیں جو دعوت حق کو اپنا مقصد بنائے ہوئے ہوں۔ دعوت کا اعلیٰ تصور ان کی نظر میں بقیہ تمام چیزوں کو ہیچ کر دیتا ہے۔ وہ لوگوں کی طرف سے بُرے الفاظ سنتے ہیں، ان کی طرف پتھر پھینکے جاتے ہیں۔ مگر وہ ان چیزوں کی پروا نہیں کرتے۔ وہ یہ کہہ کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ ہمارے پاس اس کا وقت کہاں ہے کہ ہم اس قسم کی چھوٹی چیزوں میں الجھیں۔

مذکورہ نوجوان کے سامنے صرف دس ہزار روپیہ مہینہ کی منزل تھی۔ مگر داعی اور مومن کے سامنے جنت کی منزل ہوتی ہے۔ اس کے سامنے خدا کا یہ وعدہ ہوتا ہے کہ اس کا جو بندہ اس کے پیغام کو انسانوں تک پہونچائے گا اور اس راہ میں ہر قسم کی تکلیف اور دل آزاری کو برداشت کرے گا، اس کے لیے آخرت میں ابدی جنت ہے۔ وہ کہہ اٹھتا ہے کہ صبر ہی تو جنت کی قیمت ہے۔ پھر اگر میں لوگوں کی ایذا رسانی پر صبر نہ کروں تو آخرت میں مجھے جنت کا داخلہ کس طرح ملے گا۔

اعراض میں دنیا کی کامیابی بھی ہے اور اسی میں آخرت کی کامیابی بھی۔

دو قسم کے آدمی

ایک آدمی وہ ہے جو کم بولے اور زیادہ کرے۔ دوسرا آدمی وہ ہے جو زیادہ بولے اور کم کرے۔ پہلی قسم کا آدمی ہی آدمی ہے، دوسری قسم کا انسان آدمی کے بھیس میں غیر آدمی ہے۔

ہندستان میں ایمرجنسی (۷۷-۱۹۷۵) کے زمانہ میں فخر الدین علی احمد صدر جمہوریہ تھے۔ ان کے پاس یوپی کا ایک مسلمان آیا۔ اس نے کہا کہ میرے بھائی کو پولیس نے میسا کے قانون کے تحت گرفتار کرکے جیل میں بند کر دیا ہے، حالاں کہ وہ بالکل بے قصور ہے۔ فخر الدین علی احمد نے بھائی کا نام و پتہ لکھ کر مذکورہ مسلمان کو رخصت کر دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ فخر الدین صاحب نے ان کی بات پر کوئی توجہ نہیں دی۔ مگر جب وہ ٹرین سے سفر کرکے اپنے گھر پہنچے تو ان کے بھائی رہا ہو کر گھر واپس آچکے تھے۔

قصہ یہ تھا کہ مذکورہ مسلمان کو رخصت کرنے کے بعد فخر الدین علی احمد صاحب نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ فلاں ضلع کے کلکٹر کو ٹیلیفون کرو اور اس سے کہو کہ اِس نام کے ایک صاحب آپ کے یہاں جیل میں ہیں۔ صدر صاحب نے ان کی خیریت پوچھی ہے۔ کلکٹر نے جب یہ سنا تو وہ ڈر گیا۔ وہ سمجھا کہ جس آدمی کو اس نے جیل میں بند کر رکھا ہے، وہ کوئی اہم شخصیت ہے، اسی لئے تو صدر صاحب اس کی خیریت پوچھ رہے ہیں۔ چنانچہ فوراً ان کو جیل سے رہا کر دیا۔

دہلی کے ایک صاحب مجھ سے اکثر کہتے تھے کہ انگریزی اخباروں میں میرے تعلقات ہیں۔ میں مسلم نوجوانوں کو انگریزی اخبارات میں جگہ دلا سکتا ہوں۔ مگر مسلمانوں میں شوق ہی نہیں۔ اس کے بعد میری ملاقات ایک مسلم نوجوان سے ہوئی۔ انھوں نے انگریزی سے ایم اے کیا تھا اور محنتی بھی تھے۔ میں نے ان کو مذکورہ صاحب کے پاس بھیجا۔ انھوں نے نوجوان کو مکتوب الیہ کا نام درج کئے بغیر ایک خط لکھ کر دیا جس کا مضمون یہ تھا: "میں اِن سے براہ راست واقف نہیں۔ آپ ان کا ٹسٹ لے لیں اور اپنے ٹسٹ میں جیسا پائیں اس کے مطابق ان سے معاملہ کریں"۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نوجوان نے اس خط کو استعمال نہیں کیا۔

زندگی میں کرنے کی اہمیت ہے نہ کہ بولنے کی۔ کم بولنا اور زیادہ کرنا، آدمی کو باقیمت بناتا ہے۔ اس کے برعکس زیادہ بولنا اور کم کرنا آدمی کو بے قیمت بنا دیتا ہے۔ بندوں کی نظر میں بھی اور خدا کی نظر میں بھی۔

شعوری دریافت نہیں

ماہر القادری (۱۹۷۸ - ۱۹۰۶) رسالہ فاران (کراچی) کے اڈیٹر تھے۔ اس کے ساتھ وہ مشہور شاعر بھی ہیں۔ ان کا ایک شعر یہ ہے:

پہلے ہر شے کو ہم آواز کیا جاتا ہے پھر کہیں نغمہ کا آغاز کیا جاتا ہے

یہ شعر زندگی کی ایک اہم حقیقت کو بتا رہا ہے اور وہ یہ کہ ہر اقدام سے پہلے تیاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ حالات موافق بنائے بغیر کوئی نتیجہ خیز عمل نہیں کیا جا سکتا۔ اجتماعی زندگی میں کسی واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے مختلف اجتماعی عوامل کو اس کے موافق بنایا جائے۔ ماحول کو "ہم آواز" بنانے سے پہلے جو "نغمہ" چھیڑا جائے وہ عملاً بے معنی شور ہوگا، وہ دلوں کو کھینچنے والا نغمہ نہیں بن سکتا۔

مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ماہر القادری کے لیے یہ صرف ایک شاعرانہ نکتہ تھا، وہ ان کی فکری دریافت نہ تھی۔ کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ انھوں نے خود اپنی زندگی میں اس کے برعکس عمل کیا۔ پاکستان بننے کے بعد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے وہاں ضروری معاشرتی حالات پیدا کیے بغیر "مطالبہ نظام اسلامی" کی ناکام مہم شروع کر دی۔ گویا انھوں نے چیزوں کو ہم آواز کیے بغیر نغمہ کا آغاز کر دیا۔ مگر ماہر القادری نے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی اس بے فائدہ مہم میں ان کی پوری تائید کی۔ حالاں کہ ان کے مذکورہ شعر کا تقاضا تھا کہ وہ ان پر تنقید کریں۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "مشاعرہ" کی سطح پر اچھی اچھی باتیں کہتے ہیں، مگر وہ حقیقی عمل کی سطح پر ان کو اختیار نہیں کر پاتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ باتیں ان کی فکری دریافت نہیں ہوتیں۔ وہ موقع کی مناسبت سے ان باتوں کو لفظی طور پر بول دیتے ہیں مگر وہ ان کے فکر کا حصہ نہیں ہوتی۔ وہ ان کی سوچی سمجھی رائے نہیں ہوتی جس سے ہٹنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔

کسی بات کو شعوری فکر کے طور پر پانا ایک چیز ہے اور تقریر یا تحریر میں لفظی طور پر اس کو بول دینا بالکل دوسری چیز۔ کوئی حقیقت اسی وقت آدمی کے ذہن کا جزء بنتی ہے جب کہ وہ اس کو شعوری طور پر پائے۔ اور کوئی حقیقت آدمی کے عمل میں صرف اس وقت شامل ہوتی ہے جب کہ اس نے اس حقیقت کو شعوری طور پر پایا ہو۔

ایک کہاوت

جاپان کی ایک کہاوت ہے جس کا ترجمہ انگریزی زبان میں اس طرح کیا گیا ہے ـــــ ایک خرگوش کا پیچھا کرو، اور تم اس کو پکڑ لوگے
(Chase one rabbit, and you will get it)

اگر آپ بیک وقت دو خرگوش کو پکڑنا چاہیں تو کیا ہوگا۔ ایک خرگوش پورب کی طرف بھاگ رہا ہوگا اور دوسرا خرگوش پچھم کی طرف۔ آپ کبھی ایک کو پکڑنے کے لیے پورب کی طرف دوڑیں گے اور کبھی دوسرے کو پکڑنے کے لیے پچھم کی طرف۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ دونوں بھاگ کر دور چلے جائیں گے اور آپ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ پکڑ سکیں گے۔ اس کے برعکس جب آپ صرف ایک کی طرف دوڑیں تو آپ کی دوڑنے کی پوری طاقت صرف ایک کی طرف استعمال ہوگی، اور پھر آپ اس کو پکڑنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ معاملہ صرف "خرگوش" کا نہیں بلکہ یہی معاملہ تمام چیزوں کا ہے۔ زندگی میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی کو بظاہر کئی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ ہر ایک کو چاہنے لگتا ہے۔ مگر کئی کو پانے کی کوشش میں وہ ایک کو بھی کھو دیتا ہے۔ حالاں کہ اگر وہ اپنی ساری توجہ صرف ایک پر لگاتا تو یقیناً وہ اس کو حاصل کر لیتا۔

اس کی ایک مثال کشمیر کا مسئلہ ہے۔ انڈیا اور پاکستان کی تقسیم آبادی کی بنیاد پر ہوئی۔ اس اعتبار سے کشمیر کو پاکستان کا حصہ ہونا چاہیے تھا۔ کیوں کہ کشمیر میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس کے باوجود کیا وجہ ہے کہ کشمیر پاکستان کو نہ مل سکا۔ اس کی واحد ذمہ داری پاکستان کے لیڈروں پر جاتی ہے۔

۱۹۴۷ میں جب برصغیر ہند کی تقسیم ہوئی تو پاکستانی لیڈروں نے چاہا کہ وہ حیدرآباد پر بھی قبضہ کریں اور کشمیر پر بھی۔ حیدرآباد پر اس لیے کہ وہاں کا صدر ریاست مسلمان ہے، کشمیر پر اس لیے کہ وہاں کی زیادہ آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہے۔

وہ حیدرآباد کے معاملہ میں صدر ریاست کی منطق کو استعمال کرنا چاہتے تھے۔ اور کشمیر کے معاملہ میں آبادی کی منطق کو۔ یہ گویا دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑنا تھا، اور جو لوگ بیک وقت دو خرگوشوں کے پیچھے دوڑیں، ان کے لیے یہی مقدر ہے کہ وہ ایک کو بھی نہ پکڑ سکیں۔

سو برس

سو سال کا سفر کبھی اس طرح طے نہیں ہوتا کہ ہم اپنے کاغذی کیلنڈر میں سو سال آگے کا ہندسہ لکھ لیں ـــــ جو لوگ حقیقت کے اعتبار سے پیچھے ہوں وہ بڑے بڑے لفظ بول کر آگے نہیں ہو سکتے۔ آگے ہونے کے لئے حقائق کو اپنے مطابق کرنا پڑے گا۔

زمین سورج کے گرد اپنے لمبے مدار پر ایک سو بار گھومتی ہے تب اس کی سو سالہ تاریخ پوری ہوتی ہے۔ یہی انسان کا معاملہ بھی ہے۔ انسان کو بھی اگر کسی دور کی منزل تک پہنچنا ہے تو اس کو لمبی مدت تک اس کی طرف سفر کرنا ہوگا، اس کے بعد ہی وہ اپنی مطلوبہ منزل پر پہنچ سکتا ہے۔

ایک شخص سماج کے اندر اونچا مقام حاصل کرنا چاہتا ہے تو اس کو پہلے ضروری جدوجہد کرکے اس کے تمام اسباب جمع کرنے ہوں گے، اس کے بعد ہی اس کو واقعی معنوں میں اونچا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک قوم کو ترقی یافتہ قوم بنانا ہے تو پہلے اس کو تیاری کے مرحلہ سے گزرنا ہوگا۔ ضروری تیاری کے مرحلوں کو پورا کئے بغیر وہ ایک ترقی یافتہ قوم نہیں بن سکتی۔

ترقی اور کامیابی ہمیشہ کسی تیاری کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پہلے تیاری کی جاتی ہے، اس کے بعد اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے۔ اگر آپ چاہیں کہ تیاری کے بغیر اس کا نتیجہ پالیں تو موجودہ دنیا میں یہ بالکل ناممکن ہے۔ آپ نتیجہ سے اپنی زندگی کا سفر شروع نہیں کر سکتے۔ زندگی کا سفر جب بھی شروع ہوگا تو وہ تیاری سے شروع ہوگا، ورنہ کبھی شروع ہی نہ ہوگا۔

لوگ کسی کی ترقی کو دیکھ کر حسد کیوں کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ تیاری کو حذف کرکے نتیجہ کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح جب انھیں نتیجہ نہیں ملتا تو وہ دوسرے شخص سے جلن میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالاں کہ اگر وہ دوسرے شخص کی طرح ضروری تیاری کرتے تو یقیناً وہ بھی اسی نتیجہ کو پالیتے جس کو دوسرے شخص نے پایا ہے۔

اگر آپ سو سال کا سفر طے کرنا چاہتے ہیں تب بھی آپ کو ایک ایک دن کی رفتار سے آگے بڑھنا ہوگا۔ کاغذ کے اوپر آپ کوئی بھی اپنا دل پسند لفظ لکھ سکتے ہیں۔ مگر حقیقت کی دنیا کو اپنی پسند کے مطابق بنانے کے لئے حقیقی جدوجہد کے سوا کوئی اور صورت نہیں۔

سنتِ صبر

صبر کیا ہے، صبر یہ ہے کہ جذبات یا اشتعال کے موقع پر اپنے آپ کو تھاما جائے۔ جوابی کارروائی کرنے سے پہلے اپنے جذبات کو روک کر یہ سوچا جائے کہ میرے لیے اس موقع پر صحیح ردعمل کیا ہے اور زیادہ نتیجہ خیز کارروائی کیا ہو سکتی ہے۔

کبھی جذبات کو روک لینے کا نام صبر ہے، کبھی صبر اس کا نام ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو جوابی اقدام سے باز رکھا جائے اور کبھی صبر یہ ہوتا ہے کہ اقدام تو کیا جائے مگر وہ منصوبہ بند اقدام ہو نہ کہ محض جذباتی اقدام۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایک مخالف اگر کسی کو نقصان پہنچائے تو وہ اس پر صبر کرلے یا وہ اس کا توڑ کرنے کی کوشش کرے۔

جواب یہ ہے کہ صبر کا مطلب خواہ مخواہ نقصان اٹھانا نہیں ہے۔ صبر کا مطلب یہ ہے کہ غیر موافق صورت حال پیش آنے کے بعد ٹھنڈے ذہن سے آپ یہ سوچیں کہ آپ کا جوابی اقدام آپ کے حق میں کوئی مثبت نتیجہ پیدا کرے گا یا آپ کے نقصان میں مزید اضافہ کا سبب بن جائے گا، صبر کا مطلب اپنے آپ کو مزید نقصان سے بچانا ہے نہ کہ غیر ضروری طور پر اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا۔

صبر کبھی عمل کا نام ہوتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو عمل سے روک لینے کا، یہ دراصل حالات ہیں جو فیصلہ کرتے ہیں کہ کس موقع پر کون سا صبر مطلوب ہے۔

صبر اور بے صبری میں یہ فرق ہے کہ بے صبر آدمی نتیجہ پر غور کیے بغیر حالات کے طوفان میں کود پڑتا ہے۔ اور صبر والا آدمی صورت حال پیش آجانے کے بعد پہلے سنجیدگی کے ساتھ غور کرتا ہے، لوگوں سے مشورہ کرتا ہے، اور سوچے سمجھے فیصلہ کے تحت وہ کارروائی کرتا ہے جو زیادہ سے زیادہ نتیجہ خیز ہو سکے۔

صبر حکمتِ عمل کا نام ہے اور بے صبری یہ ہے کہ آدمی وقتی کیفیت سے متاثر ہو کر ایسا اقدام کر بیٹھے جس کا حکمت اور دور اندیشی سے کوئی تعلق نہ ہو۔

بدخواہی نہیں

کوئی بھی شخص اتنا طاقت ور نہیں کہ وہ اپنا برا کئے بغیر دوسرے کا برا کر سکے ——— ہر برائی سب سے پہلے اپنے لئے برائی ہے۔ اس کے بعد ہی وہ کسی دوسرے کے لئے برائی بن سکتی ہے۔

آپ کسی کی ترقی کو روکنا چاہیں تو سب سے پہلے اپنے اندر حسد پیدا کرنا ہوگا۔ اپنے اندر حسد کی آگ بھڑکانے کے بعد ہی آپ دوسرے کی ترقی کے خلاف کوئی سازش کر سکتے ہیں۔ آپ کسی کو مارنا چاہیں تو سب سے پہلے اپنے سینہ کو تخریب کاری کا اڈہ بنانا پڑے گا۔ اس کے بعد ہی آپ کسی کو اپنے تخریبی منصوبہ کا نشانہ بنا سکتے ہیں۔

اس دنیا میں سب سے بڑی برائی دوسرے کا برا چاہنا ہے۔ کیوں کہ آپ خواہ دوسرے کا برا نہ کر سکیں، مگر اپنا برا یقیناً آپ کر لیتے ہیں۔ دوسرے کو تباہ کرنا کسی آدمی کے اختیار میں نہیں۔ مگر جب کوئی شخص کسی دوسرے کی تباہی کا نقشہ بناتا ہے تو وہ اپنے آپ کو یقیناً تباہ کر لیتا ہے۔

اگر آپ کسی دوسرے کو نقصان پہنچانا چاہیں تو یہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ آپ دوسرے کے خلاف سوچیں۔ اس کے خلاف نقصان کی تدبیریں کریں۔ اپنی کوششوں کو منفی رخ پر چلانا شروع کر دیں۔ یہ تمام چیزیں اپنی تباہی کا سامان ہیں۔ یہ دوسرے کی بدخواہی کی خاطر خود اپنی ذات کا بدخواہ بننا ہے۔

اگر آپ دوسرے کے خلاف اپنے اقدام میں کامیاب ہو جائیں تب بھی دوسرے کو نقصان پہنچانے کے لئے آپ خود اپنے جان و مال کا بہت سا نقصان کرتے ہیں۔ دوسرے کو زخم پہنچانے کی کوشش میں خود اپنے آپ کو بھی زخمی کر چکے ہوتے ہیں۔ پھر ایسی کارروائی سے کیا فائدہ۔

دوسرے کی بدخواہی صرف دوسرے کی بدخواہی نہیں، اسی کے ساتھ وہ خود اپنی بدخواہی بھی ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ اگر وہ دوسرے کا خیر خواہ نہیں بن سکتا تو اپنی ذات کا خیر خواہ بنے۔ وہ دوسرے کو دینا نہیں چاہتا تو کم از کم اپنے آپ کو محروم نہ کرے۔ وہ دوسرے کے لئے جینا نہیں چاہتا تو اپنے آپ کے لئے جئے۔

زندگی کا معاملہ

بازار میں تمام چیزیں ضروری قیمت دینے کے بعد ملتی ہیں۔ بازار کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے —— جتنا دینا، اتنا پانا۔ نہ اس سے کم اور نہ اس سے زیادہ۔ یہی اصول پوری انسانی زندگی کے لیے بھی ہے۔ کسی نے بالکل درست کہا ہے کہ تم دنیا کو اپنا بہترین دو، اور تمہاری طرف بھی دنیا کا بہترین واپس آئے گا :

Give the world the best you have, and the best will come back to you.

اگر آپ لوگوں کے خیر خواہ ہوں تو لوگ بھی آپ کے خیر خواہ ہوں گے۔ اگر آپ لوگوں سے میٹھا بول بولیں تو لوگوں کی طرف سے بھی آپ کو میٹھے بول کا تحفہ ملے گا۔ آپ لوگوں کے ساتھ محبت کرنے والے بنیں تو لوگ بھی آپ کے ساتھ محبت کرنے والے بن جائیں گے۔

یہ دنیا لین دین کی دنیا ہے۔ یہاں آدمی وہی پاتا ہے جو اس نے دوسروں کو دیا ہو۔ یہاں دوسرے لوگ کسی آدمی کے لیے وہی کچھ ثابت ہوتے ہیں جو کہ وہ خود دوسروں کے لیے ثابت ہوا ہو۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے اچھا ماحول پانا آدمی کے اپنے اختیار میں ہے۔ آپ دوسروں کے دوست بن جائیے، اس کے بعد آپ کو بھی دوستوں سے بھرا ہوا ماحول مل جائے گا۔ آپ دوسروں کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کیجئے، اس کے بعد آپ بھی اپنے گرد و پیش ایسے پڑوسی پالیں گے جو آپ کی ناخوش گوار باتوں کو برداشت کریں۔ آپ دوسروں کو فائدہ پہنچائیے، اس کے بعد آپ کو بھی زندگی گزارنے کے لیے ایسی دنیا مل جائے گی جہاں ہر ایک آپ کو فائدہ پہنچانے میں مصروف ہوگا۔

اگر آپ پھول بن کر رہنا جانتے ہوں تو آپ خود بخود اپنے رہنے کے لیے پھولوں کی کیاری پالیں گے۔ اور اگر آپ کے وجود کے ساتھ کانٹے لگے ہوئے ہوں تو اس کے بعد آپ کو زندگی گزارنے کے لیے جو دنیا ملے گی وہ صرف کانٹوں کا جھاڑ جھنکاڑ ہوگا۔

یہ انسان

علامہ شامی نے لکھا ہے کہ کوئی شخص سیادت نہیں کرسکتا جب تک ایسا نہ ہو کہ اس کے کچھ محبین ہوں جو اس کی مدح کریں اور کچھ حاسدین ہوں جو اس کی مذمت کریں (لَا یَسُودُ سَیِّدٌ بِدُونِ وَ دُودٍ یَمدَحُ وحسودٍ یَقدَحُ)

اصل یہ ہے کہ یہ دنیا دار الامتحان ہے۔ اس دنیا میں جو واقعہ ہوتا ہے اس میں امتحان کی مصلحت لازمی طور پر شامل رہتی ہے۔ یہی معاملہ کسی صاحبِ سیادت شخص کا ابھرنا ہے۔ ایک سچا انسان جب اللہ کی توفیق سے سیادت و قیادت کے میدان میں ابھرتا ہے تو وہ پورے معاشرہ کے لیے امتحان کا ایک پرچہ بن جاتا ہے۔

اب جو لوگ طالبِ حق ہیں، جن کے اندر سچائی کو پانے کی خواہش موجود ہے۔ جو حق کو سب سے بڑا درجہ دیے ہوئے ہیں، حتیٰ کہ اپنی ذات سے بھی زیادہ۔ وہ پیشگی طور پر نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوتے ہیں۔ وہ ابھرنے والے قائد کو اپنے دل کی آواز سمجھ کر قبول کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے درمیان وہ محبوب کا درجہ حاصل کرلیتا ہے۔ وہ دل سے اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ اس کو دعائیں دیتے ہیں۔ وہ اپنے بہترین الفاظ اور بہترین جذبات اس کے لیے وقف کر دیتے ہیں۔

اس کے برعکس معاملہ ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اپنی ذاتی بڑائی میں جی رہے ہوں۔ جو حق کے طالب نہ ہوں بلکہ اپنی خواہش نفس کے طالب ہوں۔ ایسے لوگ جب کسی کو ابھرتا ہوا دیکھتے ہیں تو وہ فوراً حسد میں مبتلا ہوجاتے ہیں۔ وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ اس شخص کے قد کا بڑھنا گویا میرے قد کا چھوٹا ہونا ہے۔ یہ لوگ حسد کی آگ میں بھڑک اٹھتے ہیں۔ وہ اپنے دائرہ سے باہر ابھرنے والے شخص کی مذمت پر کمر بستہ ہوجاتے ہیں۔ وہ اس کے خلاف جھوٹے الزام لگاتے ہیں۔ وہ اس کو نیچا دکھانے کے لیے ہر وہ پست حرکت کرنے پر تُل جاتے ہیں جو ان کے بس میں ہو —— ہر صاحب سیادت آدمی ایک امتحان ہے۔ اس امتحان میں ایک قسم کے لوگ کامیاب ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے لوگ ناکام۔

دو طریقے

اس دنیا میں کامیابی کا واحد راز یہ ہے کہ ممکن سے اپنے عمل کا آغاز کیا جائے، اور ناکامی کا واحد سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اپنی قوت اور طاقت کو ناممکن کے حصول میں لگا دیا جائے۔ انسانوں کی کامیابی اور ناکامی کی پوری تاریخ انھیں دو اصولوں کی تفصیل وتشریح ہے۔

اس کو دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ متشددانہ طریق کار آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور پر امن طریق کار کامیابی کی طرف۔ متشددانہ طریق کار ہمیشہ بے صبری کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں پرامن طریق کار وہ لوگ اختیار کرتے ہیں جو نزاعی معاملات میں صبر وتحمل کا ثبوت دے سکیں۔ امن کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے، اور صبر آدمی کو اس قابل بناتا ہے کہ وہ امن کی طاقت کو کامیاب طور پر استعمال کر سکے۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ کیا ہونا چاہئے، اور کیا ہو سکتا ہے کے درمیان فرق نہیں کر پاتے۔ وہ اپنی شعوری ناپختگی کی وجہ سے اپنی خواہشوں کے پیچھے دوڑ پڑتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ وہ منزل کی طرف اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر میں انھیں معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے صرف وقت ضائع کیا۔ اپنے وقت اور اپنی طاقت کو آخری حد تک استعمال کرنے کے باوجود وہ کچھ بھی حاصل نہ کر سکے۔

انسان پیدائشی طور پر معیار پسند ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے ذہن میں ایک معیاری دنیا کا تصور بسا ہوا ہے۔ مگر دوسری ناگزیر حقیقت یہ ہے کہ اس دار الامتحان میں کسی شخص کے لئے یہ ممکن نہیں کہ وہ اپنی معیاری دنیا کو حاصل کر سکے۔ عملی طور پر جو چیز ممکن ہے وہ صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے پسندیدہ معیار سے کم کو لینے پر راضی ہو جائے۔ وہ کیا ہونا چاہئے کو چھوڑ کر کیا ہو سکتا ہے کو اپنا عملی نشانہ بنائے۔

جب آپ وہ چیز حاصل کرنا چاہیں جو ممکن نہیں ہے تو آپ کے اندر جھنجھلاہٹ اور تشدد پیدا ہوگا۔ لیکن جب آپ ممکن کو حاصل کرنے کے لئے اٹھیں تو آپ کے اندر یقین ہوگا۔ آپ کی جدوجہد پُرامن دائرہ میں جاری ہوگی۔ پہلی صورت میں آپ کی پوری سوچ منفی سوچ بن جائے گی، اور دوسری صورت میں آپ کی سوچ مثبت سوچ بنے گی۔ اعلیٰ انسانی صفات آپ کے اندر پرورش پائیں گی۔

انتقام نہیں

انتقام لینے سے پہلے سوچ لو کہ انتقام کا بھی انتقام لیا جائے گا ——— یہ زندگی کی ایک اہم حقیقت ہے، اور جو شخص موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی گزارنا چاہتا ہو، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اس حقیقت کا پورا لحاظ کرے۔

ایک شخص سے آپ کو تکلیف پہنچی۔ آپ کے دل میں اس کے خلاف انتقام کا جذبہ بھڑک اٹھا۔ آپ چاہنے لگے کہ اس سے بدلہ لے کر اپنے سینہ کی آگ ٹھنڈی کریں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک شخص کے تکلیف دینے سے آپ کے اندر انتقام کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ پھر وہی تکلیف جب آپ دوسرے آدمی کو دیں گے تو کیا اس کے اندر دوبارہ وہی انتقامی جذبہ نہیں پیدا ہو جائے گا۔

یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ آپ کے انتقام کے بعد وہ بھی انتقام لے گا۔ اس طرح برائی کا ایک چکر چل پڑے گا۔ آپ کو ایک تکلیف کے بعد دوسری تکلیف سہنی پڑے گی۔ اس لئے عقلمندی یہ ہے کہ نظر انداز کرنے کا طریقہ اپنا کر بات کو پہلے ہی مرحلہ میں ختم کر دیا جائے۔

جب آپ کسی سے انتقام لیں تو یہ کوئی سادہ بات نہیں ہوتی۔ انتقام لینے کے لئے آپ کو اپنی طاقت خرچ کرنی پڑتی ہے۔ وقت اور پیسہ کی کافی مقدار خرچ کئے بغیر کوئی شخص کسی دوسرے آدمی سے انتقام نہیں لے سکتا۔

اب اگر انتقام لینے والا اپنے انتقام کے منصوبہ میں کامیاب ہو جائے تب بھی یہ اپنا کچھ اور اثاثہ کھونے کی قیمت پر ہوتا ہے۔ انتقام لے کر آدمی آخر میں جو چیز پاتا ہے، وہ صرف ایک نفسیاتی تسکین ہے، اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

لیکن اسی وقت اور اسی رقم کو اگر کسی مثبت کام (مثلاً کاروبار) میں لگایا جائے تو وہ شکل بدل کر محفوظ رہتا ہے، یہاں تک کہ مزید نفع کے ساتھ آدمی کی طرف لوٹتا ہے۔ انتقام لینے میں طاقت لگانا طاقت کو کھونا ہے۔ مثبت کام میں طاقت لگانا طاقت کو اضافہ کے ساتھ دوبارہ پالینا ہے۔ ایسی حالت میں آدمی کو اپنا اثاثہ پانے کی مد میں خرچ کرنا چاہئے نہ کہ کھونے کی مد میں۔

حوصلہ مندی

سب کچھ کھونے کے بعد بھی اگر آپ کے اندر حوصلہ باقی ہے تو سمجھ لیجئے کہ ابھی آپ نے کچھ نہیں کھویا ـــــ حوصلہ بلاشبہ سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے۔ بلکہ حوصلہ ہی زندگی میں سب کچھ ہے۔

آدمی کا اصل سرمایہ اس کا حوصلہ ہے۔ آدمی حوصلہ ہی کی بنیاد پر بڑی بڑی بات سوچتا ہے۔ حوصلہ ہی کے ذریعہ وہ اقدام کرتا ہے۔ حوصلہ ہی کے بل پر وہ جوکھم میں کودتا ہے۔ حوصلہ ہی کے سہارے وہ مشکلات پر قابو پاتا ہے۔ حوصلہ ہی کی مدد سے وہ زندگی کے اتار چڑھاؤ میں ثابت قدم رہتا ہے۔ حوصلہ ہی آدمی کے اندر اعلیٰ کردار پیدا کرتا ہے جو تمام ترقیوں اور کامیابیوں کو پانے کا واحد ذریعہ ہے۔

حوصلہ مند انسان وہ ہے جو سطحی باتوں سے اوپر اٹھ کر سوچ سکے۔ جو ماحول سے غیر متاثر رہ کر اپنی رائے بنائے۔ خطرات جس کا راستہ نہ روکیں اور نقصانات جس کو دل شکستہ نہ کر سکیں۔ جو اپنے آپ میں جینے کی طاقت رکھتا ہو، خواہ تمام لوگ اس کا ساتھ چھوڑ دیں، خواہ اسباب کے نام کی کوئی چیز اس کے پاس باقی نہ رہے۔

بے حوصلگی سب سے بڑی کمزوری ہے اور حوصلہ سب سے بڑی طاقت۔ آدمی اگر بے حوصلہ ہو جائے تو ۹۹ چیز رکھتے ہوئے بھی وہ ایک چیز کھونے کی خاطر اپنا خاتمہ کر لے گا۔ اور اگر وہ اپنے حوصلہ کو باقی رکھ سکے تو وہ ۹۹ چیزیں کھو کر ایک چیز کے بل پر دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو جائے گا۔

بے حوصلہ آدمی مرا ہوا آدمی ہے، اور حوصلہ مند آدمی زندہ آدمی۔ بے حوصلہ آدمی جس چیز کو مشکل سمجھتا ہے، حوصلہ مند آدمی اس کو اپنے لئے زینہ بنا لیتا ہے۔ بے حوصلہ آدمی جہاں ایک عذر لے کر رک جاتا ہے، حوصلہ مند آدمی وہاں سے اپنے لئے آگے بڑھنے کا نیا راستہ پا لیتا ہے۔ بے حوصلہ انسان کی نظر واقعات کے تاریک پہلو پر ہوتی ہے اور حوصلہ مند انسان کی نظر واقعات کے روشن پہلو پر۔

ترقیوں کی تاریخ حوصلہ مند انسانوں کے عمل کی تاریخ کا دوسرا نام ہے۔

بڑا دل

بڑے دل والا آدمی ہمیشہ کامیاب ہوتا ہے، اور چھوٹے دل والا آدمی ہمیشہ ناکام —— اس دنیا میں کامیابی کسی کو اس کے دل کے پیمانہ سے ملتی ہے۔ یہاں کامیابی کا اصول یہ ہے کہ جتنا بڑا دل اتنی ہی بڑی کامیابی۔

اس دنیا میں کوئی قابل ذکر کامیابی حاصل کرنے کے لئے قریبی حالات سے اوپر اٹھ کر سوچنا پڑتا ہے۔ لوگوں کے سلوک سے بلند ہو کر ان کے ساتھ معاملہ کرنا ہوتا ہے۔ لوگوں کو یہ خیال کئے بغیر دیا جاتا ہے کہ انھوں نے ہم کو کیا دیا اور کیا نہیں دیا۔

اس قسم کا کردار بڑے دل کے بغیر ممکن نہیں، اس لئے اس دنیا میں بڑے دل کے بغیر کوئی بڑی کامیابی بھی کسی کو ملنے والی نہیں۔ خواہ ایک ملک ہو یا دوسرا ملک، خواہ ایک زمانہ ہو یا دوسرا زمانہ، ہر مقام پر اور ہر جگہ کے لئے یہی ایک اصول ہے۔ اس میں کسی کا کوئی استثناء نہیں۔

جو آدمی چھوٹے دل کا ہو وہ ذرا ذرا سی بات میں لوگوں کے خلاف شکایت لے کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ ان معمولی باتوں میں الجھ جاتا ہے جو اس قابل ہوتی ہیں کہ ان کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ایسا آدمی راستہ کے درمیان میں اٹک کر رہ جائے گا۔ وہ آخری منزل تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس کے برعکس جو آدمی راستہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے نہ الجھے، وہ کامیابی کے ساتھ اپنا سفر جاری رکھتا ہے۔ وہ اپنی دل جمعی کو ہر حال میں باقی رکھتا ہے۔ وہ کسی بھی تلخ تجربہ سے بے حوصلہ نہیں ہوتا۔ ایسے آدمی کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ اپنی منزل پر پہنچ کر رہے۔ وہ پستیوں سے گزر کر آخری بلندی تک پہنچ جائے۔

اس دنیا میں آدمی دل کی طاقت سے جیتتا ہے۔ زندگی کی جدوجہد میں جو آدمی بے دل ہو جائے وہ اپنی ملی ہوئی صلاحیتوں کو بھی کھو دے گا۔ اور جو آدمی ہر حال میں اپنے دل کو بھرپور رکھے وہ اپنی صلاحیتوں میں مزید اضافہ کر لے گا۔

تمام کامیابیوں کا اصل میدان آدمی کا اپنا دل ہے۔ آپ باہر کی دنیا کو نہ دیکھئے بلکہ اپنے دل کی دنیا کو دیکھئے۔ اپنے اندر ہی آپ وہ سب کچھ پا سکتے ہیں جس کو آپ پانا چاہتے ہیں۔

کل اور آج

ہر آدمی اپنے گزشتہ کل کو کھو چکا ہے، کامیاب وہ ہے جو اپنے آج کو نہ کھوئے ـــــ پچھلا دن جا چکا۔ اب تو آپ کے پاس صرف آج ہے۔ پھر آج کو آپ کیوں کھوئیں۔

اکثر لوگوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنے پچھلے کل کو استعمال نہ کر سکے تو اپنے آج کے دن اس کا افسوس لے کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ کل کی خاطر آج کو بھی کھونا ہے۔ نہ ملے ہوئے کی فکر میں ملے ہوئے کو بھی برباد کر دینا ہے۔ عقل مند آدمی وہ ہے جو اپنے آپ کو اس دہرا نقصان سے بچائے۔

اگر آپ کا پچھلا کل کھو گیا ہے تو اس کو کھویا ہوا نہ سمجھئے، اس کو تجربہ سیکھنے کا ذریعہ بنا لیجئے۔ اس طرح آپ کا کھویا ہوا سرمایہ بھی پایا ہوا سرمایہ بن جائے گا۔ ماضی کے تجربہ کے سرمایہ کو اپنی حال کی پونجی میں ملا دیجئے۔ اور پھر آپ دیکھیں گے کہ آپ کی کھوئی ہوئی چیز بھی مزید اضافہ کے ساتھ آپ کو دوبارہ مل گئی ہے۔

پچھلے کل کا غم کرنا گویا اپنی صلاحیت کے ایک حصہ کو ضائع کر دینا ہے۔ آپ ایسی غلطی کیوں کریں۔ آپ نئے دن میں اپنی ادھوری صلاحیت کے ساتھ کیوں داخل ہوں۔ پچھلے کل کے غم سے اپنے دماغ کو خالی کر دیجئے اور اپنی پوری طاقت کو لے کر اپنے نئے دن کے منصوبہ میں لگ جائیے۔ یہی کامیاب زندگی کا صحیح طریقہ ہے۔

آپ خواہ کتنا ہی زیادہ گزشتہ کل کی فکر کریں، گزشتہ کل اب دوبارہ آپ کی طرف واپس آنے والا نہیں۔ جانے والی چیز جا چکی، رہنے والی چیز باقی ہے۔ جانے والی چیز کو بھلا دیجئے اور رہنے والی چیز کو اپنی پوری طاقت کے ساتھ پکڑ لیجئے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا واحد راز ہے۔ یہاں کامیابی حاصل کرنے کا دوسرا کوئی طریقہ نہیں۔

پچھلے کل کا محاسبہ کرنا بہت ضروری ہے، مگر پچھلے کل پر غم کرنا اتنا ہی بے فائدہ ہے۔ آپ یہ ضرور دیکھئے کہ پچھلے کل کو آپ نے کیا پایا اور کیا کھویا۔ مگر یہ دیکھنا نصیحت کے لئے ہو نہ کہ افسوس کرنے کے لئے۔

آج کو استعمال کیجئے۔ کیونکہ گزرا ہوا کل تو اب کبھی واپس آنے والا نہیں۔

اگلا پیراگراف

زندگی ایک طویل اکتا دینے والی کہانی ہے۔ اس کہانی کو صرف وہی شخص کامیابی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے جس کی توجہ ہمیشہ کہانی کے اگلے پیراگراف پر لگی رہے ـــــ ہر آدمی کی زندگی اسی قسم کی ایک کہانی ہے، خواہ وہ چھوٹا آدمی ہو یا بڑا آدمی۔ خواہ وہ معمولی حالات میں زندگی گزار رہا ہو یا اونچے اور شاندار حالات میں۔

حقیقت یہ ہے کہ زندگی ایک تلخ تجربہ کا نام ہے۔ کھوئے ہوئے مواقع کا افسوس، گزرے ہوئے حادثات کی تلخیاں، لوگوں کی طرف سے پیش آنے والے برے سلوک کی یاد، اپنی کمیوں اور تنگیوں کی شکایت، غرض بے شمار چیزیں ہیں جو آدمی کی سوچ کو منفی رخ کی طرف لے جاتی ہیں۔ آدمی اگر ان باتوں کا اثر لے تو اس کی زندگی ٹھٹھر کر رہ جائے گی۔

ایسی حالت میں عقل مندی یہ ہے کہ آدمی پیچھے دیکھنے کے بجائے آگے کی طرف دیکھے۔ وہ گزرے ہوئے دنوں کے بجائے آنے والے دن پر اپنی نظریں جمائے رکھے۔

ہر آدمی اپنے قول و عمل سے اپنی زندگی کی کہانی لکھ رہا ہے۔ مگر اس کو خود نہیں معلوم کہ اس کہانی میں کون سے مراحل پیش آئیں گے، اور نہ کوئی شخص یہ جانتا کہ یہ کہانی کہاں جا کر ختم ہوگی۔ اس لئے لازم ہے کہ آدمی ہر سامنے آنے والے مرحلہ کا استقبال کرے۔ کہانی کے اگلے ابواب لکھنے کی کوشش میں وہ آگے ہی بڑھتا چلا جائے۔

زندگی میں اصل اہمیت یہ نہیں ہے کہ اس نے کیا پایا۔ اصل اہمیت کی بات یہ ہے کہ وہ کیسے جیا۔ یہ ممکن ہے کہ ایک کم آمدنی والا شخص اچھی زندگی گزارے اور ایک دولت مند آدمی بری زندگی گزار کر مر جائے۔ ایک جاہل آدمی اپنے معاملات میں زیادہ سمجھ داری کا ثبوت دے اور ایک پڑھا لکھا آدمی اپنے معاملات کو سلجھانے میں بے سلیقہ ثابت ہو۔

یہ نہ دیکھئے کہ آپ زندگی میں کیا حاصل کر رہے ہیں۔ یہ دیکھئے کہ آپ زندگی کس طرح گزار رہے ہیں۔ جس شخص کو اچھی زندگی گزارنا آجائے وہی وہ شخص ہے جو دنیا میں کامیاب رہا۔ وہی وہ شخص ہے جس نے اپنے آپ کو اپنے مستقبل تک پہنچایا۔

مسائل اور مواقع

مسائل کو مستقبل کے خانہ میں ڈالنا اور مواقع کو استعمال کرنا، یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا اصل راز ہے ــــــ اس دنیا میں ہمیشہ مسائل بھی ہوتے ہیں اور اسی کے ساتھ مواقع بھی۔ اس دنیا میں صرف وہ لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو مسائل کو نظرانداز کریں اور مواقع کو استعمال کرکے آگے بڑھ جائیں۔

مسائل کا حل مسائل سے لڑنا نہیں ہے، بلکہ مواقع کو استعمال کرنا ہے۔ جب بھی آپ کو مسائل کا سامنا پیش آئے تو یہ دیکھئے کہ مسائل کے باوجود وہ کون سے امکانات ہیں جو اب بھی آپ کے لئے پوری طرح موجود ہیں اور جن میں آپ آزادانہ طور پر عمل کرسکتے ہیں۔

ان امکانات کو دریافت کرکے اپنی طاقتوں کو ان میں لگا دیجئے۔ اگر آپ ایسا کریں تو جلد ہی آپ دیکھیں گے کہ امکانات کو استعمال کرنے کے بعد مسائل اپنے آپ حل ہوتے جارہے ہیں۔ جو کچھ حاصل ہوسکتا ہے، اس کو حاصل کرکے آپ اس کو بھی پا لیتے ہیں جو پہلے آپ کو ملا ہوا نہیں تھا۔

زندگی میں ساری اہمیت عمل کی ہے، اور عمل صرف ممکن دائرہ میں کیا جاسکتا ہے، ناممکن دائرہ میں عمل کرنا کبھی ممکن نہیں ہوتا۔ جب آپ ممکن دائرہ میں اپنا عمل شروع کریں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی عملی قوتوں کو وہاں لگا رہے ہیں جہاں ان قوتوں کو نتیجہ خیز طور پر لگانا ممکن ہے۔ ایسی محنت کبھی نہ کبھی اپنا نتیجہ ظاہر کرکے رہتی ہے۔

اس کے برعکس جب آپ مسائل سے الجھیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ اپنی عملی قوت کو وہاں لگا رہے ہیں جہاں عمل کے باوجود کوئی نتیجہ پانا ممکن نہیں۔ ایسی محنت کے لئے یہی مقدر ہے کہ وہ بے فائدہ طور پر رائیگاں ہو کر رہ جائے۔

مسائل بذات خود کوئی چیز نہیں، اصل توجہ کی چیز مواقع ہیں۔ مواقع میں توجہ اور محنت صرف کرکے آپ مستقبل میں اپنے مسائل پر بھی قابو پا لیتے ہیں۔ لیکن اگر مسائل میں الجھے رہیں تو دونوں میں سے کوئی چیز بھی آپ کو ملنے والی نہیں۔

گر کر اٹھنا

نہ گرنا کمال نہیں۔ کمال یہ ہے کہ تم گرو، اور پھر از سرِ نو اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ ——— جو شخص نہیں گرا، اس نے کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا۔ کارنامہ انجام دینے والا وہ ہے جو گرے اور پھر اٹھ کر چلنے لگے۔

جو آدمی نہیں گرا وہ حقیقۃً چلا ہی نہ تھا۔ کیوں کہ اس دنیا میں ہر چلنے والا گرتا ہے۔ پھر ایسے نہ گرنے کی کیا قیمت۔ انسان کی شان اسی میں ہے کہ وہ چلے۔ انسان چلنے کے لئے بنایا گیا ہے، وہ بیٹھنے کے لئے نہیں بنایا گیا۔ اور جب وہ چلے گا تو ضرور ہے کہ اس کے ساتھ گرنے کا واقعہ بھی پیش آئے۔

نہ گرنا ٹھہراؤ کی علامت ہے اور گرنا حرکت اور عمل کی علامت۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ اپنے گرنے پر شرمندہ نہ ہو بلکہ اِس کو اپنی اعلیٰ انسانیت کا ثبوت سمجھے کہ اُس کے ساتھ گرنے کا واقعہ پیش آیا۔ جب وہ اس طرح سوچے گا تو وہ گرنے کے بعد فوراً اٹھ کر دوبارہ کھڑا ہو جائے گا۔

نہ گرنا کمال نہیں، کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ نہ چلنا کمال نہیں۔ از سرِ نو اٹھنا کمال ہے، کا مطلب یہ ہے کہ چلتے رہنا کمال ہے۔ کیوں کہ جو شخص ٹھہرا رہے، وہی گرنے سے بچے گا۔ چلنے والوں کا معاملہ اس دنیا میں یہی ہے کہ وہ بار بار گرتے ہیں اور پھر بار بار اٹھ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آدمی جب گرتا ہے اور پھر دوبارہ اٹھ کر چلنے لگتا ہے تو وہ اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ گرنا اس کے لئے نئے حوصلہ کا ذریعہ بن گیا۔ گر کر اس نے دوبارہ اپنے لئے ایک نئی طاقت حاصل کر لی۔

بیٹھنے کے بجائے چلئے، اور چلنے کے بعد جب گریں تو اٹھ کر کھڑے ہو جائیے۔ یہی اس دنیا میں کامیابی کا راز ہے۔ آپ اپنے لئے نئی دنیا نہیں بنا سکتے، اس لئے آپ گرنے سے بھی اپنے آپ کو نہیں بچا سکتے۔ کیوں کہ دنیا کو بنانے والے نے اس دنیا کو اسی طرح بنایا ہے۔

تاخیر نہ کہ ناکامی

شکست تاخیر ہے ، مگر شکست ناکامی نہیں ______ شکست کسی کے لئے ایک درمیانی وقفہ ہے ، وہ اس کا آخری انجام نہیں ۔ ایسی حالت میں شکست سے مایوس ہونے کی کیا ضرورت۔

زندگی کا سفر کبھی ہمواری کے ساتھ طے نہیں ہوتا۔ زندگی میں اتار چڑھاؤ آنا لازمی ہے۔ مختلف اسباب سے کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی نقصان اٹھاتا ہے یا ہار جاتا ہے۔ مگر زندگی میں ہر نقصان یا ہار کی حیثیت وقتی واقعہ کی ہے۔ آپ ایسے واقعہ سے بد دل نہ ہوں۔ اور اپنی کوشش جاری رکھیں۔ آج نہیں تو کل آپ یقینی طور پر کامیاب ہو جائیں گے۔

نقصان صرف نقصان نہیں یا ہار نا صرف ہار نا نہیں۔ ان میں فائدہ کا پہلو بھی ہے۔ نقصان یا ہار کا واقعہ جب پیش آتا ہے تو اس سے آدمی کو بہت سے نئے تجربے حاصل ہوتے ہیں۔ اس کی صلاحیتیں از سر نو جاگ اٹھتی ہیں۔ اس طرح نئی چیز کو پانا ، کھوئی ہوئی چیز کی تلافی بن جاتا ہے۔

ابتدا ، میں جب کوئی شکست پیش آتی ہے تو فوری طور پر آدمی جھنجھلا اٹھتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے عمل کو جاری رکھے تو نئی کامیابیاں اس کو جلد ہی اتنی زیادہ خوشی اور اطمینان دے دیں گی کہ پچھلی بات اس کو یاد بھی نہیں رہے گی۔ فتح کی خوشی شکست کے سارے غم کو بہت جلد بھلا دے گی۔

آدمی کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ آگے کی طرف دیکھے۔ وہ آج کے بجائے کل پر اپنی نظریں جمائے رہے۔ جو شخص ایسا کرے گا ، اس کے لئے وقتی ناخوش گواریوں کو جھیلنا آسان ہو جائے گا۔ آنے والی جیت کی خاطر وہ آج کی ہار کو بھول جائے گا۔ شام اس کے لئے شام نہ ہوگی ، بلکہ سادہ طور پر وہ صبح کا انتظار بن جائے گی۔

وقتی شکست کا پیش آنا لازمی طور پر آپ کی کوتاہی نہیں ، وہ فطرت کے عمومی قانون کی بنا پر ہے۔ یہ دنیا اسی ڈھنگ پر بنائی گئی ہے کہ یہاں فتح کے ساتھ شکست بھی پیش آئے ، یہاں کامیابی کے ساتھ آدمی کو ناکامی کا بھی تجربہ ہو۔ گویا کہ جو ہوا ، وہی ہونا بھی چاہئے تھا ، ایسی حالت میں دل شکستہ ہونے کی کیا ضرورت۔

ہار کو ماننا

اپنی ہار کو ماننا اس عــــزم کا اظہار ہے کہ آدمی پھر سے محنت کرکے اپنی کھوئی ہوئی بازی کو دوبارہ جیتنا چاہتا ہے ـــــــــ ہارنے کے بعد ہار کو مان لینا دوبارہ جیت کی طرف سفر کرنے کا پہلا قدم ہے۔

اگر آپ ہارنے کے بعد اپنی ہار کو نہ مانیں تو آپ ہار کے بعد جہاں کھڑے ہوئے تھے، آپ بدستور وہیں کھڑے رہیں گے۔ آپ نئے سفر کا آغاز کرنے کے قابل نہیں بنیں گے۔ مگر جب آپ ہارنے کے بعد اپنی ہار مان لیں تو آپ کا سفر فوراً دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔

ہار کو مان لینا اس بات کا اعتراف ہے کہ میں مقابلہ کی دوڑ میں پیچھے رہ گیا ہوں۔ اس کے برعکس ہار کو نہ ماننا گویا یہ کہنا ہے کہ میں مقابلہ کی دوڑ میں آگے ہوں۔ اب جو شخص واقعہ کے اعتبار سے پیچھے ہو وہ فرضی طور پر اپنے آپ کو آگے سمجھے تو وہ جھوٹے بھرم میں مبتلا رہے گا۔ اور جو لوگ جھوٹے بھرم میں مبتلا ہوں وہ اسباب کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

ہارنے کے بعد ہار کو مان لینا بہادری ہے۔ اور ہارنے کے بعد ہار کو نہ ماننا بزدلی۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو بہادر ثابت کرے۔ وہ اپنے آپ کو بزدلی کی سطح پر جانے نہ دے۔

اس دنیا میں کبھی ہار ہوتی ہے اور کبھی جیت۔ بلند انسان وہ ہے جو ہار جیت سے اوپر اٹھ کر سوچے، جو ہار جیت سے اثر لئے بغیر اپنی رائے قائم کرے۔ جو لوگ اس اعلیٰ صلاحیت کا ثبوت دیں، وہی اس دنیا میں اپنے مقصد تک پہنچتے ہیں۔ جو لوگ اس اعلیٰ صلاحیت کا ثبوت نہ دے سکیں وہ زندگی کے طوفان میں گھر کر رہ جاتے ہیں۔ وہ اپنی مطلوبہ منزل تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔

جو شخص ہار کو مان لے اس نے گویا ہار میں بھی جیت کا راز دریافت کر لیا۔ کیوں کہ وہ باہر کی دنیا میں وقتی طور پر ہار اگر وہ اپنے اندر کی ابدی دنیا میں بدستور فاتح رہا۔ اس نے اپنی عملی شکست کو اپنے ذہن کی شکست بننے نہیں دیا۔ جو آدمی ہار کو نہ مانے اس نے گویا اس معاملہ کو اپنے لئے وقار کا مسئلہ بنا لیا۔ اور جو آدمی اس طرح کسی معاملہ کو وقار کا مسئلہ بنا لے وہ غلطی پر غلطی کرتا چلا جائے گا۔ وہ مسلسل ہارتا ہی چلا جائے گا، اس کے لئے دوبارہ جیتنے کا کوئی امکان نہیں۔

بوسٹر کا رول

فردوسی کا شاہنامہ فارسی زبان کا ایک مشہور رزمیہ ہے۔ اس میں ایران کے رستم اور دوسری شخصیتوں کا پر فخر تذکرہ ہے۔ رستم کے سلسلہ میں فردوسی نے کہا کہ یہ میں ہوں جس نے رستم کو رستم بنایا ورنہ وہ ایران کے ایک قصبہ کا ایک معمولی پہلوان تھا :

منش کردہ ام رستم پہلواں   وگرنہ یلے بود در سیستاں

فردوسی نے اپنے شعر میں جو بات ذاتی فخر کے طور پر کہی ہے وہ درحقیقت فطرت کا ایک قانون ہے۔ جس طرح والی بال کے کھیل میں ایک بوسٹر ہوتا ہے اور ایک وہ جو والی مارتا ہے، بوسٹر کا کام ہے بال کو آگے بڑھانا اور والر کا کام ہے اس کو لے کر والی مارنا، اس طرح والی بال کا کھیل جاری رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح زندگی کے نظام میں خود خدا کے نقشۂ تخلیق کے مطابق ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے شخص کو بڑھاوا دے اور اس طرح وہ اس کو آگے پہنچا دے۔

یہ اصول اتنا عام ہے کہ پیغمبر تک اس سے مستثنیٰ نہیں۔ مثال کے طور پر حضرت یوسفؑ مصر میں ایک غلام کی حیثیت سے داخل ہوئے پھر وہ جیل میں پہنچا دیے گئے۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ انھیں مصر کی حکومت میں اعلیٰ ترین منصب حاصل ہو گیا۔ ان کی یہ ترقی اللہ کے منصوبہ کے تحت تھی۔ تاہم ظاہری طور پر مصر کے بادشاہ نے ان کے لیے بوسٹر (بڑھانے والا) کا رول ادا کیا۔

یہی بات ہر اس شخص کے سلسلہ میں نظر آتی ہے جس کو کسی حیثیت سے کوئی نمایاں مقام حاصل ہوا۔ اس حیثیت سے مطالعہ کیا جائے تو ہر آدمی کے پیچھے کوئی بوسٹر دکھائی دے گا۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی شخصیت ہو جس کے آگے بڑھنے میں کسی بوسٹر کا دخل شامل نہ ہو۔

اس معاملہ میں بوسٹر کو کسی تعلّی کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اس کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کی وجہ سے فلاں شخص آگے بڑھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بوسٹر اگر غیر جانبدارانہ طور پر غور کرے تو وہ خود بھی پائے گا کہ اس کی اپنی ذات کے معاملہ میں بھی کسی بوسٹر کا ہاتھ کام کر رہا ہے۔ بوسٹر کو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس نے جو کچھ کیا وہ اس کا ذاتی کارنامہ نہ تھا بلکہ یہ دراصل خدا تھا جس نے اس کو اپنی ایک منشا کی تکمیل کے لیے استعمال کیا۔

حکیمانہ تدبیر

فساد صرف حکیمانہ تدبیروں سے ختم ہوتا ہے نہ کہ فساد ختم کرو کا مطالبہ کرنے سے ـــــ یہ اصول بلاشبہہ صد فی صد درست ہے۔ اس کے سوا فساد کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں۔

دو انسانی گروہ جب ایک ساتھ رہیں گے تو عین فطری قانون کے تحت ایسا ہوگا کہ ان کے درمیان بار بار اختلاف اور نزاع کے مواقع پیش آئیں گے۔ مثلاً ایک کا نعرہ دوسرے کو برا لگے گا۔ ایک گروہ دوسرے گروہ کے عبادت خانہ کا وہ احترام نہ کر سکے گا جیسا کہ وہ گروہ کرتا ہے جس کا وہ عبادت خانہ ہے۔

اس طرح کی مختلف صورتیں ہیں جن میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے شکایت پیدا ہوگی۔ اس شکایت کا حل جوابی شکایت نہیں ہے۔ اس کا واحد حل یہ ہے کہ اس کو نظر انداز کیا جائے۔ اختلافی امور میں روا داری اور تحمل کا اصول اختیار کرنا چاہئے نہ کہ نزاع اور جوابی کارروائی کا۔

ہم فطرت سے لڑ نہیں سکتے۔ اور اختلافی بات پیش آنے پر ردعمل کا طریقہ اختیار کرنا گویا فطرت سے لڑنا ہے۔ کیوں کہ اس طرح کے اختلافات عین فطری اسباب کے تحت پیش آتے ہیں۔ ایسی حالت میں فطرت سے مطابقت مسئلہ کا حل ہے، فطرت سے ٹکراؤ کبھی مسئلہ کا حل نہیں بن سکتا۔

ہر مسئلہ کا حل ہے۔ مگر یہ حل صرف حکیمانہ تدبیر میں ہے۔ اگر ہم ایسا کریں کہ مسئلہ پیش آنے کے بعد ہم جھنجھلاہٹ کا شکار نہ ہوں، بلکہ ٹھنڈے طریقہ سے پوری صورت حال پر غور کریں۔ مسئلہ کو صرف مسئلہ کی حیثیت سے دیکھیں، اس کو ساکھ اور وقار کا معاملہ نہ بنائیں تو یقینی ہے کہ ہم ایسی تدبیر دریافت کرلیں گے جس کے ذریعہ اس مسئلہ کو آسانی کے ساتھ حل کیا جاسکے۔

جب بھی کوئی مسئلہ پیش آئے تو اپنے آپ کو منفی جذبات کا شکار ہونے سے بچائیے۔ اپنے ذہن کو صرف تدبیر ڈھونڈنے میں لگا دیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ مسئلہ اس طرح حل کرلیا گیا ہے جیسے کہ اس کا کوئی وجود ہی نہ تھا۔

مقامِ نفوذ

مالی کو ایک پودا لگانا تھا۔ اس نے باغ میں ایک گڑھا کھودا۔ اس کی زمین نرم کرنے کے لیے اس نے گڑھے میں ایک بالٹی پانی ڈالا۔ کچھ دیر کے بعد پانی سوکھ چکا تھا۔ دیکھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں زمین کے نیچے ایک سوراخ تھا۔ اس سوراخ سے سارا پانی نیچے چلا گیا۔

یہ فطرت کا اصول ہے جس کو پانی نے عملی طور پر برت کر دکھایا۔ پانی نے ایسا نہیں کیا کہ وہ گڑھے کی سخت جگہ پر ٹکرا کر وہاں اپنا راستہ بنانے کی کوشش کرے۔ بلکہ اس نے گڑھے کے اندر اپنے لیے ایک مقامِ نفوذ (penetration point) تلاش کیا۔ اور وہاں سے راستہ بنا کر اندر داخل ہو گیا۔

فطرت کا یہی اصول انسانی زندگی کے لیے بھی ہے۔ انسانی معاشرہ میں جب بھی آپ کو کوئی کام کرنا ہو خواہ وہ مادی معنوں میں کوئی دنیوی کام ہو یا اخروی معنی میں دعوت و تبلیغ کا کام، آپ کو سب سے پہلے اپنے ماحول کا مطالعہ کر کے یہ دیکھنا چاہیے کہ آپ کے لیے مقامِ نفوذ کیا ہے۔ وہ کون سا نقطہ ہے جہاں پر عمل کر کے آپ بآسانی اپنے لیے ایک گزرگاہ پا سکتے ہیں۔ جہاں سے اپنے عمل کا آغاز کر کے آپ اپنے لیے مستقبل کی وسیع تر راہیں تلاش کر سکتے ہیں۔

انسان جب بھی کوئی منصوبہ بناتا ہے تو اس کا ایک آخری نشانہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مکان تعمیر کرنا ہو تو اس کا آخری نشانہ اوپر کی چھت ہو گا۔ لیکن آپ اپنے مکان کی تعمیر اوپر کی چھت سے نہیں کر سکتے۔ آپ کو لازمی طور پر اپنے مکان کا آغاز اس کی بنیاد سے کرنا ہو گا۔

یہی معاملہ تمام انسانی کاموں کا ہے۔ ہر کام کا ایک نقطۂ آغاز ہے، اور دوسرا اس کا نقطۂ اختتام۔ آدمی کو چاہیے کہ وہ دونوں چیزوں کے فرق کو سمجھے۔ وہ اس حقیقت کو جانے کہ ابتدائی مقام سے آغاز کر کے وہ اپنے مطلوب اختتام تک تو پہنچ سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنے منصوبہ کے اختتامی نقطہ سے آغاز کرنا چاہے تو وہ کہیں بھی نہیں پہنچے گا، خواہ وہ عمل کے نام پر صدیوں تک اپنی کوششیں جاری رکھے ——— یہی اس دنیا کے لیے خدا کا مقرر کیا ہوا قانون ہے۔

عمل کے نقطۂ اختتام کو جاننا جوش ہے۔ اور عمل کے نقطۂ آغاز کو جاننا ہوش۔

احتیاطی تدبیر

فطرت کا ایک اصول پیشگی احتیاط ہے۔ اسی اصول کے تحت زندگی کے مختلف شعبوں میں احتیاطی تدابیر (precautionary measures) اختیار کی جاتی ہیں۔ اکثر حالات میں ایسا ہوتا ہے کہ اگر پیشگی تدبیر اختیار کرلی جائے تو متوقع حادثہ پیش نہیں آتا۔

مثال کے طور پر ہرنیا ایک بیماری ہے۔ جس آدمی کو یہ بیماری ہو جائے اس کو آپریشن تھیٹر میں جانا ضروری ہوجاتا ہے۔ مگر اس بیماری کی پیشگی تدبیر تقریباً یقینی طور پر اس کو ظہور میں آنے سے روک دیتی ہے۔ یہ پیشگی تدبیر انڈر ویر کا استعمال ہے۔ ہرنیا کبھی اچانک نہیں ہوتا۔ اس کی ابتدائی علامت بہت پہلے سے ظاہر ہونا شروع ہوجاتی ہے۔ اگر آدمی ایسا کرے کہ ابتدائی علامت ظاہر ہوتے ہی وہ مخصوص انڈر ویر پہننا شروع کردے تو وہ اس بیماری میں مبتلا ہونے سے بچ جائے گا۔

موجودہ زمانہ میں کھلاڑیوں کے استعمال کے لئے بہت عمدہ قسم کے انڈر ویر بنائے گئے ہیں۔ ان کو ایتھلیٹک سپورٹر (athletic supporter) کہا جاتا ہے۔ یہ ایتھلیٹک سپورٹر گویا نہایت موثر قسم کی پیشگی تدبیر ہے جو ہرنیا کی بیماری سے بچاؤ کی تقریباً یقینی ضمانت ہے۔

اسی طرح اجتماعی جھگڑوں کے لئے بھی پیشگی تدابیر ہیں۔ یہ تدبیریں اجتماعی جھگڑوں کو روکنے میں نہایت مؤثر ہیں۔ مثلاً باہمی غلط فہمیوں کو دور کرنا، افواہوں کی بروقت تردید کرنا، ہر بستی میں امن کمیٹی بنانا، اختلاف پیدا ہونے کی صورت میں ٹکراؤ کے بجائے مفاہمت کا انداز اختیار کرنا، فریق ثانی کو دشمن سمجھنے کے بجائے اس کو ایک انسان سمجھ کر اس سے برادرانہ معاملہ کرنا۔ نزاع اگر عملاً پیش آجائے تو "لو اور دو" کے اصول پر معاملہ کو ختم کرنا۔ جس شخص یا گروہ کے ساتھ نزاع پیش آگئی ہے اس سے حریفانہ طریقہ کے بجائے برادرانہ طریقہ اختیار کرنا، وغیرہ

موجودہ دنیا کے خالق نے ہر معاملہ میں پیشگی بچاؤ کے طریقے رکھ دئے ہیں۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ ان طریقوں کو دریافت کرے اور ان کو استعمال کرکے اپنے آپ کو ان کی زد میں آنے سے بچالے۔

قانون ہشت

اگر آپ ایک چوکور کاغذ کو لیں اور اس کو موڑنا شروع کریں تو آپ صرف آٹھ موڑ تک اس کو موڑ پائیں گے۔ اس کے بعد نواں موڑ یا دسواں موڑ آپ کے لیے ناممکن ہو جائے گا۔ یہ اصول ہر حال میں درست ہے خواہ آپ کا کاغذ پوسٹ کارڈ کے برابر ہو یا روزانہ اخبار کے برابر یا کسی بہت بڑے پوسٹر کے برابر۔ ہر حال میں آپ کا موڑ آٹھ پر جا کر رک جائے گا۔ اس کے آگے وہ نہیں بڑھے گا۔

یہ قانون ہشت (آٹھ کا قانون) ہے۔ یہ فطرت کا قائم کردہ ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اسی طرح زندگی کے ہر شعبہ میں مانع قوانین موجود ہیں جو کسی کی سرگرمیوں کو ایک حد پر جا کر روک دیتے ہیں۔ کسی بڑے سے بڑے طاقتور کے لیے بھی اس حدبندی کو توڑنا ممکن نہیں۔

اس دنیا میں ایٹم بم صرف ایک بار گرایا جا سکتا ہے، بار بار ایٹم بم گرانا کسی کے لیے ممکن نہیں۔ اس دنیا میں ایک شخص ظالمانہ الفاظ بولنے کے لیے آزاد ہے مگر اپنے ظالمانہ الفاظ کو واقعہ بنانا اس کے لیے ممکن نہیں۔ کوئی شخص ایک عبادت خانہ کو ڈھا سکتا ہے مگر یہ ممکن نہیں کہ وہ سارے ہی عبادت خانوں کو ڈھا دے۔ ایک شخص منفی نعرے لگا کر اقتدار تک پہنچ سکتا ہے مگر کوئی بھی اقتدار اس کے لیے کافی نہیں کہ وہ اپنے نعروں کو تاریخ کا درجہ دے دے۔

فطرت کا یہ اٹل قانون اس دنیا میں ہر انسان کے لیے امن اور تحفظ کی سب سے بڑی ضمانت ہے۔ جب تک یہ دنیا موجود ہے اس کا یہ قانون بھی لازمی طور پر موجود رہے گا۔ فطرت کا یہ قانون صرف اس وقت ختم ہوگا جب کہ خود یہ دنیا ہی ختم ہو جائے اور کوئی شخص یہاں باقی ہی نہ رہے جو ظالمانہ الفاظ بول کر لوگوں کو ڈرائے یا مفسدانہ منصوبہ بنا کر لوگوں کے اندر عدم تحفظ کا احساس پیدا کرے۔

فطرت کا یہ ناقابل تغیر قانون اپنی خاموش آواز میں کہہ رہا ہے کہ اے لوگو، تم اپنے آپ کو خود اپنے ظلم سے بچاؤ۔ کیوں کہ تم سے باہر کوئی بھی نہیں جو تم کو اپنے ظلم و فساد کا نشانہ بنا سکے۔

اسی قانون ہشت کو قرآن میں قانون دفع کہا گیا ہے۔ یعنی روک کا قانون، جو ہر چیز کو ایک متعین حد پر رہنے کے لیے مجبور کر دے۔

پانی کے ساتھ طوفان

ایک شاعر کا قطعہ ہے۔ اپنے ان چند شعروں میں اس نے نہایت سادہ طور پر زندگی کی حقیقت بتا دی ہے۔ وہ قطعہ یہ ہے:

کہا کیا اونٹ پر بیٹھوں کہا ہاں اونٹ پر بیٹھو
کہا کوہان کا ڈر ہے کہا کوہان تو ہوگا
کہا دریا میں کیا اتروں کہا دریا میں ہاں اترو
کہا طوفان کا ڈر ہے کہا طوفان تو ہوگا
کہا کیا پھول کو توڑوں کہا ہاں پھول کو توڑو
کہا پرخار کا ڈر ہے کہا پرخار تو ہوگا

یہی موجودہ دنیا میں زندگی کی حقیقت ہے۔ یہاں اونٹ ہے تو کوہان بھی ہے۔ یہاں ہموار پیٹھ والا کوئی اونٹ موجود نہیں۔ یہاں دریا میں طوفان کا مسئلہ بھی ہے، یہاں کوئی ایسا دریا نہیں پایا جاتا جس میں سکون ہی سکون ہو۔ تموج نام کی کوئی چیز وہاں موجود نہ ہو۔ اسی طرح یہاں خدا کے اگائے ہوئے باغ میں اگر خوب صورت پھول ہیں تو اسی کے ساتھ نوک دار کانٹے بھی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا میں جو آدمی کوئی چیز حاصل کرنے کا خواہش مند ہو اس کو پیشگی طور پر یہ جان لینا چاہیے کہ یہاں ترقی کا سفر کبھی ہموار راستوں سے طے نہیں ہوتا۔ یہاں مسائل پر قابو پانے کے بعد ہی کسی آدمی کے لیے کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں۔ جو آدمی مسائل و مشکلات کو عبور کرنے کا حوصلہ نہ رکھتا ہو، اس کو خدا کی اس دنیا میں کسی قسم کی کامیابی کی امید بھی نہ رکھنا چاہیے۔

خدا کی دنیا ویسی ہی رہے گی جیسا کہ اس کو بنایا گیا ہے۔ اس کو بدلنا یقینی طور پر ہمارے لیے ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں کسی انسان کے لیے یہاں زندگی اور کامیابی کی صرف ایک صورت ہے ——— یہ کہ دنیا میں قائم شدہ نظام فطرت سے وہ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرلے۔ اس کے سوا ہر دوسری صورت آدمی کی ناکامی میں اضافہ کرنے والی ہے نہ کہ اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے والی۔

کامیابی کا موقع

کامیابی کا موقع صرف ایک بار کسی شخص کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے ـــــــ اس دنیا میں کامیابی کا موقع روزانہ آتا ہے۔ مگر وہ روزانہ چلا بھی جاتا ہے۔ اور جو موقع ایک بار چلا جائے وہ دوبارہ کسی کے لئے واپس نہیں آتا۔

کامیابی کا بہت گہرا تعلق مواقع سے ہے۔ جب کوئی بڑا موقع سامنے آتا ہے تو وہ بس تھوڑی دیر ٹھہرتا ہے۔ اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ موقع آنے کے وقت آدمی فوراً اس کو پہچانے۔ جو شخص کسی موقع کو شروع میں پہچان لے، وہ اس سے سب سے زیادہ فائدہ حاصل کرے گا۔ اور جو شخص اس کو پہچاننے میں دیر لگا دے، وہ اس سے بڑا فائدہ حاصل کرنے میں ناکام رہے گا۔

جب ایک موقع آپ کے ہاتھ سے نکل جائے تو آپ اپنی اس محرومی کو اس طرح یافت میں بدل سکتے ہیں کہ پورے معاملہ پر بے لاگ انداز میں سوچیں۔ اس طرح آپ کے اندر یہ سمجھ پیدا ہوگی کہ دوسری بار جب ایک موقع آئے تو آپ فوراً اس کو پہچان لیں، اور پہلے ہی لمحہ میں اس کو استعمال کرکے آگے بڑھ جائیں۔

زندگی میں کچھ لمحات فیصلہ کے لمحات ہوتے ہیں، ان لمحات میں چوک جانا ایک ایسا نقصان ہے جس کی تلافی بعد کو ممکن نہیں ہوتی۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی ان مخصوص لمحات کو پہچان نہیں پاتا۔ وہ غفلت میں ان لمحات کو ضائع کر دیتا ہے۔ بعد کو وہ جاگتا ہے، مگر اب اس کے لئے افسوس کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

ہر بار جب آپ کے دروازہ پر کھٹکھٹانے کی آواز آئے تو فوراً اس پر دھیان دیجئے۔ کیا معلوم کسی بڑی کامیابی کا موقع آپ کے دروازہ پر آپ کا انتظار کر رہا ہو۔ آنے والے موقع کا استعمال کیجئے، کیوں کہ جو موقع ایک بار آکر واپس چلا جائے وہ دوبارہ آپ کے پاس لوٹ کر آنے والا نہیں۔

اکثر لوگوں کی محرومی مواقع کو کھونے کا نام ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کے خلاف احتجاج کرتے ہیں، حالانکہ اصل حقیقت یہ ہوتی ہے کہ وہ مواقع کو وقت پر استعمال نہ کر سکے۔

دس اقوال

امریکہ میں چھپی ہوئی ایک کتاب نظر سے گزری۔ یہ کتاب ایک کامیاب امریکی تاجر کی لکھی ہوئی ہے۔ اس نے یہ کتاب اپنے ۲۰ سالہ تجارتی تجربات کی روشنی میں تیار کی ہے۔ اس خوبصورت کتاب میں ہر صفحہ پر دو تجارتی اصول جلی حرفوں میں درج ہیں۔ مصنف کا کہنا ہے کہ ٹاپ پر فارمرس نے ہمیشہ مثبت عادات (positive habits) کے ذریعہ ترقی کی ہے:

The Book of Excellence by Byrd Baggett.
236 habits of effective salespeople

ان مثبت عادتوں کو مصنف نے ۲۳۶ چھوٹے چھوٹے جملوں میں مرتب کیا ہے۔ کتاب کو پڑھ کر میں نے دس جملے منتخب کئے ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں:

A bad attitude cancels all other positive skills.
Be as critical of yourself as you are of others.
You are not learning anything when you are talking.
Excellence is not optional.
Take an active, not passive, role in helping your community.
Customers love humility.
Patience is a virtue. Don't give up.
There is no replacement for effort.
Success does not come easily. Are you willing to pay the price?
Stop, listen, and think before you respond.

یعنی ایک برا رویہ تمام دوسری خوبیوں پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اپنے بارہ میں بھی اتنا ہی تنقیدی بنو جتنا تم دوسروں کے لئے تنقیدی ہو۔ جب تم بولتے ہو تو تم کچھ سیکھ نہیں رہے ہو۔ امتیاز کوئی اختیاری چیز نہیں۔ اپنی کمیونٹی کی مدد کرنے میں فعال کردار ادا کرو۔ گاہک ہمیشہ تواضع کو پسند کرتے ہیں۔ برداشت ایک نیکی ہے، اس کو کبھی نہ چھوڑو۔ کوشش کا کوئی بدل نہیں۔ کامیابی آسانی سے نہیں آتی، کیا تم اس کی قیمت ادا کرنے کے لئے تیار ہو۔ ٹھہرو، سنو، اور جواب دینے سے پہلے غور کرو۔

یہ اقوال اس فطری حکمت کو بیان کرتے ہیں جن کو اختیار کرکے کوئی شخص دنیا میں اپنی کامیابی کو یقینی بنا سکتا ہے۔ یہ اقوال کامیابی کی کنجی ہیں۔

کامیابی کی شرط

کامیابی کا آدھا تعلق اس بات سے ہے کہ آپ اس کے لئے بھرپور کوشش کریں، اور اس کا بقیہ تعلق اس بات سے ہے کہ آپ کوئی ایسا کام نہ کریں جو آپ کی کوشش کو بے نتیجہ کر دینے والا ہو۔ اس طرح کامیابی ایک ففٹی ففٹی کا معاملہ ہے۔ جو کچھ کرنا ہے اسے کرنا، اور جو کچھ نہیں کرنا ہے اس سے اپنے آپ کو بچائے رکھنا۔

مثال کے طور پر ایک آدمی شہر میں دکان کھولے۔ وہ دکان کو خوب سجائے۔ یہ دکان داری کے سلسلہ میں اس کا مطلوب کام ہے۔ مگر اسی کے ساتھ وہ یہ نامطلوب کام بھی کرے کہ لوگوں سے لین دین میں خیانت کرے، گاہکوں کے ساتھ بد سلوکی کے ساتھ پیش آئے تو اس کی دکان داری ناکام ہو جائے گی۔ اسی طرح ایک شخص ڈاکٹری پڑھ کر مطب کھولے۔ وہ ہر قسم کا سامان اپنے مطب میں رکھے۔ مگر اسی کے ساتھ اس کے معاملات اتنے خراب ہوں کہ جو مریض اس کے پاس آئے وہ اس کے خلاف شکایت لے کر واپس جائے۔ ایسا ڈاکٹر اپنے مطب میں کامیاب نہیں ہو گا کیوں کہ اس نے ایک طرف کرنے والا کام کیا مگر دوسری طرف اس نے نہ کرنے والے کام کو بھی نہیں چھوڑا۔

اس اصول کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ آدمی کوئی بھی کام کرے اور کسی بھی میدان میں سرگرم ہو، مگر ان دوگونہ شرطوں کو پورا کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ جو آدمی ایک شرط کو لے اور دوسری کو چھوڑ دے، وہ اسباب کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

دنیا کی بیشتر ناکامیاں اسی اصول کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہیں۔ یہاں ہر ایک کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے مقصد کے لئے مثبت جد وجہد کرنے کے ساتھ اس کا بھی خصوصی اہتمام کرے کہ وہ اپنے آپ کو کسی مخالف مقصد میں نہ پھنسائے۔ مثلاً ایک شخص اگر اپنی زندگی کی تعمیر کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ چھوڑے تو وہ اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہے گا۔

پانچواں باب

رہنمائے حیات

ہر آدمی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس
ایک رہنما کتاب ہو جو زندگی کے مختلف مراحل
میں اس کو تعمیری رہنمائی دیتی رہے اور دنیا کی
راہوں میں اس کو بھٹکنے سے بچائے

قدرت کا قانون

دو آدمی سڑک پر آمنے سامنے سے گزرے۔ دونوں بائیسکل پر تھے۔ دونوں میں ہلکی ٹکر ہو گئی۔ دونوں کی بائیسکل رک گئیں۔ اب دونوں میں تکرار ہونے لگی۔ یہاں تک کہ دونوں آپس میں لڑ گئے۔ دونوں کو چوٹیں آئیں۔ اور پھر دونوں کو اپنے اپنے گھر جانے کے بجائے ڈاکٹر کے یہاں جانا پڑا۔

اس واقعہ میں بائیسکل کی ٹکر سے تو دونوں زخمی نہیں ہوئے تھے مگر اس کے بعد ان میں جو بحثیں و تکرار ہوئی اس میں دونوں زخمی ہو گئے۔ اسی بات کو کسی دانا شخص نے ان الفاظ میں کہا ہے: دوسرا شخص کسی آدمی کو اتنا نقصان نہیں پہنچاتا جتنا آدمی خود اپنی نادانی سے اپنے آپ کو نقصان میں ڈال لیتا ہے۔

غور کیجئے تو ہمارے سماج میں جتنے بھی دنگے فساد ہو رہے ہیں ان سب کا خلاصہ یہی ہے۔ ابتداء میں کوئی معمولی سی بات پیش آتی ہے۔ اس ابتدائی صورت میں اس کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا۔ مگر اس کے بعد لوگ جذباتی ہو جاتے ہیں۔ اور پھر جو ٹکراؤ ہوتا ہے وہ لوگوں کو بڑے بڑے نقصان تک پہنچا دیتا ہے۔

زندگی کا معاملہ سڑک جیسا ہے۔ زندگی کے میدان میں بیک وقت ہزاروں لوگ اپنی اپنی دوڑ لگا رہے ہیں۔ اب قدرتی طور پر ایسا ہوتا ہے کہ کبھی ایک آدمی کی دوسرے آدمی سے ٹکر ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر کرنے کا کام یہ ہے کہ پہلے ہی مرحلہ میں برداشت کر کے بات کو وہیں ختم کر دیا جائے۔ اگر پہلے مرحلہ میں برداشت نہ کیا جائے تو بات بڑھے گی اور پھر یہ ہوگا کہ ابتدائی ٹکر سے تو کسی کو کوئی خاص نقصان نہیں پہنچا تھا۔ مگر اس کے بعد کی لڑائی میں دونوں اپنے آپ کو تباہ کر لیں گے۔

کسی کا قول ہے کہ "آپ دنیا سے اپنے ناپسندیدہ انسانوں کو ختم نہیں کر سکتے۔ البتہ ان کے

ساتھ نباہ کر کے اپنی زندگی کو خوشگوار بنا سکتے ہیں"۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کی تصدیق پوری تاریخ کر رہی ہے۔ جب ایسا ہے تو آپ ناممکن چٹان سے کیوں ٹکرائیں۔ آپ ممکن میدان میں کیوں نہ اپنا راستہ بنائیں۔ دنیا میں جس طرح آپ کو رہنا ہے اسی طرح دنیا میں دوسروں کو بھی رہنا ہے۔ دنیا کسی ایک کے لئے نہیں ہے بلکہ سارے لوگوں کے لئے ہے۔ ایسی حالت میں حقیقت پسندی یہ ہے کہ دوسروں کا وجود بھی اسی طرح تسلیم کیا جائے جس طرح آپ اپنا وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ دوسروں کو بھی وہی حقوق دئے جائیں جو حقوق آپ اپنے لئے حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ اپنے اندر یہ سوچ پیدا کر لیں تو آپ دیکھیں گے کہ بظاہر کانٹوں سے بھری ہوئی دنیا آپ کے لئے پھولوں سے بھری ہوئی دنیا بن گئی ہے۔

دوسروں کو زندگی کا حق دے کر آپ خود اپنے لئے زندگی کا حق پا لیتے ہیں۔ اور اگر آپ دوسروں کو ان کا حق دینے سے انکار کریں تو سماج میں ایسی خرابیاں پیدا ہوں گی کہ آپ کو خود بھی اپنے حق سے محروم ہونا پڑے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ دوسروں کے ساتھ خیر خواہی خود اپنے ساتھ خیر خواہی ہے اور دوسروں کے ساتھ بد خواہی خود اپنے ساتھ بد خواہی۔ اس دنیا میں دینے کا انجام پانا ہے اور چھیننے کا انجام کھونا۔

کسی نے کہا ہے کہ انتظار بھی مسئلہ کا ایک حل ہے۔ مگر لوگوں میں انتظار کرنے کا حوصلہ نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حال کی محرومی پر نہ گھبراؤ۔ عین ممکن ہے کہ مستقبل میں تم اس سے زیادہ اپنے لئے حاصل کر لو۔ اس کی وضاحت کے لئے ایک مثال لیجئے۔

ایک باپ کے یہاں دو بچے پیدا ہوئے۔ ایک نے اونچی تعلیم حاصل کی۔ دوسرے نے پڑھنے میں محنت نہیں کی۔ وہ جاہل رہ گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تعلیم یافتہ لڑکے نے ترقی حاصل کی۔ جاہل لڑکا کوئی ترقی حاصل نہ کر سکا۔ اس کا دوسرا انجام یہ ہوا کہ ایک آدمی کو گھر میں عزت اور بڑائی ملی۔ دوسرا آدمی خود اپنے گھر میں عزت اور بڑائی پانے سے محروم ہو گیا۔

یہ دو سگے بھائیوں کا قصہ ہے۔ دو آدمی خواہ سگے بھائی اور ایک باپ کی اولاد ہوں مگر کبھی

ایسا ہوتا ہے کہ دونوں میں فرق ہو جاتا ہے۔ یہ فرق فطرت کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ اور اس کا کوئی حقیقی نقصان بھی نہیں۔ چنانچہ مذکورہ مثال میں جس بھائی نے اونچی ترقی کی تھی اس کے لڑکے کھیل تماشے میں پڑ گئے۔ وہ محنت نہ کر سکے۔ مگر دوسرا بھائی جو بے ترقی رہ گیا تھا اس کی اولاد میں محنت کا جذبہ ابھر آیا۔ ان کے باپ کا پچھڑا پن ان کے لئے مہمیز بن گیا۔ وہ رات دن محنت کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگلی نسل میں نقشہ بدل گیا۔ ایک بھائی کے بیٹے غفلت میں پڑ کر بے ترقی رہ گئے اور دوسرے بھائی کے بیٹوں نے مستعدی کا ثبوت دے کر اتنی ترقی کی کہ انہوں نے باپ کی محرومی کی بھی تلافی کر لی۔ ایک ہی نسل میں پوری تاریخ بدل گئی۔

ایک بھائی کو حال میں ملا اور دوسرے بھائی کو مستقبل میں۔ اس طرح آخر کار دونوں برابر ہو گئے۔ یہ اس دنیا کے لئے قدرت کا قانون ہے۔ یہ قانون افراد کے لئے بھی ہے اور قوموں کے لئے بھی۔ تاریخ کے عمل کے دوران اگر کوئی قوم دوسری قوم سے مات کھا جائے تو اس کو مایوس یا جھنجھلاہٹ کا شکار نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ جو کچھ ہوا ہے وہ وقتی ہے نہ کہ ابدی۔ تاریخ کی گردش دوبارہ اپنا کام کرے گی۔ اور پھر جلد ہی دنیا دیکھے گی کہ جو آگے تھا وہ پچھلی سیٹ پر چلا گیا اور جو پیچھے تھا اس نے اگلی سیٹ پر اپنے لئے جگہ حاصل کر لی۔

''تاریخ کی تشکیل قدرت کرتی ہے نہ کہ کوئی انسان'' کسی کا یہ قول بہت بامعنی ہے۔ جب بھی ایک قوم اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلہ میں دبا ہوا پائے تو اس کو سمجھنا چاہئے کہ جو کچھ ہوا وہ قانون قدرت کے تحت ہوا نہ کہ کسی کے ظلم کی بنا پر ہوا۔ اسی لئے اپنی سوچ کا رخ قدرت کے قانون کو جاننے کی طرف موڑ دینا چاہئے نہ کہ کسی قوم یا گروہ کے خلاف نفرت اور انتقام میں اس کو ضائع کیا جائے۔

اپنی محرومی کے لئے آپ کسی دوسری قوم یا کسی خارجی مظاہر سے نہ لڑئے بلکہ قدرت کے قانون کو جان کر اس کو اپنے موافق بنانے کی کوشش کیجئے۔ قدرت کے قانون کی زد میں آکر آپ گرے ہیں اور قدرت کے قانون کو اپنے موافق بنا کر دوبارہ آپ کھڑے ہو سکتے ہیں۔

ٹکراؤ کے بغیر

ایک بار میں کشمیر گیا۔ ایک روز ہم لوگ شہر سے نکل کر باہر وادی کے علاقہ میں گئے جہاں ایک طرف اونچے نیچے پہاڑ تھے اور دوسری طرف کھلی وادی۔ وہاں بڑی تعداد میں پانی کے چشمے بہہ رہے تھے۔ پہاڑ کے اوپر برف پگھلتی ہے تو اس کا پانی چشموں کی صورت میں بہہ کر میدان میں آتا ہے اور پھر بہتا ہوا جا کر دریا میں مل جاتا ہے۔

میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ ایک چشمہ کی نالی کے کنارے بیٹھ گیا۔ میں نے دیکھا کہ پانی جب بہتا ہوا آگے بڑھتا ہے تو اس کے راستہ میں بار بار پتھر کے ٹکڑے آتے ہیں۔ ایسے موقع پر پانی کیا کرتا ہے۔ وہ پتھر کو ہٹانے یا توڑنے کی کوشش نہیں کرتا بلکہ دوشاخ ہو کر پتھر کے دائیں اور بائیں سے گذرتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے۔

میں نے اس واقعہ پر غور کیا تو اس میں ایک گہرا سبق چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ دیکھئے یہ بہتا ہوا پانی کس طرح اپنا راستہ نکال رہا ہے۔ وہ رکاوٹوں سے لڑتا نہیں بلکہ رکاوٹوں کو اوائڈ کرتے ہوئے اپنا راستہ بنالیتا ہے۔ یہ فطرت کا پیغام ہے۔ فطرت ان بہتے ہوئے چشموں کے ذریعہ انسان کو یہ پیغام دے رہی ہے کہ اگر تمہارے راستہ میں کوئی رکاوٹ آجائے تو اس سے ٹکرانے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس کے بازو کی طرف سے اپنا راستہ بنالو۔

تمام دنیا کی سڑکوں پر یہی چشمہ والا اصول رائج ہے۔ ان سڑکوں پر ایک وقت میں بہت سی سواریاں گزرتی ہیں۔ ہر سواری یہ کرتی ہے کہ وہ دوسری سواریوں سے ٹکرائے بغیر دائیں یا بائیں مڑ کر اپنا راستہ بنالیتی ہے۔ اگر یہ سواریاں اس اصول کو نہ مانیں تو سڑک سڑک نہ رہے بلکہ وہ ایک وسیع قبرستان بن جائے۔

چشمہ کا یہ سبق میری زندگی کے لئے ایک انقلابی سبق تھا۔ اس نے مجھ کو زندگی کا راز بتادیا۔ اس کے بعد میں نے اسی طریقہ کو اپنی زندگی میں اپنالیا اور دوسروں کو بھی اسی کی نصیحت کرنے لگا۔

اس دنیا میں سماجی زندگی کی مثال ایک مصروف سڑک جیسی ہے ہر آدمی سڑک پر اپنی گاڑی دوڑاتے ہوئے اسی نصیحت پر عمل کرتا ہے جس کا اعلان بہتے ہوئے چشمہ کے ذریعہ کیا جارہا ہے۔ اب اتنا اور کرنا ہے کہ اسی طریقہ کو زندگی کے بقیہ معاملات میں بھی اختیار کر لیا جائے۔ کامیاب زندگی اور پرامن سماج بنانے کا یہی واحد طریقہ ہے۔

جب بھی کسی آدمی کے سامنے کوئی رکاوٹ آتی ہے، کوئی دوسرا انسان اس کو اپنے راستہ میں حائل دکھائی دیتا ہے تو اس کے ذہن میں پہلا خیال یہ آتا ہے کہ اس رکاوٹ کو یا اس انسان کو اپنے راستہ سے ہٹایا جائے۔ وہ سمجھنے لگتا ہے کہ جب تک سامنے کی یہ رکاوٹ دور نہ ہو اس کا سفر جاری ہونے والا نہیں۔

مگر یہ سوچ درست نہیں جس طرح بہتے ہوئے چشمے کے راستہ میں ہزاروں پتھر ہوتے ہیں اسی طرح زندگی کے سفر میں بھی ہزاروں کی تعداد میں رکاوٹیں پیش آتی ہیں۔ اب اگر شرط یہ ہو کہ پہلے ان رکاوٹوں کو دور کرو، اس کے بعد سفر کا آغاز ہوگا، تو ایسی حالت میں سفر کبھی شروع ہونے والا ہی نہیں کیوں کہ ایک کے بعد ایک رکاوٹیں سامنے آئیں گی اور آدمی ہر رکاوٹ سے لڑتا رہے گا یہاں تک کہ اس کا آخری وقت آچکا ہوگا۔

ایسی حالت میں عملی صورت یہ ہے کہ رکاوٹوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنا سفر جاری کیا جائے۔ آدمی جب اس نظر سے دیکھے گا تو اس کو معلوم ہوگا کہ رکاوٹوں کی ایک حد ہے۔ رکاوٹوں کے باوجود چاروں طرف کھلے ہوئے مقامات موجود ہیں۔ آدمی اگر اپنی نگاہ کو رکاوٹوں سے ہٹا کر ادھر ادھر دیکھے تو اپنے قریب ہی وہ ایسا راستہ پالے گا جس سے گزر کر وہ اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہو جائے۔

اس دنیا میں انسان کے لئے جو انتخاب ہے وہ بے ٹکراؤ کی زندگی اور ٹکراؤ کی زندگی میں نہیں ہے۔ بلکہ بے ٹکراؤ کی زندگی اور تباہی میں ہے۔ اب ہر انسان کو یہ فیصلہ کرنا ہے کہ وہ دونوں میں سے کس طریقہ کا انتخاب کرتا ہے۔

فطری حفاظت

مائک وولڈرج (Mike Wooldridge) بی بی سی، نئی دہلی کے بیورو چیف ہیں۔ وہ ۱۶ جنوری ۱۹۹۸ کو اپنی ٹی وی ٹیم کے ساتھ ہمارے دفتر میں آئے اور اپنی انگریزی نشریات کے لیے راقم الحروف کا ایک انٹرویو ریکارڈ کیا۔

ان کا ایک سوال یہ تھا کہ بھارتیہ جنتا پارٹی (بی جے پی) کو عام طور پر مسلم مخالف پارٹی سمجھا جاتا ہے۔ ہندستانی پارلیمنٹ کا بارھواں الیکشن جو فروری ۱۹۹۸ میں ہونے والا ہے اگر اس میں بی جے پی جیت جائے اور مرکز میں حکومت بنالے تو کیا آپ اس کو مسلمانوں کے لیے خطرہ سمجھتے ہیں۔

میں نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ کوئی پولیٹکل پارٹی جو الیکشن جیت کر برسر اقتدار آتی ہے وہ صرف چند سال کے لیے آتی ہے اور اس کا اقتدار کسی بھی حال میں مطلق اقتدار نہیں ہوتا۔ ہمارے یہاں ایک باضابطہ دستور ہے۔ ہر حکومت کو اس دستور کے تحت کام کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس سے آزاد رہ کر۔

انھوں نے کہا کہ ہندستانی دستور میں حکمراں جماعت کو ایمرجنسی نافذ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے، اسی سے فائدہ اٹھا کر اندرا گاندھی نے ۱۹۷۷ء میں یہاں ایمرجنسی نافذ کردی تھی، جس کی وجہ سے اندرا گاندھی کو مَن مانی کارروائی کرنے کا اختیار حاصل ہوگیا۔ اسی طرح اگر بی جے پی حکومت پاکر یہاں ایمرجنسی نافذ کردے تو خود اسی دستور کے مطابق اس کو لامحدود اختیارات حاصل ہوجائیں گے، اور وہ مسلمانوں کے خلاف جو چاہے گی کر سکے گی۔

میں نے کہا کہ اس قسم کا سنگین واقعہ کبھی قابل اعادہ نہیں ہوتا۔ آپ ایٹم بم صرف ایک بار گرا سکتے ہیں، بار بار ایٹم بم گرانا ممکن نہیں:

Such kind of holocaust is not repeatable in human history. You cannot drop an atomic bomb again and again.

میں نے کہا کہ اسی اصول پر یقین کی بنا پر میں نے یہ جرأت کی تھی کہ ۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب اجودھیا کی بابری مسجد ڈھائی گئی تو میں نے یہ کہا کہ اب اس ملک میں کوئی اور مسجد ڈھائی نہیں جائے گی۔ لوگ

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کے حادثہ کو کاما سمجھ رہے تھے۔ میں نے کہا کہ یہ کاما نہیں ہے بلکہ یہ فل اسٹاپ ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ ایسا ہی ہوا۔ ڈھانے والے لوگ اپنے لحاظ سے بہت سی اور مسجدوں کی فہرست بنائے ہوئے تھے، مگر فطرت کے قانون نے ان کی فہرست کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا، دوبارہ ان کے لیے ممکن نہ ہو سکا کہ وہ کسی اور مسجد کے ساتھ ۶ دسمبر کو دُہرا سکیں۔

۶ دسمبر ۱۹۹۲ کو جب بابری مسجد ڈھائی گئی تو شیوسینا کے لیڈر مسٹر بال ٹھاکرے نے کہا تھا کہ مجھے ان لوگوں پر فخر ہے جنھوں نے بابری مسجد کو ڈھایا۔ مگر اسی مہینہ کے اخبارات میں بال ٹھاکرے کا یہ بیان چھپا ہے کہ بابری مسجد کی جگہ پر نہ مسجد بنائی جائے اور نہ مندر، دونوں فرقوں کو اس سے الگ مقام پر مسجد اور مندر بنانے کی جگہ دے دی جائے اور جہاں بابری مسجد تھی وہاں ایک قومی یادگار تعمیر کی جائے۔ اس معاملہ میں کانگریس نے مسلمانوں سے یہ کہہ کر معافی مانگی ہے کہ اس وقت اگرچہ مرکز میں کانگریس کی حکومت تھی، مگر ہم بابری مسجد کو بچانے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بھارتیہ جنتا پارٹی نے بھی یہ اعلان کر دیا ہے کہ مندر مسجد کا اشو اب اس کے ایجنڈے میں نہیں، وغیرہ۔

اس دنیا کا نظام اس طرح بنا ہے کہ یہاں کسی بڑی برائی کو مسلسل جاری نہیں رکھا جا سکتا۔ کوئی بڑی برائی یا کوئی سنگین جرم جب کیا جاتا ہے تو فوراً ہی اس کے خلاف مانع اسباب اکٹھا ہونے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایسی صورت حال پیدا ہوتی ہے کہ اس برائی یا ظلم کی تکرار ممکن نہیں رہتی۔

اگر کوئی شخص آپ سے کہے کہ میں تمہارے سر پہ آسمان گرا دوں گا۔ تو آپ کو کہنے والے سے لڑنا نہیں چاہیے بلکہ یہ سوچ کر چپ رہنا چاہیے کہ آسمان کو گرانا اس کے بس ہی میں نہیں۔ اسی طرح کوئی پولیٹکل پارٹی یا لیڈر اگر آپ کی مخالفت میں بڑے بڑے الفاظ بولے تو اس کے خلاف کارروائی کرنے سے پہلے یہ سوچیے کہ ایسا ہونا ممکن ہے یا نہیں۔ اگر وہ ممکن نہ ہو تو آپ کو پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس دنیا میں کسی کو یہ طاقت حاصل نہیں کہ وہ اپنے الفاظ کو واقعہ بنا سکے۔ یہاں جو چیز واقعہ بنتی ہے وہ حقائق ہیں نہ کہ کسی کے بولے ہوئے الفاظ۔

بالواسطہ فائدہ

اگر آپ اپنے کھیت میں دال کی فصل بوئیں تو اس کا ایک براہ راست فائدہ ہوگا اور دوسرا بالواسطہ فائدہ۔ براہ راست فائدہ یہ ہے کہ آپ کو اس سے دال کی فصل ملی۔ بالواسطہ فائدہ یہ ہے کہ اس کی جڑوں میں بیکٹیریا جمع ہوئے اور انھوں نے ہوا سے نائٹروجن لے کر زمین میں شامل کیا۔ اس طرح آپ کے کھیت کو نائٹروجن کی کھاد حاصل ہو گئی۔

اسی طرح ہر عمل کا کچھ براہ راست فائدہ ہے اور کچھ بالواسطہ فائدہ۔ لوگ عام طور پر صرف براہ راست فائدہ کو دیکھتے ہیں۔ بالواسطہ فائدہ ان کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ براہ راست فائدہ کو پیشانی کی آنکھ سے دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر بالواسطہ فائدہ کو دیکھنے کے لئے عقل و بصیرت کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ صرف پہلے فائدہ کو دیکھ پاتے ہیں۔ اور دوسرے فائدہ کو دیکھنے اور جاننے سے محروم رہتے ہیں۔

اس دنیا میں بڑی کامیابیاں صرف ان لوگوں کے لئے مقدر ہیں جو براہِ راست فائدہ سے اوپر اٹھ کر بالواسطہ فائدوں کو دیکھنے والی نگاہ رکھتے ہوں۔

کسی عمل سے براہِ راست فائدہ عام طور پر بہت کم ہوتا ہے۔ اس کا زیادہ فائدہ وہ ہے جو بالواسطہ طور پر برآمد ہوتا ہے۔ بالواسطہ فائدے نہ صرف یہ کہ آنکھوں سے چھپے ہوتے ہیں مزید یہ کہ وہ نسبتاً زیادہ دیر میں ظاہر ہوتے ہیں۔

بالواسطہ فائدے بلاشبہ براہ راست فائدہ سے بہت زیادہ اہم اور عظیم ہوتے ہیں۔ براہ راست فائدہ کی گنتی کی جا سکتی ہے مگر بالواسطہ فائدہ کی گنتی کرنا ممکن نہیں۔

آپ کے گھر کے سامنے کی سڑک پر کوڑے کا ڈھیر ہو اور آپ اس کو صاف کرا دیں تو اس کا براہ راست فائدہ یہ ہے کہ آپ کے گھر کا سامنا صاف ہو گیا۔ مگر اس کا جو بالواسطہ فائدہ ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے۔ اس عمل نے آپ کے اندر مثبت طرز فکر پیدا کیا۔ آس پاس کے ماحول

میں آپ کا وقار بڑھ گیا۔ سماج میں تعمیری قدروں کو فروغ حاصل ہوا۔ اخلاقی روایات قائم ہونے میں مدد ملی۔ لوگوں کی دعائیں آپ کو ملنے لگیں۔ اس کے نتیجہ میں لوگوں کے درمیان آپ کا اعتماد قائم ہو گیا۔ اس کے بعد اگر آپ اپنے علاقہ میں کوئی مفید کام کرنا چاہیں تو فوراً بہت سے لوگ آپ کے مددگار بن جائیں گے کیونکہ آپ کے مذکورہ عمل کے بعد آپ نے لوگوں کے دلوں میں اپنے لئے ایک باعزت جگہ بنالی تھی۔

جو لوگ کام کے صرف براہ راست فائدہ کو دیکھ پائیں وہ صرف چھوٹا کام کر پاتے ہیں، کوئی بڑا کام کرنا ان کے لئے مقدر نہیں۔ بڑا کام صرف ان لوگوں کے حصے میں آتا ہے۔ جو براہ راست فائدہ سے اٹھ کر بالواسطہ فائدہ کو دیکھنے کی نظر رکھتے ہوں۔

بالواسطہ فائدہ کو اہمیت دینے کے لئے ضروری ہے کہ آدمی کے اندر وسعت نظر ہو۔ وہ مستقبل کی خاطر حال کو نظر انداز کر سکتا ہو۔ وہ آئندہ کے فائدہ کی خاطر وقتی نقصان کو برداشت کر سکے۔ وہ ایک ایسے کام کو بھی کام سمجھے جس میں بظاہر دوسروں کو کریڈٹ ملنے والا ہو۔ وہ ایسی نظر رکھتا ہو جو نہ صرف دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھے بلکہ وہ اس سے آگے بڑھ کر نہ دکھائی دینے والی چیزوں کو دیکھ سکتی ہو۔

بالواسطہ فائدہ کے پیش نظر صرف وہ لوگ کام کر سکتے ہیں جن کے اندر دور اندیشی ہو۔ جو منصوبہ بند کام کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ جو نہ صرف اپنی ذاتی خواہشات سے واقف ہوں بلکہ ان قوانین فطرت سے بھی واقف ہوں جو انسان سے باہر قائم ہیں اور خود اپنے طور پر چل رہے ہیں۔

آپ کو اگر بڑا کام کرنا ہے تو اس کے لئے سب سے پہلے بڑا دل پیدا کیجئے۔ بڑے دل کے بغیر کبھی بڑا کام نہیں ہو سکتا۔

بالواسطہ طریقہ کو دوسرے لفظوں میں حکیمانہ طریقہ کہہ سکتے ہیں، اور اس دنیا میں حکیمانہ طریقہ کے بغیر کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

پازیٹیو سوچ

سوامی وویکانند (وفات ۱۹۰۲) کے حالات میں نے پڑھے۔ ان کا ایک واقعہ بہت پسند آیا۔ یہ واقعہ صرف ایک واقعہ نہیں بلکہ وہ زندگی کا ایک راز ہے، وہ اس دنیا میں کامیابی کی کنجی ہے۔

سوامی جی کے ایک مسیحی دوست تھے۔ وہ سوامی جی کو بہت مانتے تھے۔ ایک بار انھوں نے سوامی جی کا ٹیسٹ لینا چاہا۔ انھوں نے سوامی جی کو اپنے گھر پر کھانے کے لئے بلایا۔ سوامی جی جب ان کے یہاں پہنچے تو ان کو ایک کمرہ میں بٹھایا گیا۔ اس کمرہ میں ایک میز تھی اس میز کے اوپر بہت سی مذہبی کتابیں ایک کے اوپر ایک رکھی ہوئی تھیں۔ سب سے نیچے گیتا تھی جو ہندو دھرم کی مقدس کتاب ہے اور اس کے اوپر دوسرے مذہبوں کی کتابیں۔

سوامی جی جب کمرے میں پہنچے تو ان کے میزبان نے کہا کہ سوامی جی اس کو دیکھئے اس پر آپ کا تبصرہ کیا ہے۔ ایک صورت یہ تھی کہ اس کو دیکھ کر سوامی جی بھڑک اٹھیں۔ وہ کہیں کہ میرے مذہب کی کتاب کو سب سے نیچے رکھ کر تم نے میرے مذہب کی بے عزتی کی ہے۔ کیا تم نے مجھے اسی توہین کے لئے بلایا تھا۔ اس کے بعد مہمان اور میزبان دونوں ایک دوسرے سے لڑ جاتے۔

لیکن سوامی جی نے ایسا نہیں کیا وہ کتاب کے منظر کو دیکھ کر مسکرائے اور آہستگی کے ساتھ اپنے میزبان سے کہا ـــــ فاؤنڈیشن تو بہت اچھی ہے:

The foundation is really good.

سوامی وویکانند کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ انھوں نے منفی واقعہ کو مثبت واقعہ میں ڈھال لیا۔ ایک بات جو بظاہر ناخوشگوار تھی اس کو انھوں نے خوشگوار صورت دے دی۔

یہی موجودہ دنیا میں زندگی کا راز ہے یہاں پھول کے ساتھ کانٹے بھی ہیں۔ یہاں اچھے انسانوں کے ساتھ برے انسان بھی ہیں۔ اسلئے یہاں بار بار آدمی کو کڑوا بول سننا پڑتا ہے۔ یہاں

آدمی کو نفرت کا تجربہ پیش آتا ہے۔ دوسروں کی طرف سے اس کو بے عزت کیا جاتا ہے۔

ایسے حالات میں موجودہ دنیا میں کامیابی کا راز صرف یہ ہے کہ آدمی پھول کے ساتھ کانٹوں سے بھی نباہ کرنا جانتا ہو، وہ نفرت کرنے والوں سے بھی محبت کر سکے، وہ اپنے خلاف باتوں میں بھی ایسے پہلو تلاش کر لے جو اس کے لئے موافق اور مفید ہوں۔

میری زندگی کا تجربہ ہے کہ انسان پتھر نہیں ہوتا۔ ہر انسان کے سینہ میں وہی نرم دل ہوتا ہے جو کسی دوسرے انسان کے سینہ میں ہے۔ اس دنیا میں پیدا ہونے والا ہر انسان انسان ہے، کوئی بھی انسان پیدائشی طور پر بھیڑیا نہیں۔

اگر کوئی آدمی کسی وجہ سے کڑوا بول بولے تو آپ اس کے لفظ کو نہ دیکھئے، آپ اس کے سینہ میں چھپے ہوئے نرم دل کو دیکھئے۔ آپ اس کے کڑوے بول کا اثر نہ لیتے ہوئے اس سے میٹھا بول بولئے۔ وہ آپ کو کانٹا دے تو آپ اس کو پھول کا تحفہ پیش کیجئے۔ اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وہی انسان جو بظاہر آپ کا دشمن دکھائی دے رہا تھا، وہ آپ کا دوست بن جائے گا۔

یہ تجربہ ہے کہ جب آدمی کے ساتھ کوئی پسند کے خلاف بات پیش آئے اور اس کو سن کر وہ غصہ ہو جائے تو اس کا اثر اس کی اپنی سوجھ بوجھ پر پڑتا ہے۔ اس کی عقل ٹھیک طور پر کام نہیں کر پاتی۔ اس کی وجہ سے وہ دوسروں کی بات کا زیادہ اچھا جواب نہیں دے پاتا۔

اگر آپ غصہ کی بات پر غصہ نہ ہوں تو اس کا سب سے پہلا فائدہ خود آپ کو ملتا ہے۔ آپ کی عقل نارمل رہتی ہے۔ آپ اس پوزیشن میں ہوتے ہیں کہ کسی بات کا زیادہ اچھا جواب دے سکیں۔ جو آدمی غصہ میں بھڑک اٹھے وہ صرف پتھر پھینک سکتا ہے۔ مگر جو آدمی اپنے آپ کو غصہ سے بچائے وہ دلیل کی زبان میں بولے گا، اور دلیل کی زبان پتھر کی زبان سے ہزار گنا زیادہ طاقتور ہے۔

مثبت ذہن کا آدمی اپنے پورے امکانات کے ساتھ جیتا ہے اور منفی ذہن کا آدمی صرف اپنے ادھورے امکانات کے ساتھ۔

نظر انداز کرنا

میرے اندر پیدائشی طور پر یہ بات ہے کہ میں ہر ایک کی بات کو غور سے سنتا ہوں اور اس سے سبق لینے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کا یہ فائدہ مجھے ملتا ہے کہ میں ہر ایک سے کچھ نہ کچھ کام کی بات سیکھ لیتا ہوں۔ ہر ایک سے مجھے کوئی ایسی تجربہ کی بات مل جاتی ہے جس میں سب کے لئے فائدہ ہو۔

ایک بار میں ایک گاؤں میں تھا۔ میں نے دیکھا کہ گاؤں کے دو آدمی آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے دوست تھے مگر ان میں سے ایک کو دوسرے سے کسی معاملہ میں شکایت ہو گئی۔ جس آدمی کو شکایت تھی وہ بار بار اپنی شکایت بیان کرتا تھا۔ دوسرے آدمی نے کافی کوشش کی کہ اس کی شکایت ختم ہو جائے مگر جب اس نے دیکھا کہ شکایت ختم نہیں ہو رہی ہے تو اس نے کہا کہ ـــــ شکایت والی بات کو بازو میں رکھ دو اور پھر ہم دونوں پہلے کی طرح رہنے لگیں گے۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے مگر وہ زندگی کا ایک بہت بڑا راز ہے۔ کوئی بھی دو آدمی ایک ڈھنگ کے نہیں ہوتے۔ جس طرح ایک آدمی کے انگوٹھے کا نشان دوسرے آدمیوں کے انگوٹھے کے نشان سے الگ ہوتا ہے اسی طرح ہر آدمی اپنی سوچ، اپنے جذبات اور اپنی پسند اور ناپسند کے لحاظ سے دوسرے تمام لوگوں سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ اب اس فرق و اختلاف کے ساتھ سماج میں خوشگوار زندگی کیسے گزاری جائے۔

اس کا آسان فارمولہ یہ ہے کہ جب کسی سے اختلاف پیدا ہو تو اس کو سمجھانے کی کوشش کی جائے اور اگر سمجھانے کے بعد بھی اختلاف اور شکایت دور نہ ہو تو دونوں اس بات پر راضی ہو جائیں کہ دونوں شکایت والی بات کو بازو میں رکھ دیں گے، وہ ایک دوسرے سے اس پر بحث نہیں کریں گے۔

یہ فارمولہ ہر جگہ کے لئے ہے۔ فیملی کے اندر بھی اور فیملی کے باہر بھی، اپنے لوگوں میں بھی اور اجنبی لوگوں میں بھی۔ اس دنیا میں سکھ کی زندگی بتانے کا اس سے زیادہ آسان فارمولہ اور کوئی نہیں۔

چوں کہ ہر آدمی کی سوچ الگ الگ ہے۔ اس لئے یہ ناممکن ہے کہ آپ دوسروں کو بالکل اپنے خیال کے مطابق بنا سکیں۔ اختلاف ایک فطری حقیقت ہے۔ وہ کسی حال میں ختم ہونے والا نہیں۔ ایسی حالت میں اگر آپ اختلاف کو مٹانا چاہیں تو اختلاف کبھی مٹنے والا نہیں۔ ایسی کوشش صرف آپ کو مزید پریشانی میں مبتلا کرے گی، وہ کبھی آپ کو سکھ اور چین دینے والی نہیں۔

ایسی حالت میں قابل عمل فارمولہ یہی ہے کہ شکایت والی بات کو بازو میں رکھ دیا جائے۔ اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ مل جل کر رہنے کی کوشش کی جائے۔

ہر آدمی سے آپ کو کوئی شکایت ہوتی ہے اسی کے ساتھ ہر آدمی میں کچھ ایسی باتیں ہوتی ہیں جو آپ کے لئے قابل شکایت نہ ہوں۔ اب آپ کو یہ کرنا ہے کہ شکایت والی بات کو بے شکایت والی بات سے الگ کردیں۔ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرتے ہی آپ محسوس کریں گے کہ دوسرا آدمی اسی طرح آپ کے لئے نارمل آدمی ہے جس طرح بہت سے دوسرے آدمی۔

موجودہ دنیا میں ہر آدمی مل جل کر رہنے پر مجبور ہے۔ تنہائی کی زندگی یہاں قابل عمل نہیں۔ آپ جب بھی دوسروں کے ساتھ مل جل کر رہیں گے یا مل کر کام کریں گے تو لازمی طور پر کوئی نہ کوئی شکایت یا اختلاف سامنے آئے گا۔ اس مسئلہ کا حل صرف یہ ہے کہ شکایت والی بات کو بھلا دیا جائے اور بے شکایت والی باتوں کی بنیاد پر لوگوں کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔

نظر انداز کرنا کوئی کمزوری کی بات نہیں۔ یہ زندگی کا ایک اعلیٰ اصول ہے۔ یہ ہر اس انسان کا طریقہ ہے جو اپنے سامنے کوئی بڑا مقصد رکھتا ہو۔ اس دنیا میں ناخوشگواریوں کو نظر انداز کرنے والے لوگ ہی آگے بڑھتے ہیں۔ جو لوگ نظر انداز نہ کر سکیں وہ درمیان میں الجھ کر رہ جائیں گے، وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچیں گے۔

مشکل نہیں

میری زندگی کا ایک بہت بڑا سبق وہ ہے جو مجھ کو قرآن سے ملا۔ اسلام کے شروع کے زمانہ میں جب مسلمان بہت تھوڑے تھے اور ان کے مخالفین ان کو بہت زیادہ ستاتے تھے۔ اس وقت ان کے ذہن میں یہ سوال تھا کہ مشکلات کے اس طوفان میں اپنا کام کس طرح کیا جائے۔

اس وقت قرآن میں ایک آیت اتری جس میں انھیں اس معاملہ میں رہنمائی دی گئی۔ وہ آیت یہ تھی: ان مع العسر یسرا یعنی مشکل سے نہ گھبراؤ، کیونکہ مشکل کے ساتھ ہی اس دنیا میں آسانی بھی موجود ہے۔ قرآن کی اس آیت میں یہ نہیں کہا گیا کہ مشکل کے بعد آسانی ہے بلکہ یہ فرمایا کہ مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ یعنی جہاں مشکل ہے وہیں اور عین اسی وقت آسانی بھی موجود ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں پرابلم کے ساتھ اس کا حل بھی موجود ہو۔ جہاں پرابلم یا کٹھنائی ہو وہیں ایسے مواقع (opportunities) بھی موجود ہوں جن کو استعمال کر کے آدمی آگے بڑھ سکے۔ اس دنیا میں پرابلم اور حل دو ایسے جوڑواں بھائی ہیں جو کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

میں اپنی زندگی میں کئی بار نقصان یا ناکامی سے دوچار ہوا ہوں مگر میں نے ہر بار اسی اصول کو استعمال کیا۔ چنانچہ جب بھی میں نے غور کیا تو میں نے پایا کہ جہاں پرابلم پیدا ہوا وہیں اس کا حل بھی موجود تھا۔ مثلاً یہ کہ جہاں اوسط درجہ کی محنت سے کام نہ بن رہا ہو وہاں آدمی زیادہ محنت کر کے اپنا کام بنا لے۔

میں نے ایک بار ایک منظر دیکھا۔ اسکول کے بچے تقریباً ایک سو کی تعداد میں اسکول سے نکل کر سڑک پر آگئے۔ وہ فٹ پاتھ پر چلنا چاہتے تھے مگر تنگ فٹ پاتھ پر وہ بھیڑ کی صورت میں نہیں چل سکتے تھے۔ انہوں نے اپنے استاد کی ہدایت پر یہ کیا کہ دو دو کی صورت میں لمبی قطار بنالی

اس طرح وہ آسانی کے ساتھ فٹ پاتھ سے گذر گئے۔ ایسا نہیں ہوا کہ وہ پوری سڑک پر پھیل کر ٹریفک کے لئے مسئلہ پیدا کریں۔

ان طالب علموں کے لئے دائیں اور بائیں پھیلنے کا موقع نہیں تھا۔ انھوں نے آگے اور پیچھے پھیل کر اپنا راستہ طے کر لیا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر میں نے یہ سمجھا کہ مشکل میں آسانی ہونے کا مطلب کیا ہے۔ یہ ایک مثال ہے جو اس معاملہ کو بہت خوبی کے ساتھ بتا رہی ہے۔ سڑک کے سفر کا یہ واقعہ زندگی کے دوسرے تمام معاملات میں رہنمائی دے رہا ہے۔

مشکل میں آسانی کا یہ معاملہ نیچر کا ایک اٹل قانون ہے۔ اس کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ نیچر کا یہ طریقہ ہے کہ جب بھی کہیں ایک مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو وہ خود ہی اپنے آپ اس کے حل کی طرف دوڑ پڑتی ہے۔ وہ ایک خود کار نظام کی طرح مشکل کے ساتھ آسانی لاتی ہے۔

مثلاً ایک شخص جب کسی مشکل صورت حال سے دوچار ہوتا ہے تو نیچر کے پراسس کے تحت اپنے آپ اس کے دماغ کے ذرّات اور زیادہ متحرک ہو جاتے ہیں۔ اس کی ذہنی دنیا میں ایک نئی بیداری آجاتی ہے۔ وہ پہلے سے زیادہ سوچنے لگتا ہے۔ اس طرح وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ زیادہ بڑھی ہوئی سوچ اور زیادہ بڑھی ہوئی طاقت سے آئی ہوئی مشکل کو حل کر سکے۔

آپ کے راستہ میں چٹان حائل ہو تو اس کے کنار ے سے اپنا راستہ نکال لیجئے۔ ٹکراؤ کے ذریعہ جو مسئلہ حل نہ ہو رہا ہو اس کا حل صابرانہ تدبیر میں دریافت کیجئے۔ جہاں بولنا بظاہر کار آمد نہ ہو وہاں خاموشی کا اسلوب اختیار کیجئے۔ جو کام جسمانی طاقت کے ذریعہ بنتا ہوا نظر نہ آئے وہاں عقل و دانش کی طاقت کو استعمال کیجئے۔

یہی موجودہ دنیا میں کامیاب زندگی کی تعمیر کا واحد اصول ہے۔ اس دنیا میں کامیاب وہ ہے جو اس اصول کو دریافت کر کے اسے اپنے حق میں استعمال کرے اور ناکام وہ ہے جو فطرت کے اس اصول کو دریافت نہ کر سکے اور نتیجۃً اپنے عمل کی درست منصوبہ بندی میں ناکام رہے۔

جلدی نہیں

جب میں نوجوان تھا اور یوپی کے ایک گاؤں میں رہتا تھا تو مجھے یہ شوق ہوا کہ میرے گھر کے آنگن میں آم کا ایک درخت ہو۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ میں آم کا ایک چھوٹا پودا اپنے آنگن میں لگاؤں اور سالوں تک اس کے بڑھنے کا انتظار کروں۔ مگر نوجوانی کے جوش میں میں اس انتظار کے لئے تیار نہ تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اچانک ہی میرے گھر میں آم کا ایک بڑا سا درخت دکھائی دینے لگے۔

وہاں میرا آموں کا باغ تھا۔ اس میں پانچ سال کا ایک درخت تھا جو بڑھتے بڑھتے انسانی قد سے اونچا ہو چکا تھا۔ اور خوب ہرا بھرا تھا۔ میں نے کئی مزدور اس پر لگا دیئے۔ وہ دن بھر اس کی کھدائی کرتے رہے آخر کار شام کو وہ درخت ایک بڑی چارپائی پر رکھ کر گھر کے اندر لایا گیا اور آنگن میں گڈھا کھود کر اس کو وہاں لگا دیا گیا۔

میں بہت خوش تھا کہ میں نے بڑا درخت لگا کر پانچ سال کا سفر ایک دن میں طے کر لیا ہے۔ مگر رات کو سو کر جب میں صبح کو اٹھا تو درخت کے پتے مرجھائے ہوئے نظر آئے۔ لیکن ابھی میں مایوس نہیں ہوا۔ میں نے اس میں خوب پانی ڈالا میں نے سمجھا کہ پانی پا کر اس کے پتے ہرے ہو جائیں گے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ اگلے دن اس کے پتے اور زیادہ مرجھا گئے۔ یہاں تک کہ چند دنوں میں وہ درخت بالکل سوکھ گیا۔

نوجوانی کی عمر کا یہ تجربہ میرے لئے بہت سخت ثابت ہوا۔ وہ میرے لئے زندگی بھر کا تجربہ بن گیا۔ اس سے میرے اندر گہرائی کے ساتھ یہ سوچ پیدا ہوئی کہ زندگی میں کوئی شارٹ کٹ نہیں۔ زندگی ایک لمبا سفر ہے اور اس کو ہر حال میں لمبے دنوں ہی میں پورا کرنا ہے۔

اس واقعہ کے بعد مجھ پر یہ کھلا کہ دنیا میں انسان کا معاملہ ففٹی ففٹی جیسا ہے۔ یعنی دنیا میں جو کام بھی کرنا ہو اس میں ایک حصہ انسان کا ہوتا ہے اور دوسرا حصہ نیچر کا۔ دنیا میں ہر واقعہ انسان اور نیچر دونوں کی مطابقت سے پورا ہوتا ہے۔ انسان اگر جلدی چاہے اور نیچر کا طریقہ جلدی کا طریقہ نہ ہو تو ایسی حالت میں محض انسان کے چاہنے سے کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں۔ اس واقعہ نے مجھے ہمیشہ کے لئے اس معاملہ میں محتاط بنادیا۔

انسان اور نیچر کی مثال کاگ وہیل جیسی ہے۔ کاگ وہیل میں دونوں کاگ ایک ساتھ چلتے ہیں۔ اگر ایک کاگ اپنی رفتار کو دوسرے کاگ سے تیز کرنا چاہے تو سارا نظام بگڑ کر رہ جائے گا۔ انسان کا کاگ کمزور ہے اور نیچر کا کاگ طاقت ور۔ ایسی حالت میں اگر انسان اپنی کاگ کی رفتار بڑھانا چاہے تو اس کا انجام صرف یہ ہوگا کہ انسان کا کاگ ٹوٹ جائے۔ کیونکہ نیچر کا کاگ تو اتنا طاقتور ہے کہ وہ کسی حال میں ٹوٹنے والا نہیں۔

درخت کے معاملہ میں مجھ کو جو تجربہ ہوا، وہ میری زندگی کا آخری تجربہ بن گیا۔ اس کے بعد پھر میں نے کبھی ایسا نہیں کیا کہ جو کام دھیرے دھیرے ہونے والا ہو اس کو اچانک کرنا چاہوں۔ اس کے بعد ہر کام میں میں یہ سوچنے لگا کہ اس کا حقیقی اسٹارٹنگ پوائنٹ کیا ہے۔ کیونکہ اس دنیا میں آپ درمیان سے یا آخر سے اپنا سفر شروع نہیں کرسکتے۔ آپ کو ہر حال میں وہیں سے اپنا سفر شروع کرنا ہے جہاں سے نیچر کے مطابق وہ شروع ہوتا ہے۔

جو نتیجہ کل نکلنے والا ہو اس نتیجہ کو آج چاہنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ فطرت کے نظام سے لڑنے کے ہم معنی ہے۔ یہ دنیا کے اندر ایک اور دنیا بنانا ہے۔ اس قسم کی کوشش کبھی کامیابی تک پہنچنے والی نہیں۔ اس دنیا میں انسان کی ہر کامیابی فطرت کے نظام سے مطابقت کرکے حاصل ہوتی ہے۔ فطرت کے نظام سے لڑنے والا آدمی یہاں اپنے لئے کچھ نہیں پاسکتا۔ یہ ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جس میں کوئی استثناء نہیں۔

عبرت ناک

عراق کے صدر صدام حسین نے ۲ اگست ۱۹۹۰ کو اپنی فوجیں کویت میں داخل کر دیں اور اس پر قبضہ کر لیا۔ یہ واضح طور پر ایک جارحانہ فعل تھا۔ اس کے بعد ۶ اگست کو بغداد میں امریکہ کے قائم مقام سفیر جوزف ولسن نے صدام حسین سے ملاقات کی اور انھیں امریکی صدر جارج بش کا پیغام پہنچایا۔ امریکی سفیر نے ڈپلومیٹک انداز میں صدام حسین کو متنبہ کیا کہ انھوں نے جارحیت کا فعل کیا ہے۔ کویت سے ان کے جو اختلافات تھے، اس کو انھیں باہمی بات چیت سے حل کرنا چاہئے تھا نہ کہ طاقت کے استعمال سے۔ صدام حسین اس وقت فاتحانہ جوش میں تھے۔ انھوں نے امریکی سفیر کو جو جواب دیا وہ انگریزی رپورٹنگ میں ان الفاظ میں نقل کیا گیا تھا:

Give my regards to President Bush and tell him that Al-Sabah family has now become history.

صدر بش کو میرا اسلام پہنچائیے اور ان سے کہہ دیجئے کہ کویت کا شاہی خاندان الصباح اب تاریخ کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ صدام حسین نے اس کے اگلے دن ۷ اگست کو مزید یہ اعلان کر دیا کہ کویت اب "کویت" نہیں رہا۔ وہ اب عراق کا ۱۹واں صوبہ ہے۔

مگر کہانی یہیں ختم نہیں۔ اس کے بعد کویت کی درخواست پر امریکہ براہ راست سامنے آگیا۔ اس نے صدام حسین کو وارننگ دی کہ وہ ۱۵ جنوری ۱۹۹۱ تک اپنی فوجیں کویت سے نکال کر واپس لے جائیں۔ مگر صدام حسین نے اس الٹی میٹم کو نظر انداز کر دیا۔ اس کے بعد ۱۷ جنوری ۱۹۹۱ کو امریکہ نے عراق کے اوپر زبردست حملہ کیا۔ صدام کی فوجیں اس کے دفاع میں سراسر ناکام رہیں۔ یکم مارچ ۱۹۹۱ کو یہ جنگ عراق کی بدترین شکست پر ختم ہوگئی۔

اس کے بعد امریکہ نے چاروں طرف سے عراق کی ناکہ بندی کر دی۔ اس ناکہ بندی نے عراق کی اقتصادیات کو تباہ کر دیا۔ چنانچہ صدام حسین نے مجبور ہو کر امریکہ کے تمام مطالبات کو مان لیا۔ آخر کار ۱۰ نومبر ۱۹۹۴ کو صدام حسین کی قیادت میں عراقی پارلیمنٹ کا اجلاس ہوا۔ اس میں متفقہ طور پر یہ رزولیوشن پاس کیا گیا کہ عراق ایک آزاد ریاست (independent state) کے طور پر

کویت کو تسلیم کرتا ہے۔

عراق کے ڈپٹی پرائم منسٹر طارق عزیز نے ۴ا نومبر ۱۹۹۴ کو اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل سے نیویارک میں ملاقات کی اور ان کو تحریری طور پر عراق کے اس فیصلہ سے مطلع کر دیا۔ (ٹائمس آف انڈیا ۱۵ نومبر ۱۹۹۴)

صدام حسین کویت کو تاریخ کا حصہ بنانا چاہتے تھے مگر وہ خود تاریخ کا حصہ بن گئے۔ اس فعل سے انھوں نے ثابت کیا کہ وہ صرف اپنے حال کو جانتے تھے، اپنے مستقبل کے بارہ میں وہ آخری حد تک بے خبر بنے ہوئے تھے۔

یہی موجودہ دنیا میں ہر انسان کی کہانی ہے۔ ہر آدمی اپنے آج کو جانتا ہے، اپنے کل کو وہ نہیں جانتا۔ اپنی کارروائی کی اسے خبر ہے۔ مگر خدا کے فرشتے اس کے خلاف جو کارروائی کر رہے ہیں، اس کی اسے خبر نہیں۔ وہ سمجھتا ہے کہ میں دوسروں کے بارہ میں فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں ہوں، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خود اپنے بارہ میں فیصلہ کرنے کی طاقت سے بھی محروم ہے۔

اس واقعہ میں یہ سبق ہے کہ دوسرے کی زمین پر کسی کے لئے اپنی ترقی کا جھنڈا اگاڑنا ممکن نہیں۔ دوسرے کی ملکیت کو چھین کر اپنا رقبہ بڑھانے کی اسکیم اس دنیا میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس دنیا میں ہر آدمی کو زندہ رہنے اور ترقی کرنے کا حق ہے لیکن کوئی شخص دوسرے کو مٹا کر اپنی ترقی میں اضافہ نہیں کر سکتا۔

واقعات بتاتے ہیں کہ اپنی حد کے اندر رہتے ہوئے جو ترقی حاصل کی جاتی ہے وہ ترقی مستحکم ہوتی ہے اور وہ مسلسل باقی رہتی ہے۔ اس کے برعکس جو آدمی دوسرے کا حصہ چھین کر اپنے کو ترقی یافتہ بنانا چاہے اس کی ترقی میں استحکام نہ ہو گا۔ ایسا آدمی آخر کار دگنا محرومی سے دوچار ہوتا ہے۔ وہ اپنے حاصل شدہ حصہ کو بھی کھو دیتا ہے، اور دوسرے کا حصہ تو اسے ملنے والا ہی نہ تھا۔

کوئی شخص خواہ وہ معمولی حیثیت کا ہو یا وہ سیاسی اقتدار کا مالک ہو، کسی بھی حال میں وہ زندگی کے اس قانون سے مستثنیٰ نہیں۔ کوئی بھی شخص اتنا طاقتور نہیں کہ وہ اس قانون سے بچ جائے، وہ اس قانون کو اپنے اوپر نافذ نہ ہونے دے۔ یہ قانون کسی ایک شخص کے لئے جتنا اٹل ہے اتنا ہی وہ دوسروں کے لئے بھی اٹل ہے۔

اصل مسئلہ

مولانا شکیل احمد قاسمی (۳۸ سال) مدرسہ امداد الاسلام، میرٹھ میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث ہیں۔ ۱۸ دسمبر ۱۹۹۳ کو دہلی میں ان سے ملاقات ہوئی۔ انھوں نے اپنا ایک تجربہ بتایا جو نہایت سبق آموز ہے۔

انھوں نے کہا کہ نومبر ۱۹۹۲ میں صدر بازار (میرٹھ) کے ایک تعلیم یافتہ ہندو مسٹر اندرجیت سنگھ اہلو والیا ان کے مدرسہ میں آئے۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنے دو لڑکوں، گورو اہلو والیا اور چارلی اہلو والیا کو اُردو اور عربی زبان پڑھانا چاہتا ہوں۔ آپ ان کے لیے کسی ٹیوٹر کا انتظام کر دیں۔ مولانا قاسمی نے پوچھا کہ آپ ان بچوں کو اُردو، عربی کیوں پڑھانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ میرے بچوں میں کھلا ذہن پیدا ہو۔ وہ تنگ نظری سے اوپر اٹھ کر سوچنے والے بنیں۔ واضح ہو کہ مسٹر اندرجیت سنگھ اہلو والیا کا تعلق آر ایس ایس سے ہے اور وہ بھارتیہ جنتا پارٹی کے ایکٹو ممبر ہیں۔

مولانا شکیل احمد قاسمی نے سوچا کہ اگر میں مدرسہ کے کسی طالب علم کو اس کام پر مقرر کردوں تو شاید وہ ٹھیک سے اس کو انجام نہ دے سکے۔ چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود ہی اس کام کو کریں گے۔ انھوں نے جب مسٹر اہلو والیا سے یہ بات کہی تو ان کو بہت تعجب ہوا۔ تاہم مولانا قاسمی کے اصرار پر انھوں نے اس کو قبول کر لیا۔ اب انھوں نے پوچھا کہ مولانا صاحب، ہم کو ماہوار کتنا دینا ہوگا۔ مولانا قاسمی نے کہا کہ کچھ نہیں۔ یہ تو میرے لیے ایک خوشی کا کام ہے۔ میرے لیے یہی قیمت کافی ہے کہ ایک ایسے حلقہ میں جہاں اُردو ختم ہو رہی ہے وہاں کچھ لوگ اُردو اور عربی جاننے والے پیدا ہو جائیں گے۔ غرض کچھ دیر کی بحث کے بعد طے ہو گیا کہ مولانا قاسمی ان کے گھر پر جاکر ان کے بچوں کو اردو پڑھایا کریں گے۔

مولانا شکیل احمد قاسمی نے مولانا اسماعیل میرٹھی کی ریڈر سے ان بچوں کو اردو پڑھانا شروع کیا۔ یہ سلسلہ یکم دسمبر ۱۹۹۲ کو شروع ہوا اور اب تک وہ بدستور جاری ہے۔ اس مدت میں ان ہندو بچوں نے کئی ریڈریں ختم کر لی ہیں۔ وہ اب صحیح املا لکھ لیتے ہیں اور اُردو اخبار (مثلاً قومی آواز) کو آسانی سے پڑھ لیتے ہیں۔ اب انھوں نے منہاج العربیۃ کے ذریعہ سے عربی پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ اس وقت وہ منہاج العربیۃ کا دوسرا حصہ پڑھ رہے ہیں۔ ان کے گھر میں اُردو کا اتنا چرچا ہوا کہ اب خود مسٹر اندرجیت سنگھ اہلو والیہ نے بھی مولانا قاسمی سے اردو پڑھنا شروع کر دیا ہے۔ انھوں نے اردو

کتابوں کے علاوہ بازار سے ضخیم فیروز اللغات بھی خرید لی ہے تاکہ اردو سیکھنے میں وہ ان کے لیے معاون ہو سکے۔

اس تعلیم کا مزید اثر یہ ہوا ہے کہ اہلو والیا فیملی میں "اردو تہذیب" آنا شروع ہوگئی ہے۔ وہ لوگ گفتگو میں ان شاء اللہ، ما شاء اللہ، خدا حافظ جیسے الفاظ کو استعمال کرنے لگے ہیں۔

مسٹر اہلو والیہ ہر طرح مولانا شکیل احمد قاسمی کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔ وہ ہر موقع پر ان کے ساتھ تعاون کے لیے تیار رہتے ہیں۔ مثلاً مسٹر اہلو والیہ ایک ہندو علاقہ میں رہتے ہیں۔ چنانچہ مولانا قاسمی جب ان کے یہاں سے پڑھا کر نکلتے ہیں تو وہ اپنے بچوں کو ان کے ساتھ دور تک بھیجتے ہیں تاکہ لوگ انھیں اجنبی محسوس نہ کریں۔

یہ ایک مثال ہے جو بتاتی ہے کہ موجودہ ہندستان میں ہمارا مسئلہ کیا ہے۔ موجودہ ہندستان میں ہمارا مسئلہ "ہندو فرقہ واریت" نہیں ہے، بلکہ اصل مسئلہ ہندو مسلم دوری ہے۔ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کسی بھی ذریعہ سے ملنا جلنا شروع ہو جائے تو اس کے بعد تمام مسائل اس طرح ختم ہو جائیں گے جیسے کہ وہ تھے ہی نہیں۔

دوری غلط فہمی پیدا کرتی ہے اور قربت سے دوستی پیدا ہوتی ہے۔ عام تجربہ ہے کہ جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوری آئی وہاں ساتھ ساتھ غلط فہمیاں بھی آگئیں۔ اور جہاں میل ملاپ بڑھا وہاں اپنے آپ ایک دوسرے سے اچھے تعلقات قائم ہو گئے۔

۱۹۴۷ سے پہلے ہندستان زرعی دور میں تھا، اس وقت زراعتی زندگی کے تحت فطری طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں بار بار ملنے کی صورتیں پیدا ہوتی تھیں۔ آزادی کے بعد ہندستان میں صنعتی دور آگیا۔ صنعتی دور کے تقاضے کے تحت خاندان منتشر ہو گئے۔ لوگ ادھر اُدھر جانے لگے۔ اس طرح مشترک زندگی کا نظام ٹوٹ گیا۔ پچھلے تعلقات باقی نہیں رہے۔ موجودہ زمانہ میں دونوں فرقوں میں دوری کا بڑا سبب یہی ہے۔

اس کا حل یہ ہے کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ تعلیمی اداروں میں جائیں۔ جدید اقتصادی اور سماجی سرگرمیوں میں بڑھ کر حصہ لیں۔ نیز اس انداز کے کام بھی کریں جس کی ایک مثال مولانا شکیل احمد قاسمی کا مذکورہ واقعہ ہے۔ اس کے بعد انشاء اللہ دوبارہ میل ملاپ کا سابقہ دور واپس آجائے گا۔

انسان کی طاقت

بمبئی کے ایک ۱۸ سالہ مسیحی نوجوان نے خودکشی کر لی۔ اس کا نام گرین ویل گومس (Greenwell Gomes) تھا۔ اخباری رپورٹ کے مطابق، اس سال اس نے ایچ ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا، اب وہ بی کام میں داخلہ لینا چاہتا تھا۔ مگر اس کو بتایا گیا کہ پندرہ ہزار روپیہ "عطیہ" دیے بغیر اس کا داخلہ نہیں ہو سکتا۔ گومس کے ذہن کو اس سے بہت سخت جھٹکا لگا۔ یہاں تک کہ پریشانی کے عالم میں اس نے خودکشی کر لی (روزنامہ ہندستان۔ بمبئی، جولائی ۱۹۹۳)

دوسری طرف اسی ملک میں ایک اور مثال موجود ہے۔ ایک شخص کو اپنے بیٹے کے علاج کے لیے اچھے اسپتال میں داخلہ نہیں ملا۔ صرف اس لیے کہ اچھے اسپتال کی قیمت ادا کرنے کے لیے اس کی جیب میں پیسے نہیں تھے۔ اس آدمی نے طے کیا کہ میں خود ایک ایسا اسپتال کھولوں گا جو اچھا بھی ہوگا، اور اسی کے ساتھ اس میں داخلہ سے کوئی شخص اس لیے محروم نہیں رہے گا کہ وہ اس کی فیس نہیں ادا کر سکتا تھا۔ وہ اس مہم میں لگ گیا۔ یہاں تک کہ وہ ایسا ایک اسپتال قائم کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ یہ اسپتال آج کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ ہزاروں لوگ اس سے معالجاتی فائدہ حاصل کر چکے ہیں۔

اس طرح کے فیصلہ کن مواقع ہر شخص کی زندگی میں آتے ہیں۔ اس وقت اس کا ذہن جس طرف مڑ جائے، بس اسی طرف وہ چلنے لگتا ہے۔ ایسے مواقع پر ضرورت ہوتی ہے کہ آدمی کو ایسا تعمیری رہنما مل جائے جو اس کو منفی سمت میں مڑنے سے بچا سکے۔ جو اس کو وہاں فکری سہارا دے جہاں اس کا اپنا ذہن سوچنے میں عاجز ثابت ہو رہا ہے۔

مذکورہ نوجوان کے لیے یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی زندگی میں پیش آنے والے تعلیمی واقعہ کو رکاوٹ کے بجائے چیلنج سمجھے۔ وہ پندرہ ہزار روپیہ کا عطیہ مانگنے والوں سے کہے کہ اگر تم سمجھتے ہو کہ تم میرا راستہ روک سکتے ہو تو تم بہت بڑی بھول میں مبتلا ہو۔ تم انسان کو انڈر اسٹیمیٹ کر رہے ہو۔ ایک انسان کی طاقت اس سے زیادہ ہوتی ہے کہ کوئی اس کی زندگی میں حائل ہو سکے۔ کوئی اس کو آگے بڑھنے سے روک دے۔

اس کے بعد وہ نوجوان یہ طے کرتا کہ میں ایک ایسا تعلیمی ادارہ کھولوں گا جہاں نوجوان طالب علموں کو عطیہ یا رشوت دیے بغیر داخلہ مل سکتا ہو۔ اگر وہ اس قسم کا فیصلہ کرکے اس کو اپنی زندگی کا مشن بنالیتا اور استقلال کے ساتھ اس مہم میں لگ جاتا تو عین ممکن تھا کہ وہ ایک نیا شاندار تعلیمی ادارہ بنانے میں کامیاب ہو جائے جہاں عطیہ کے بغیر صرف میرٹ کی بنیاد پر داخلہ دیا جاتا ہو۔

اس دنیا میں ناکامی کا سب سے بڑا سبب بے حوصلگی ہے اور کامیابی کا سب سے بڑا راز حوصلہ مندی۔ مذکورہ نوجوان کی خودکشی کا سبب یہ تھا کہ وہ بے ہمت ہوگیا۔ اگر وہ بے ہمت نہ ہوتا۔ اور نئے تعلیمی ادارہ کے قیام کو اپنا مشن بنالیتا تو وہ دیکھتا کہ اسی دنیا میں بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کی حمایت کریں، جو اس کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کریں۔ پہلے تجربہ میں بظاہر وہ اکیلا ہوگیا تھا، مگر دوسرے تجربہ میں وہ اکیلا نہ رہتا۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے کہ :

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے ہزارہا شجر سایہ دار راہ میں ہیں

یہ شعر دہلی میں سب سے پہلے مجھے ایک تاجر نے سنایا تھا۔ وہ ایک تاجر خاندان میں پیدا ہوا۔ مگر بعض اسباب سے اس کے ساتھ یہ المیہ پیش آیا کہ وہ بالکل اکیلا ہوگیا۔ اس کے پاس دہلی میں نہ گھر رہا اور نہ کاروبار۔

یہ حادثہ اس کے ساتھ نوجوانی کی عمر میں پیش آیا۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وہ معمولی سامان لے کر فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا۔ صبح سے شام تک وہ محنت کرتا۔ اس کے بعد بمشکل چند روپیہ کماتا، مگر ہر قسم کے ناموافق حالات کے باوجود اس نے اپنی محنت جاری رکھی۔ یہاں تک کہ اس کو مددگار ملنے شروع ہو گئے۔

کسی تاجر نے اس کو ادھار مال دینا شروع کیا۔ کسی نے اس کو ایک دکان دلوادی۔ کسی نے گھر حاصل کرنے میں مدد کی۔ اس طرح وہ ایک کے بعد ایک زندگی کے زینے طے کرتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ دہلی کا ایک کامیاب تاجر بن گیا۔

آدمی اگر مستقل مزاجی کے ساتھ ایک راستہ کو پکڑلے۔ اور اسی کے ساتھ وہ بااصول اور باکردار بھی ہو تو ایک نہ ایک دن وہ کامیاب ہو کر رہتا ہے۔ کوئی بھی چیز اس کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے سے روکنے والی نہیں۔

گھر سے محرومی

۲۸ مارچ ۱۹۹۵ کو دہلی میں ایک بڑا دردناک واقعہ ہوا۔ مسز اندو واہی (۶۱ سال) نے کستوربا گاندھی مارگ کی بلڈنگ (ایشیا ہاؤس) کی آٹھویں منزل سے کود کر خودکشی کرلی۔ نیچے آتے ہی ان کا پورا جسم کچل اٹھا اور فوراً ہی ان کا انتقال ہوگیا۔

مسز اندو واہی آل انڈیا ریڈیو کے ہندی شعبہ میں چیف نیوز ریڈر تھیں۔ پچھلے سال ان کو وہاں سے ریٹائرمنٹ مل گیا۔ ایشیا ہاؤس ایک سرکاری بلڈنگ ہے۔ اس کی پہلی منزل پر ان کو دو کمروں کا ایک فلیٹ برائے رہائش ملا ہوا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اب انھیں یہ فلیٹ خالی کرنا تھا جس میں وہ پچھلے ۲۰ سال سے رہ رہی تھیں۔ فلیٹ چھوڑنے کی آخری تاریخ ۳۱ مارچ تھی۔ ان کے شوہر کا انتقال ۱۹۸۹ میں ہوگیا تھا۔ اب وہ اپنی بیٹی سونیا اور اپنے داماد اشوک کمار کے ساتھ یہاں رہ رہی تھیں (ہندستان ٹائمس ۲۹ مارچ ۱۹۹۵)

ریٹائرمنٹ کے بعد اندو واہی بہت پریشان تھیں۔ انھوں نے اگرچہ جمنا پار کی ریڈیو کالونی میں اپنا ایک گھر بنا لیا تھا۔ مگر ان کو یہ خیال پریشان کئے ہوئے تھا کہ موجودہ سرکاری فلیٹ کناٹ پلیس کے علاقہ میں ہے اور اس کی وجہ سے انھیں بہت سی سہولتیں حاصل ہیں مگر جمنا پار جانے کے بعد وہ ان شہری سہولتوں سے محروم ہو جائیں گی۔ یہ احساس ان پر اتنا زیادہ طاری ہوا کہ ایشیا ہاؤس کی آخری منزل پر چڑھ کر انھوں نے خودکشی کی چھلانگ لگا دی۔

میں نے اس خبر کو پڑھا تو اچانک میری زبان سے نکلا کہ —— انسان آج اچھے گھر کو چھوڑ کر معمولی گھر میں جانے کو برداشت نہیں کر پاتا۔ اس دن انسان کا کیا حال ہوگا جب وہ ہر قسم کے گھر سے محروم کر دیا جائے گا۔

انسان خودکشی نہ کرے تب بھی اس پر موت آتی ہے۔ موت کے بعد اچانک وہ محسوس کرے گا کہ اس کا تمام اثاثہ اس سے چھن چکا ہے۔ اس دن تمام گھر والے بے گھر ہو چکے ہوں گے۔ اس دن گھر والا صرف وہ ہوگا جس سے خدا خوش ہو اور اپنی طرف سے اس کو ایک گھر عطا کرے۔ اور اس کو اپنی جنت میں قیام کی اجازت دیدے۔

صورتحال نے ثابت کیا ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ پہلے کوئی انقلاب برپا کیا جائے تب ہی مذکورہ مقاصد حاصل ہوں گے۔ میں اپنے زمانے میں موریتانیا کے اندر پانچ یا چھ انقلابات دیکھ چکا ہوں یہی حال یمن اور سوڈان کا ہے۔ میں نے حکمرانوں کو بدلتے ہوئے دیکھا ہے۔ یمن میں الشعبی، سالم البیض، صالح، علی عنتر، عبد الفتاح، الغشمی، الحمدی، یہ سب میرے معاصر رہے ہیں۔ اسی طرح سوڈان میں مثلاً نمیری تھے ان کے بعد صادق المہدی آئے، پھر سوار الذہب اور سوار الفضہ۔ میرے زمانے میں کئی انقلابات، حکمرانوں کے قتل اور حکومتوں کی تبدیلی کے واقعات ہوئے مگر وہ سب کے سب بے سود ثابت ہوئے۔ جس چیز کو بدلنا اور ترقی دینا ممکن ہے وہ ہمارا موجودہ طریق کار ہے تاکہ وہ یورپ کی طرح ہو جائے۔ یعنی اتحاد کے حصول کے لئے (بات چیت کے ذریعہ) یقین دہانی کا طریقہ اختیار کیا جائے۔ اس طریقہ کو استعمال کر کے ہم عرب لیگ کے دستور کو بدل سکتے ہیں اور اپنے درمیان ایک اقتصادی اور دفاعی اتحاد قائم کر سکتے ہیں۔ ہر شخص جہاں ہے وہ وہیں رہے، بادشاہ اپنی جگہ صدر اپنی جگہ، سلطان اپنی جگہ۔ کیوں کہ تجربہ سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس قسم کی علامتوں کو ہٹانا ہمارے مسئلہ کا حل نہیں۔ جہاں تک جنگ فلسطین کا معاملہ ہے تو اس سلسلہ میں جنوبی افریقہ کو دیکھئے جہاں جنگ کے بغیر اسی نوعیت کا مسئلہ حل کر لیا گیا۔ جب کہ اس سے پہلے میرا کہنا تھا کہ سفید فام نسل کو نابود کئے بغیر وہ حل ہونے والا نہیں۔ آزادئ فلسطین کے لئے بھی ضروری نہیں کہ ہم جنگ چھیڑیں۔ اگر فلسطینی لوگ اپنی سرزمین میں واپس آجائیں اور ان کی ۵ یا ٦ ملین تعداد یہودیوں کے ساتھ ایک جمہوری نظام حکومت میں شرکت پر راضی ہو جائے۔ تو بالآخر ان کا مسئلہ مکمل طور پر حل ہو جائے گا۔

معمر قذافی نے لیبیا کے سابق شاہ ادریس کو ملک کی خرابیوں کا اصل سبب سمجھا اور فوجی انقلاب کے ذریعہ ۱۹٦۷ میں ان کا خاتمہ کر دیا۔ مگر انقلاب کے باوجود وہ نتائج حاصل نہ ہو سکے جو اس سے متوقع تھے۔ یہی حال اکثر مسلم ملکوں میں ہوا ہے۔ ہر انقلاب صرف افراد کی تبدیلی کے ہم معنی ثابت ہوا نہ کہ حالات کی تبدیلی کے ہم معنی۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی حکمراں کو برائی کی علامت قرار دے کر اس کے خلاف مہم چلانا ایک طفلانہ حرکت ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف تخریبی تحریکیں ہیں، ان کو انقلابی اور اصلاحی تحریک وہی شخص سمجھ سکتا ہے جس کو نہ تاریخ کی خبر ہو اور نہ انسانی نفسیات کی۔

جاننے کی کوشش

نوجوانی کی عمر میں، جبکہ ابھی میں پڑھ رہا تھا، ہماری کلاس میں ایک روز اونٹ کا ذکر آیا اس کے بعد استاد نے پوچھا، یہ بتاؤ کہ اونٹ کے سُم پھٹے ہوتے ہیں یا جُڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ یعنی بیل کے سُم کی طرح پھٹے ہوئے یا گھوڑے کی سُم کی طرح جڑے ہوئے۔

ہماری کلاس میں اس وقت دو درجن اسٹوڈنٹ تھے مگر کوئی بھی یقین کے ساتھ اس کا جواب نہ دے سکا۔ محض اٹکل کے تحت کسی نے کہا کہ پھٹے ہوئے ہوتے ہیں کسی نے کہا کہ جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔

اس کے بعد استاد نے ایک تقریر کی۔ انھوں نے کہا کہ یہ ایک سادہ سوال تھا مگر تم میں سے کوئی بھی شخص یقین کے ساتھ اس کا جواب نہ دے سکا۔ اس کا سبب کیا ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ تم اونٹ کے سم کے بارے میں نہیں جانتے اور تم اپنے اس نہ جاننے کو بھی نہیں جانتے۔ یہی بات ہے جو عربی زبان کی ایک مثل میں اس طرح کہی گئی ہے: **لا ادری نصف العلم** (میں نہیں جانتا، یہ کہنا آدھا علم ہے)۔

استاد نے کہا کہ جب میں نے تم لوگوں سے پوچھا کہ اونٹ کے سُم پھٹے ہوتے ہیں یا جڑے تو تم میں سے کسی شخص نے بھی یہ نہیں کہا کہ میں نہیں جانتا۔ حالانکہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ تم اس سے بے خبر تھے۔ اگر تم اپنے اس نہ جاننے کو جانتے تو تمہارے اندر وہ چیز پیدا ہو جاتی جس کو اسپرٹ آف انکوائری (spirit of enquiry) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد تم کو اس کے بارے میں جاننے کا شوق ہو جاتا۔ جب بھی تمہارے سامنے سے اونٹ گزرتا تو تم فوراً اس کے سُم کو دیکھتے اور پھر تم کو یقین کے ساتھ معلوم ہو جاتا کہ اونٹ کے سُم کیسے ہوتے ہیں، پھٹے یا جڑے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ بیشتر لوگ اپنی بے خبری سے واقف نہیں ہوتے یہی وجہ ہے کہ وہ بے خبری کی حالت میں پڑے رہتے ہیں اور کبھی اس سے نکل نہیں پاتے۔

کسی انسان کیلئے اسپرٹ آف انکوائری کی بے حد اہمیت ہے۔ علم کا آغاز اپنی بے خبری کو جاننے ہی سے ہوتا ہے۔ جو آدمی اپنے نہ جاننے کو جانے وہ کوشش کر کے اپنے علم کو بڑھاتا رہتا ہے، وہ ہر چیز کو تجسّس کی نظر سے دیکھتا ہے اس کے برعکس جس آدمی کو اپنے نہ جاننے کی خبر نہ ہو وہ بدستور بے خبری کی حالت میں پڑا رہے گا، وہ اپنے نہ جاننے کو جاننا بنانے میں ناکام رہے گا۔

سائنس کی تمام تحقیقات اسی اسپرٹ آف انکوائری کا نتیجہ ہیں۔ موجودہ زمانہ میں کائنات یا نیچر کے بارے میں انسان کو جو ان گنت معلومات حاصل ہوئی ہیں وہ سب اسی اسپرٹ آف انکوائری کی بدولت ممکن ہو سکی ہیں۔ کائنات کی یہ چیزیں لاکھوں سال سے یہاں موجود تھیں مگر قدیم زمانے کا انسان ہر چیز کو بلا تحقیق مان لینے کا عادی تھا۔ عدم تلاش کا یہی جذبہ کائنات کے بھیدوں تک پہنچنے میں رکاوٹ بنا رہا۔

موجودہ زمانہ میں مختلف اسباب کے تحت ایسا ہوا کہ انسان ہر چیز کی حقیقت کو جاننے کی کوشش کرنے لگا۔ اسی کا نام اسپرٹ آف انکوائری ہے، اور اسی اسپرٹ آف انکوائری نے انسان کو موجودہ تمام دریافتوں تک پہنچایا ہے۔

آدمی خواہ جو ترقی بھی حاصل کرنا چاہتا ہو، اس میں اس کے لئے اسپرٹ آف انکوائری کی بے حد اہمیت ہے کسی آدمی کے اندر یہ جذبہ جتنا زیادہ بیدار ہو گا اتنا ہی زیادہ وہ اپنی معلومات کو بڑھائے گا، اور اتنا ہی زیادہ وہ ترقی کرتا چلا جائے گا۔

موجودہ زمانے کو معلومات کا دور (age of information) کہا جاتا ہے۔ موجودہ زمانہ میں معلومات کا دائرہ بے حد وسیع ہو گیا ہے۔ ایسی حالت میں اسپرٹ آف انکوائری کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔ پہلے زمانہ میں تھوڑی کوشش سے آدمی زیادہ پالیتا ہے، اب زیادہ کوشش کے بعد بھی وہ صرف کم کو پا سکتا ہے۔ ایسی حالت میں معلومات کو بڑھانے کا کام موجودہ زمانہ میں ہمیشہ سے زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ کافی معلومات کے بغیر موجودہ زمانہ میں کوئی بڑی ترقی ممکن نہیں۔

ایک اقتباس

ریاض کے عربی ماہنامہ الفیصل (ذوالقعدہ ۱۴۱۳ھ، مئی ۱۹۹۳) میں ایک مضمون بعنوان الاطفال قلبی شائع ہوا ہے۔ اس مضمون میں اسرائیل کے سابق وزیر جنگ موشے دایان (۱۹۸۱-۱۹۱۵) کا ایک تبصرہ اپنے حریف عربوں کے بارہ میں نقل کیا گیا ہے۔ یہ تبصرہ عربی حوالہ میں اس طرح ہے :

"یمیل العرب الی خداع انفسهم وخداع غیرهم، وهم یقومون بذلك عن غیر عمد۔ فهم یمیلون دائما الی التحدث عن امجاد الاجداد، عن صلاح الدین، عن معارك حطین والیرموك، وبینما یفعلون ذلك فاننا نبتسم لانهم یرون انفسهم فی مرآة امجاد الماضی، اما نحن فنراهم فی مرآة الحاضر، لیتهم یسألون انفسهم لماذا یتحدثون دائما عن عظماء ماضیهم ولا یجدون فی حاضرهم احدا من العظماء یتحدثون عنه؟"

عرب اپنے آپ کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں اور دوسروں کو بھی دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ اور ایسا وہ کسی قصد و ارادہ کے بغیر کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ اپنے اجداد کی بڑائی کا چرچا کرتے ہیں صلاح الدین کا اور حطین اور یرموک کے معرکوں کا۔ اور جب وہ ایسا کرتے ہیں تو ہم ان پر ہنس پڑتے ہیں۔ کیوں کہ وہ اپنے آپ کو ماضی کی بڑائی کے آئینہ میں دیکھتے ہیں اور ہم ان کو حال کے آئینہ میں دیکھتے ہیں۔ کاش وہ اپنے آپ سے پوچھتے کہ کیوں وہ ہمیشہ اپنے ماضی کے بڑوں کی بات کرتے ہیں۔ وہ اپنے حال میں کوئی بڑا نہیں پاتے جس کی وہ بات کریں (صفحہ ۳)

یہ معاملہ صرف عربوں کا نہیں، بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کا یہی حال ہے۔ آج ہر جگہ کے مسلمان اپنے گزرے ہوئے بڑوں کے تذکرہ پر جی رہے ہیں۔ حالانکہ گزرے ہوئے سورماؤں کے تذکرہ میں جینا اپنے لیے افیون ہے اور اغیار کے لیے مضحکہ کا ایک سامان۔

صحیح اور مفید بات یہ ہے کہ خود اپنا احتساب کیا جائے۔ اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کو معلوم کرکے ان کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ پچھلے بڑوں کا چرچا کرکے خوش ہونا آدمی کو صرف جھوٹے بھرم میں مبتلا کرتا ہے۔ یہ صرف وقت کا ضیاع ہے نہ کہ وقت کا کوئی استعمال۔

موشے دایان کا یہ جملہ بہت بامعنی ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو اپنی ماضی کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اور ہم ان کو ان کے حال کے اعتبار سے دیکھتے ہیں۔ اسی بات کو ایک مغربی مبصر نے اس طرح بیان کیا کہ مسلمانوں کا کیس موجودہ زمانہ میں پیرانوئیا (paranoia) کا کیس بن گیا ہے۔

پیرانوئک کیرکٹر وہ ہے جو پدرم سلطان بود کی نفسیات میں جینے لگے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اپنے بارہ میں فخر میں مبتلا رہتے ہیں۔ مگر دوسرے لوگوں سے انھیں اس کے خلاف تجربہ ہوتا ہے۔ کیونکہ دوسرے لوگ ان کو ان کے حال کے مطابق دیکھتے ہیں اور ان کے حال کے اعتبار سے ان کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگ نفرت اور جھنجلاہٹ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ لوگ ہماری حیثیت کے مطابق ہمارا اعتراف نہیں کر رہے ہیں۔

گزرے ہوئے لوگوں کی بڑائی میں جینا، اپنے نتیجہ کے اعتبار سے صرف ہلاکت ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔ اس میں بیک وقت دو بڑے نقصانات چھپے ہوئے ہیں۔

ایک یہ ہے کہ جو لوگ اس نفسیات میں مبتلا ہوں وہ خود فکری اور خود عملی کی صلاحیت کھو دیتے ہیں۔ ان کی سوچ پچھلوں کی سوچ کے دائرہ میں چلتی ہے۔ وہ پچھلے لوگوں کے کارناموں کا مبالغہ آمیز تذکرہ کرنے کو عمل کا قائم مقام سمجھ لیتے ہیں۔ ایسے لوگ کبھی خود عمل کرنیوالے نہیں بن سکتے۔

دوسرا نقصان یہ ہے کہ دوسرے لوگ جن کے درمیان انھیں جینا ہے، ان کے بارہ میں وہ نہایت خلاف واقعہ رائے قائم کر لیتے ہیں۔ یہ دوسرے لوگ چونکہ انھیں ان کے حال کے اعتبار سے دیکھتے ہیں اس لیے وہ انھیں زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ دوسروں کا یہ رویہ اگرچہ تمام تر حقیقت پر مبنی ہوتا ہے لیکن بزرگوں کے قصوں میں جینے والے لوگ اس کو اپنے سے کم تر سمجھ لیتے ہیں، اس لیے وہ خلاف واقعہ طور پر یہ یقین کر لیتے ہیں کہ دوسرے لوگ سب کے سب ان کے دشمن ہیں۔

ایسے لوگ یا تو عمل نہیں کرتے۔ یا اگر وہ عمل کرتے ہیں تو ان کی منصوبہ بندی ہمیشہ اس مفروضہ پر ہوتی ہے کہ دوسرے لوگ سب کے سب ان کے حق میں ظالم اور متعصب ہیں۔ ایسی منصوبہ بندی مبنی برحقائق نہیں ہوتی، اور جو منصوبہ بندی مبنی برحقائق نہ ہو، اس کے لیے خدا کی اس محکم دنیا میں کامیاب ہونا بھی مقدر نہیں۔

وقت کا استعمال

میں نے وقت کو برباد کیا تھا، اب وقت مجھے برباد کر رہا ہے ـــــــ اگر آپ نے اپنے پچھلے دنوں میں وقت کو استعمال نہیں کیا ہے تو آپ اپنے اگلے دنوں میں اپنے وقت کو استعمال کرنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ اس طرح آپ کی بربادی بڑھتی ہی چلی جائے گی۔

وقت کسی آدمی کا سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے۔ وقت اس لئے ہے کہ آدمی اس کو استعمال کرکے اپنے کو کامیابی کا اہل بنائے۔ جو آدمی وقت کو ضائع کرے اس نے صرف وقت کو ضائع نہیں کیا بلکہ خود اپنے آپ کو بھی ضائع کر دیا۔ کیوں کہ اس قسم کی غفلت کا نقصان اس کی اپنی ذات کے سوا کسی اور کو پہنچنے والا نہیں۔

جو وقت آپ کو ملا ہے اس کو یا تو اپنی تیاری میں استعمال کیجئے یا اپنے مقصد کے حصول کے لئے جدوجہد میں۔ یہی وقت کا صحیح استعمال ہے۔ اگر ایسا ہے کہ آپ نہ تیاری میں لگے ہوئے ہیں اور نہ حصولِ مقصد کی جدوجہد میں، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے وقت کو ضائع کر رہے ہیں۔

ملے ہوئے وقت کو ضائع کرنا بلاشبہ سب سے بڑا نقصان ہے۔ یہ ایسا نقصان ہے جس کی کوئی تلافی ممکن نہیں۔ آپ کھوئی ہوئی دولت کو دوبارہ کما سکتے ہیں۔ مگر آپ کھوئے ہوئے وقت کو دوبارہ لوٹا کر اپنی طرف واپس نہیں لا سکتے۔

وقت دولت ہے، بلکہ وقت ہی دولت ہے۔ وقت کے ذریعہ آپ دوسری چیزوں کو حاصل کرسکتے ہیں۔ مگر آپ دوسری چیزوں کے ذریعہ وقت کو خرید نہیں سکتے۔ اس لئے آپ کو چاہئے کہ وقت کے معاملہ میں سب سے زیادہ چوکنا رہیں۔

وقت بھاگ رہا ہے، وقت کو پکڑ لئے، کیوں کہ وقت آپ کو نہیں پکڑے گا۔ آپ کو خود وقت کو پکڑنا ہوگا۔

جو آدمی وقت کو کھو دے، اس کے حصہ میں آخر کار صرف یہ آئے گا کہ وہ وقت کو گزرتا ہوا دیکھے مگر وہ اس کو استعمال نہ کر سکے۔

دل جیتنا

زندگی کا اصول ایک لفظ میں یہ ہے کہ ـــــ جیسا دینا ویسا پانا۔ اگر آپ دوسروں کو نفرت دے رہے ہوں تو آپ کو بھی دوسروں سے نفرت ملے گی۔ اگر آپ کے پاس دوسروں کو دینے کے لئے محبت کا تحفہ ہے تو دوسروں کی طرف سے بھی آپ کو محبت کا تحفہ دیا جائے گا۔ اگر آپ اپنے سماج میں مسائل کو حل کرنے کا ذریعہ بنے ہوئے ہوں تو پورا سماج آپ کو اپنے سردار کے روپ میں دیکھنے لگے گا۔

خدا نے خدمت اور نفع بخشی میں بے پناہ کشش رکھی ہے۔ اس میں یہ طاقت ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں کو مسخر کر سکے۔ ایسا آدمی لوگوں کے درمیان اپنے آپ مقبولیت حاصل کر لیتا ہے۔ اس کو دوسروں سے وہ سب کچھ مل جاتا ہے جو وہ چاہتا تھا، کیوں کہ اس نے بھی دوسروں کو وہ سب کچھ دے دیا تھا جن کو وہ اپنے لئے چاہتے تھے۔

دوسروں کے خیر خواہ بن جایئے اور پھر آپ کو دوسروں سے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ دسروں کے کام آیئے اور پھر آپ کا بھی کوئی کام اٹکا ہوا نہیں رہے گا۔

اس دنیا میں ہر آدمی مجبور ہے کہ وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی گزارے، یہاں کسی کے لئے بھی تنہا زندگی گزارنا ممکن نہیں۔ ایسی حالت میں بار بار یہ سوال سامنے آتا ہے کہ دوسروں کے ساتھ رہنے کا کامیاب طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ لوگوں کو جھکانے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ خود جھک جایئے۔ لوگوں سے لینے کی کوشش نہ کیجئے بلکہ دینے والے بنئے۔ شکایتوں کو مسئلہ نہ بنایئے بلکہ شکایتوں کو بھول جایئے۔ اختلاف کو ٹکراؤ کا موضوع نہ بنایئے بلکہ اختلاف کے باوجود لوگوں کے ساتھ اچھا معاملہ کیجئے۔ کوئی شخص بظاہر آپ کا دشمن نظر آئے تب بھی اس سے نفرت نہ کیجئے۔ یہی دل کو جیتنے کا طریقہ ہے اور جب دل کو جیت لیا جائے تو اس کے بعد کوئی اور چیز جیتنے کے لئے باقی نہیں رہتی۔

انتظار بھی حل ہے

مختلف زبانوں میں جو مثلیں مشہور ہیں وہ دراصل لمبے انسانی تجربات کے بعد بنی ہیں۔ان میں سے ہر مثل کامیابی کا ایک یقینی فارمولہ ہے۔ اسی طرح کی ایک انگریزی کہاوت یہ ہے ـــــ انتظار کرو اور دیکھو:

Wait and see.

امریکہ کا مشہور رائٹر ہنری ڈیوڈ تھارو (Henry David Thoreau) ۱۸۱۷ میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۲ میں اس نے وفات پائی۔اس کا ایک قول ہے کہ ہیرو وہ ہے جو یہ جانے کہ کہاں انتظار کرنا ہے اور کہاں جلدی کرنا ہے۔ ہر بھلائی اس انسان کے حصہ میں آتی ہے جو دانش مندانہ طور پر انتظار کرے:

The hero knows how to wait as well as to make haste.
All good abides with him who waiteth wisely.

زندگی میں بعض اوقات ایسے لمحے آتے ہیں جب کہ آدمی کو فوری طور پر ایک فیصلہ کرنا ہوتا ہے۔ تاہم اگر آدمی فوری فیصلہ کرنے میں چوک جائے تو اس کے بعد اس کے لئے جو چیز ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ گھبرا کر یا جلد بازی میں بے فائدہ کارروائیاں کرنے لگے۔اب اس کو انتظار کرنا چاہئے۔ عقلمند وہ ہے جو اس فرق کو جانے کہ کب فوری فیصلہ لینا ہے اور کب معاملہ کو انتظار کے خانہ میں ڈال دینا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انتظار بھی ایک عمل ہے۔انتظار کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔انتظار کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی نے اپنے معاملہ کو فطرت کے نظام کے حوالہ کردیا۔ وہ خدا کے فیصلہ کا منتظر بن گیا۔

اگر وقت پر صحیح فیصلہ لینا کامیابی ہے تو ناموافق حالات میں انتظار کی پالیسی اختیار کرنا بھی کامیابی ہے،فرق صرف یہ ہے کہ ایک کا نتیجہ حال میں نکلتا ہے اور دوسرے کا نتیجہ مستقبل میں۔

سوچ کا فرق

فریڈرک لینگ برج (Frederick Langbridge) انگریزی کا ایک شاعر ہے۔ وہ ۱۸۴۹ میں پیدا ہوا، ۱۹۲۳ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس کا ایک شعر ہے کہ رات کے وقت دو آدمی جنگلے کے باہر دیکھتے ہیں۔ ایک شخص کیچڑ دیکھتا ہے اور دوسرا شخص ستارہ:

Two men look out through the same bars
One sees the mud, and one the stars.

یہی بات ایک فارسی شاعر نے زیادہ بہتر طور پر اس طرح کہی ہے کہ میرے اور تمہارے درمیان جو فرق ہے وہ سننے کا فرق ہے۔ ایک آواز آتی ہے۔ تم اس کو دروازہ بند کرنے کی آواز سمجھتے ہو اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ دروازہ کھلنے کی آواز ہے:

تفاوت است میانِ شنیدنِ من و تو
تو غلق باب و من فتح باب می شنوم

درخت میں کانٹے کے ساتھ پھول بھی ہوتا ہے۔ یہی حال انسانی سماج کا ہے۔ سماجی حالات بظاہر خواہ کتنے غیر موافق ہوں، ہمیشہ اس کے اندر موافق پہلو بھی ساتھ ساتھ موجود رہتا ہے۔ ایک شخص جو چیزوں کو صرف ظاہری طور پر دیکھنے کی نگاہ رکھتا ہو، وہ سطحی چیزوں کو دیکھے گا، اور زیادہ گہرے پہلوؤں کو دیکھنے میں ناکام رہے گا۔ مگر جو شخص گہری نظر رکھتا ہو وہ زیادہ دور تک دیکھے گا اور ناموافق پہلو کے ساتھ موافق پہلو کو دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔

اس دنیا میں کیچڑ بھی ہے اور یہاں ستارے بھی ہیں۔ یہ دیکھنے کی بات ہے کہ کون شخص کس چیز کو دیکھتا ہے اور کون شخص کس چیز کو۔ ایک ہی آواز ہے، مگر نادان آدمی اس کو دیکھ کر یہ سمجھ لیتا ہے کہ دروازہ بند ہو گیا۔ اور دانش مند آدمی سمجھتا ہے کہ دروازہ اس کے لیے کھول دیا گیا ہے۔

تمام مسائل ہمیشہ ذہن میں پیدا ہوتے ہیں، اور ذہن کے اندر ہی ان کو ختم کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ آدمی کے اندر صحیح سوچ کا مادہ پیدا ہو جائے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دنیا عقل کا امتحان ہے، جو شخص اپنی عقل کو استعمال کرے گا وہ اپنے لیے راستہ پالے گا، اور جو شخص عقل کو استعمال نہیں کرے گا اس کے لیے بربادی کے سوا کوئی انجام مقدر نہیں۔

سمندر میں موجوں کے تھپیڑے ہیں۔ جو شخص سمندر میں اپنی کشتی چلانا چاہے وہ مجبور ہے کہ موج اور طوفان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی کشتی مطلوبہ منزل کی طرف لے جائے۔ جنگل میں جھاڑیاں اور درندے ہیں، جو جانور جنگل میں رہتے ہیں، ان کے لیے اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں کہ وہ کانٹے دار جھاڑیاں اور اپنے دشمن جانوروں کے درمیان اپنے لیے زندگی کا طریقہ نکالیں۔

ایسا ہی کچھ معاملہ انسانی سماج کا بھی ہے۔ انسانوں کے اندر بھی طرح طرح کے لوگ ہیں۔ ان کے مفادات ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ مختلف اسباب سے ایک اور دوسرے کے بیچ میں ناخوش گواریاں پیدا ہوتی ہیں۔ یہ اونچ نیچ اور یہ فرق سماجی زندگی میں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ باقی رہیں گے۔ کسی حال میں انھیں ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ایسی حالت میں انسان کے لیے زندگی اور کامیابی کا صرف ایک ہی ممکن راستہ ہے —— وہ "باوجود" کے اصول کو اپنی پالیسی بنائے۔ وہ مخالفتوں کے باوجود لوگوں کو اپنا موافق بنانے کی کوشش کرے۔ وہ ناخوش گواریوں کے باوجود اپنے لیے خوشگوار زندگی کا راز دریافت کرے۔ اس کے خلاف عداوتیں اور سازشیں کی جائیں تب بھی وہ اس یقین کے ساتھ آگے بڑھے کہ وہ اپنے مثبت عمل سے تمام منفی باتوں کا خاتمہ کر سکتا ہے۔

اس دنیا میں آدمی کو کانٹے کے باوجود پھول تک اپنا ہاتھ پہونچانا ہوتا ہے۔ یہاں بیماریوں کے بے شمار جراثیم کے باوجود اپنے آپ کو تندرست اور صحت مند بنانا پڑتا ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں آدمی کو یہ کرنا ہے کہ وہ ناموافق حالات کو دیکھ کر مایوس نہ ہو۔ اور نہ شکایت اور احتجاج میں اپنا وقت ضائع کرے۔ وہ ان حقائق سے موافقت کر کے جئے جن کو وہ بدل نہیں سکتا۔ وہ راستہ کے ان پتھروں سے کترا کر نکل جائے جو اس کے سفر میں حائل ہو رہے ہوں۔ لوگوں کی مخالفانہ باتوں پر مشتعل ہونے کے بجائے وہ تدبیری حکمت کے ذریعہ ان سے نپٹنے کی کوشش کرے۔ وہ کم ملنے پر راضی ہو تاکہ آئندہ اس کو زیادہ دیا جائے۔ وہ دشمنی پر صبر کرے تاکہ آج جو اس کے دشمن ہیں کل وہ اس کے دوست بن جائیں۔

تدبیر نہ کہ ٹکراؤ

مولانا جلال الدین رومی (۱۲۰۷ - ۱۲۷۳) کا درجہ مسلمانوں میں بہت اونچا ہے۔ تقریباً ۲۶ ہزار اشعار پر مشتمل ان کی مثنوی معنوی مسلمانوں کے درمیان تقدس کی حد تک مقبول ہے۔ یہ مثنوی صدیوں تک ایک رہنما کتاب کی حیثیت سے علما کے درمیان پڑھی جاتی رہی ہے۔

۱۲۵۸ میں تاتاریوں نے بغداد کو تباہ کیا اور عباسی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ انھوں نے مسلم دنیا پر اپنی ظالمانہ حکومت قائم کر دی۔ اس وقت مولانا روم کی عمر تقریباً پچاس سال تھی۔ انھوں نے اپنی مثنوی کے ذریعہ مسلمانوں کو روحانی اور اخلاقی سبق دیا اور انھیں اوپر اٹھانے کی کوشش کی۔

اسی کے ساتھ انھوں نے وقت کے مسائل میں بھی مسلمانوں کو رہنمائی دی۔ انھوں نے اپنی فارسی مثنوی میں حکایت اور تمثیل کی زبان میں مسلمانوں کو بتایا کہ ان حالات میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ایک سبق آموز کہانی شیر اور خرگوش کی کہانی ہے جو مثنوی کے "دفتر اول" میں تفصیل کے ساتھ بیان ہوئی ہے۔ اس کہانی کا خلاصہ یہ ہے :

جنگل میں ایک شیر تھا۔ وہ ہر روز اپنی بھوک مٹانے کے لیے جانوروں پر حملہ کرتا تھا۔ اور پکڑ کر انھیں اپنی خوراک بناتا تھا، اس کے نتیجہ میں تمام جانور مستقل طور پر دہشت اور خوف میں پڑے رہتے تھے۔ آخر انھوں نے اس کا ایک حل نکالا۔ انھوں نے شیر سے بات کر کے اس کو اس پر راضی کیا کہ وہ ان پر حملہ نہ کرے۔ وہ خود اپنی طرف سے ہر روز ایک جانور اس کے پاس بھیج دیا کریں گے۔

اس تجویز پر عمل ہونے لگا۔ اس کی صورت یہ تھی کہ ہر روز قرعہ کے ذریعہ یہ طے کیا جاتا کہ آج کون سا جانور شیر کی خوراک بنے گا۔ جس جانور کے نام قرعہ نکلتا اس کو شیر کے پاس بھیج دیا جاتا۔ اس طرح تمام جانور امن کے ساتھ جنگل میں رہنے لگے۔ آخر کار قرعہ ایک خرگوش کے نام نکلا۔ یہ خرگوش پہلے سے سوچے ہوئے تھا کہ جب میرے نام قرعہ نکلے گا تو میں اپنے آپ کو شیر کی خوراک بننے نہیں دوں گا۔ بلکہ تدبیر کے ذریعہ خود شیر کو ہلاک کر دوں گا۔

سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق، خرگوش ایک گھنٹہ کی تاخیر کے ساتھ شیر کے پاس پہنچا۔ شیر بہت بھوکا تھا وہ تاخیر کی بنا پر اس کے اوپر بگڑ گیا۔ نیز صرف ایک چھوٹا خرگوش دیکھ کر اس کو اور بھی زیادہ غصہ آیا۔

خرگوش نے نرمی اور لجاجت سے کہا کہ جناب، بات یہ ہے کہ آپ کی سلطنت میں ایک اور شیر آگیا ہے۔ جانوروں نے آپ کی آج کی خوراک کے لیے دو خرگوش بھیجے تھے، مگر دوسرا شیر ہمارے اوپر جھپٹا۔ ایک کو تو اس نے پکڑ لیا۔ میں کسی طرح بھاگ کر آپ کے پاس آیا ہوں۔

اب شیر کا غصہ دوسرے شیر کی طرف مڑ گیا۔ اس نے چلا کر کہا کہ دوسرا شیر کون ہے جس نے اس جنگل میں آنے کی جرأت کی ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ تاکہ میں اس کا قصہ تمام کر دوں۔ اب خرگوش کے ساتھ شیر روانہ ہوا۔ خرگوش نے شیر کو اِدھر اُدھر گھمایا اور آخر میں اس کو ایک کنویں کے کنارے لاکر کھڑا کر دیا اور کہا کہ حضور، وہ شیر اس کے اندر موجود ہے، آپ خود اس کو دیکھ لیں۔

شیر نے کنویں کے اوپر سے جھانکا تو نیچے پانی میں اس کو اپنا عکس نظر آیا۔ اس نے سمجھا کہ خرگوش کا کہنا درست ہے اور واقعتہً اس کے اندر ایک اور شیر موجود ہے۔ شیر غرایا تو دوسرا شیر بھی غرا اٹھا۔ اپنی سلطنت میں اس طرح ایک اور شیر کا گھس آنا اس کو برداشت نہیں ہوا۔ وہ چھلانگ لگا کر مفروضہ شیر کے اوپر کود پڑا۔ اور پھر کنویں میں پڑا پڑا مر گیا۔

اس طرح ایک خرگوش نے تدبیر کی طاقت سے شیر جیسے دشمن کا خاتمہ کر دیا۔ مولانا روم آخر میں کہتے ہیں کہ اس کی تدبیر کا جال گویا شیر کا پھندا تھا۔ کیسا عجیب تھا وہ خرگوش جو ایک شیر کو اچک لے گیا :

دام مکر او کمند شیر بود   طرفہ خرگوشے کہ شیرے را ربود

یہ حکایت کی زبان میں ایک رہنمائی تھی جو مولانا روم نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں کو دی۔ مولانا روم نے مسلمانوں کو مجاہدانہ اقدام پر نہیں ابھارا۔ انھوں نے یہ نہیں کہا کہ جنگل کے تمام باسیوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو کر شیر کے اوپر حملہ کر دیں۔ اگر انھوں نے شیر کو مار ڈالا تو وہ غازی کا لقب پائیں گے۔ اور اگر شیر ان کو مارنے میں کامیاب ہو گیا تب بھی کوئی نقصان نہیں۔ کیوں کہ ایسی صورت میں وہ سب کے سب شہید قرار دیے جائیں گے۔ اور جس کو شہادت کا درجہ ملے اس کو بہت بڑا درجہ مل گیا۔

مولانا روم نے اس کے برعکس مسلمانوں کو حکیمانہ تدبیر کی طرف رہنمائی دی۔ انھوں نے موت کے بجائے زندگی کا طریقہ بتایا۔ ان کی بتائی ہوئی حکیمانہ تدبیر میں انسان کو ابتداءً چھوٹا بننا پڑتا ہے مگر آخری مرحلہ میں پہنچ کر وہ بڑائی اور فتح کے بلند مقام کو پالیتا ہے۔

مولانا روم کی یہ نصیحت حال کے لیے بھی اتنی ہی کارآمد ہے جتنی وہ ماضی کے لیے کارآمد تھی۔

دوسرا موقع

ریڈرز ڈائجسٹ فروری ۱۹۸۷ میں ایک مضمون شائع ہوا ہے، اس کا عنوان ہے:

Dare to Change Your Life

(اپنی زندگی کو بدلنے کی جرأت کرو) اس مضمون میں کئی ایسے واقعات دیے گیے ہیں جن میں ایک شخص کو ابتداءً ناکامی پیش آئی۔ وہ نقصانات اور مشکلات سے دوچار ہوا۔ مگر اس نے حوصلہ نہیں کھویا۔ ایک موقع کو کھونے کے باوجود اس کی نظر دوسرے موقع پر لگی رہی۔ یہ تدبیر کارگر ہوئی۔ ایک بار ناکام ہو کر اس نے دوسری بار کامیابی حاصل کرلی۔

مضمون کے آخر میں مضمون نگار نے لکھا ہے کہ زندگی دوسرے مواقع سے بھری ہوئی ہے۔ دوسرے موقع کو استعمال کرنے کے لیے جو کچھ درکار ہے وہ صرف یہ صلاحیت ہے کہ آدمی اس کو پہچانے اور حوصلہ مندانہ طور پر اس پر عمل کرے:

Life is full of second chances. All we need for a second chance is the ability to recognize it and the courage to act.

زندگی سکنڈ چانس (دوسرے موقع) کو استعمال کرنے کا نام ہے —— یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو فرد کے لیے بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی قوم کے لیے۔ پوری تاریخ اس حقیقت کی تصدیق کرتی ہے۔ دور اول میں اسلام کو مکہ میں موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد اسلام نے مدینہ کے موقع کو استعمال کرکے اپنی تاریخ بنائی۔ مغربی قومیں صلیبی جنگوں میں اپنے لیے موقع نہ پاسکیں تو انھوں نے علمی مواقع کو استعمال کرکے دوبارہ کامیابی کا مقام حاصل کیا، وغیرہ۔

موجودہ دنیا میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی پہلے موقع کو کھو دیتا ہے۔ کبھی اپنے ناقص تجربہ کی وجہ سے اور کبھی دوسروں کی سرکشی کی وجہ سے۔ مگر پہلے موقع کو کھونے کا مطلب ایک موقع کو کھونا ہے نہ کہ سارے مواقع کو کھونا۔ پہلا موقع کھونے کے بعد اگر آدمی مایوس نہ ہو تو جلد ہی وہ دوسرا موقع پائے گا جس کو استعمال کرکے وہ دوبارہ اپنی منزل پر پہونچ جائے۔

جن مواقع پر دوسرے لوگ قابض ہو چکے ان کو ان سے چھیننے کی کوشش کرنا عقل مندی نہیں۔ عقل مندی یہ ہے کہ جو مواقع ابھی باقی ہیں ان پر قبضہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

ٹائمس آف انڈیا ۱۳ اپریل ۱۹۸۹ (سکشن ۲، صفحہ ۴) میں نیویارک کی ڈیٹ لائن کے ساتھ ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس کا عنوان ——— سپر کمپیوٹر میں امریکہ سے آگے بڑھ جانے کے لیے جاپان کی کوشش:

Japan's bid to excel the US in supercomputers

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ سپر کمپیوٹر کے میدان میں امریکہ کا طویل مدت کا غلبہ اب مشتبہ ہو گیا ہے۔ امریکہ کی ایک کارپوریشن کے تجزیہ کاروں نے مطالعہ کے بعد یہ اعلان کیا ہے کہ جاپان کا بنایا ہوا ایک سُپر کمپیوٹر ۱۹۹۰ میں مارکیٹ میں آجائے گا۔ یہ دنیا کی سب سے زیادہ تیز کام کرنے والی مشین ہوگی۔

جاپانیوں نے اس نئے کمپیوٹر کا نام ایس ایکس ایکس (SX-X) رکھا ہے۔ اس کی رفتار اتنی زیادہ ہے کہ وہ ایک سکنڈ میں سائنٹفک قسم کے حساب کے ۲۰ بلین آپریشن کر سکتا ہے۔ یہ جاپانی کمپیوٹر امریکہ کے تیز ترین کمپیوٹر سے ۲۵ فیصد زیادہ تیز رفتار ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ کامل صحت کارکردگی کے ساتھ نسبتاً وہ کم خرچ بھی ہے۔

اس سُپر کمپیوٹر کی اہمیت صرف سائنٹفک ریسرچ، تیل کی تلاش اور موسم کی پیشین گوئی جیسی چیزوں ہی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ وہ نیشنل سیکورٹی کے لیے بھی بے حد اہم سمجھا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ نیوکلیر ہتھیاروں کی تیاری میں بہت زیادہ استعمال کیا جاتا ہے۔

نئے جاپانی کمپیوٹر نے دنیا کو ایک نئے صنعتی دور میں پہونچا دیا ہے۔ موجودہ کمپیوٹر جو کسی زمانہ میں "جدید" سمجھے جاتے تھے، اب وہ روایتی اور تقلیدی بن کر رہ گیے ہیں۔ حتیٰ کہ جاپان کی اس ایجاد نے اس کو خود فوجی میدان میں بھی برتری عطا کر دی ہے۔

امریکہ نے "سپر بم" بنا کر ۱۹۴۵ میں جاپان کو تباہ کر دیا تھا۔ مگر وہ جاپان سے یہ امکان نہ چھین سکا کہ وہ "سُپر کمپیوٹر" بنا کر دوبارہ نئی زندگی حاصل کر لے اور صرف ۴۵ سال کے اندر تاریخ کا رُخ موڑ دے۔ تخریب، خواہ وہ کتنی ہی بڑی ہو، وہ تعمیر نو کے مواقع کو ختم نہیں کرتی، اور تعمیر کی طاقت، بہر حال تخریب کی طاقت سے زیادہ ہے۔

کامیابی کا ٹکٹ

امریکہ میں ایشیائی ملکوں سے آئے ہوئے جو لوگ آباد ہیں ان کو عام طور پر ایشیائی امریکی (Asian American) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر ۱۹۶۵ کے بعد یہاں آئے۔ امریکہ میں ان کی موجودہ تعداد تقریباً ۲ فی صد ہے۔ ان میں کچھ یہودی ہیں، کچھ بدھسٹ ہیں، کچھ کنفیوشش کو ماننے والے ہیں۔ اور اسی طرح بعض دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

امریکہ میں اپنے مستقبل کی تعمیر کا مطلب اگر وہ یہ سمجھتے کہ ان کے فرقہ کا آدمی صدر کے عہدہ پر پہونچ جائے تو انھیں امریکہ میں اپنے لیے ترقی کا دروازہ بالکل بند نظر آتا۔ کیوں کہ صدر کے عہدہ کے لیے امریکہ کا پیدائشی شہری (natural-born citizen) ہونا ضروری ہے، اور ایشیائی لوگ اس تعریف میں نہیں آتے۔ صدارت کو اپنا نشانہ بنانے کی صورت میں ایشیائی مہاجرین یا تو مایوسی کا شکار ہوتے یا اس بات کی ناکام مہم چلاتے کہ امریکی دستور میں ترمیم کرکے صدارت کی اس شرط کو ختم کیا جائے تاکہ ان کا آدمی بھی صدر کے عہدہ کے لیے جائز امیدوار بن کر کھڑا ہوسکے۔

مگر ایشیائی امریکیوں نے اس قسم کی حماقت نہیں کی۔ انھوں نے اپنے واقعی حالات کے اعتبار سے امریکہ کا جائزہ لیا تو انھیں نظر آیا کہ یہاں ان کے جیسی اقلیت کے لیے اگرچہ صدارتی عہدہ تک پہونچنے کے مواقع نہیں ہیں، مگر اعلیٰ تعلیمی عہدوں تک پہونچنے کے مواقع پوری طرح موجود ہیں۔ انھوں نے پایا کہ تعلیم ان کے لیے کامیابی کے ٹکٹ (ticket to success) کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنی ساری طاقت تعلیم کے حصول میں لگادی۔ چنانچہ انھیں زبردست کامیابی حاصل ہوئی۔ حتیٰ کہ تعداد میں ۲ فی صد ہوتے ہوئے وہ اعلیٰ تعلیمی اداروں میں ۲۰ فی صد سیٹوں تک پر قابض ہوگیے۔

یہی دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ کچھ مواقع آدمی کے لیے کھلے ہوئے ہوتے ہیں اور کچھ مواقع اس کے لیے کھلے ہوئے نہیں ہوتے۔ آدمی کی بہترین عقل مندی یہ ہے کہ وہ کھلے ہوئے مواقع کو استعمال کرکے آگے بڑھنے کی کوشش کرے۔ اگر اس نے بند دروازوں سے سر ٹکرایا تو دروازہ تو نہیں کھلے گا، البتہ اس کا سر ضرور ٹوٹ جائے گا۔ خاص طور پر تعلیم آج کی دنیا میں کامیابی کا ٹکٹ ہے، اور اس ٹکٹ کو حاصل کرنے کے مواقع ہر آدمی کے لیے ہر جگہ کھلے ہوئے ہیں۔

یہ اصول جو افراد کی ترقی کا راز ہے، وہی ملکوں اور قوموں کی ترقی کا راز بھی ہے۔ اس سلسلہ میں جاپان ایک قابل تقلید مثال پیش کرتا ہے۔

جاپان کے بارہ میں ایک امریکی مصنف کی ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے: جاپان نمبر ایک کی حیثیت سے۔ ڈھائی سو صفحہ کی اس کتاب میں مصنف نے دکھایا ہے کہ جاپان کس طرح دوسری جنگ عظیم میں مکمل شکست سے دوچار ہونے کے بعد دوبارہ اس طرح کھڑا ہو گیا کہ خود اپنے فاتح (امریکہ) کے لیے چیلنج بن گیا۔ مصنف کے الفاظ میں، جاپانی لوگ تبدیلی کے آقا بن گیے، بجائے اس کے کہ وہ اس کا شکار ہو جائیں۔ دوسرے ممالک کو بیرونی اثرات نے برباد کر دیا مگر جاپان نے اس سے طاقت پائی:

Thus they became the masters of change rather than the victims. Other countries were devastated by foreign influence, but Japan was invigorated.

Ezra F. Vogel, *Japan As Number One,*
Harward University Press, London 1979, p. 256.

مصنف کے نزدیک جاپان کی اس غیر معمولی کامیابی کا راز یہ ہے کہ اس نے فوجی اور سیاسی میدان میں شکست کھانے کے بعد اپنے میدانِ عمل کو بدل دیا اور اپنی ساری توجہ علم کی راہ میں لگا دی۔ اس کتاب کے تیسرے باب میں مصنف نے بتایا ہے کہ جاپان کی موجودہ کامیابی کا واحد عامل (Single factor) اگر کسی چیز کو قرار دیا جا سکتا ہے تو وہ صرف ایک ہے۔ اور وہ ہے جاپانی قوم میں علم (knowledge) کی تلاش کا لامتناہی جذبہ۔ اس سلسلہ میں مصنف نے لکھا ہے:

When a foreign visitor comes to Japan, most Japanese almost instinctively think, "What can I learn from him?" And the three million Japanese who now travel abroad each year look for little hints of new ideas they might apply at home (p. 29).

جب باہر کا کوئی آدمی جاپان آتا ہے تو اکثر جاپانی تقریباً جبلی طور پر سوچتے ہیں: "میں اس سے کیا بات سیکھ سکتا ہوں" اور تین ملین جاپانی جو آج کل ہر سال باہر کی دنیا کا سفر کرتے ہیں وہ جب باہر پہنچتے ہیں تو وہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ انھیں کوئی نیا تصور ہاتھ آ جائے جس کو واپس جا کر وہ اپنے ملک میں استعمال کر سکیں۔

مٹھاس کا اضافہ

ٹائمس آف انڈیا کے ضمیمہ (The Neighbourhood Star) بابت ۱۸ - ۲۴ مارچ ۱۹۸۹ (صفحہ ۶) پر ایک سبق آموز واقعہ شائع ہوا ہے۔ ایران کے پارسی جب پہلی بار ہندستان میں آئے تو وہ ہندستان کے مغربی ساحل پر اترے۔ اس وقت یادو رانا گجرات کا راجہ تھا۔ پارسی جماعت کا پیشوا راجہ سے ملا۔ اور اس سے یہ درخواست کی کہ وہ ان لوگوں کو اپنی ریاست میں ٹھہرنے کی اجازت دے۔ راجہ نے اس کے جواب میں دودھ سے بھرا ہوا ایک گلاس پارسی پیشوا کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہماری ریاست پہلے ہی سے آدمیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں مزید لوگوں کو ٹھہرانے کی گنجائش نہیں۔

پارسی پیشوا نے لفظوں میں اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف یہ کیا کہ ایک چمچہ شکر لے کر دودھ میں ملایا اور گلاس کو راجہ کی طرف لوٹا دیا۔ یہ اشاراتی زبان میں اس بات کا اظہار تھا کہ ہم لوگ آپ کے دودھ پر قبضہ کرنے کے بجائے اس کو میٹھا بنائیں گے، ہم آپ کی ریاست کی زندگی میں شیرینی کا اضافہ کریں گے۔ اس کے بعد راجہ نے انھیں گجرات میں قیام کی اجازت دیدی۔

اس واقعہ پر اب ایک ہزار سال کی مدت گزر چکی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ پارسیوں کے رہنما نے جو بات کہی تھی اس کو پارسی قوم نے پورا کر دکھایا۔ پارسی اس ملک میں مطالبہ اور احتجاج اور ایجی ٹیشن کا جھنڈا لے کر کھڑے نہیں ہوئے بلکہ انھوں نے اپنی خاموش محنت سے اس ملک کی ترقی میں اضافہ کیا۔ پارسیوں نے دوسروں سے زیادہ محنت کی۔ وہ تعلیم اور تجارت اور صنعت میں آگے بڑھے۔ انھوں نے ملک کی دولت اور ملک کی ترقی کو بڑھایا۔ اس ملک میں جہاں بہت سے لوگ لینے والے گروہ (Taker group) کی حیثیت رکھتے ہیں، پارسیوں نے عمل کے ذریعہ اپنے لیے دینے والے گروہ (Giver group) کا درجہ حاصل کیا ہے ——— یہی زندگی کا راز ہے۔ اس دنیا میں دینے والا پاتا ہے۔ یہاں اس آدمی کو باعزت جگہ ملتی ہے جو لوگوں کے "دودھ" میں اپنی طرف سے "مٹھاس" کا اضافہ کرے۔ اس کے برعکس جن لوگوں کے پاس دوسروں کو دینے کے لیے صرف کڑوا پن ہو، انھیں بھی اس دنیا میں وہی چیز ملتی ہے جو انھوں نے دوسروں کو دی ہے۔

اگر آپ کچھ پانا چاہتے ہیں تو دنیا میں "عطیہ کارڈ" لے کر نکلئے۔ اگر آپ "مطالبہ کارڈ" لے کر نکلے تو یہاں آپ کو کچھ ملنے والا نہیں۔

۲۴ اگست ۱۹۸۸ کو مسٹر پی ڈی ملہوترا (پیدائش ۱۹۳۵) سے ملاقات ہوئی۔ وہ ساہتیہ اکیڈمی (نئی دہلی) میں تقریباً ۳۰ سال سے پبلیکیشنز منیجر ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ ایک روز مجھے دفتر میں دیر ہوگئی۔ گھر جانے کے لیے باہر نکلا تو رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں اپنے اسکوٹر پر چلتے ہوئے ایک سڑک پر پہنچا تو وہاں پولس کے آدمی نے مجھے روک دیا۔ اس نے کہا کہ اپنا ڈرائیونگ لائسنس دکھاؤ۔

مسٹر ملہوترا نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو ڈرائیونگ کارڈ کے ساتھ ایک اور کارڈ نکل آیا۔ اس نے اپنے ہاتھ میں دونوں کارڈ لیتے ہوئے پوچھا کہ یہ دوسرا کارڈ کیا ہے۔ یہ دراصل آنکھ کے عطیہ کا کارڈ (Eye Donor Card) تھا۔ اس کارڈ پر آدمی کے دستخط کے ساتھ اس کی طرف سے یہ الفاظ درج ہوتے ہیں کہ میں نے اپنی آنکھیں قوم کو عطیہ دی ہیں۔ براہ کرم میری موت پر سب سے قریب کے آنکھ کے اسپتال کو فوراً اطلاع کر دیں۔ اور میری خواہش کو پورا کرنے میں ان کی مدد کریں۔ شکریہ:

I have gifted my eyes to the nation. Kindly inform the nearest Eye Bank immediately on my demise and help them no fulfil my desire. Thanks.

پولس کا آدمی پہلے بہت رکھائی کے ساتھ بات کر رہا تھا۔ مگر آنکھ کے عطیہ کا کارڈ دیکھتے ہی اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس نے مزید جانچ کیے بغیر کہا کہ "جائیے، جائیے"۔

آنکھ کا عطیہ موجودہ زمانہ میں ایک شریفانہ فعل سمجھا جاتا ہے۔ ٹی وی پر اس کی اپیل ان جذباتی لفظوں میں آتی ہے: "دنیا میں ایک ہی چیز ہے جو صرف آپ کسی کو دے سکتے ہیں"۔ پولس والے نے جب مسٹر ملہوترا کے پاس آنکھ کے عطیہ کا کارڈ دیکھا تو وہ سمجھا کہ یہ ایک شریف اور ہمدرد انسان ہیں۔ آنکھ کے عطیہ کا کارڈ مسٹر ملہوترا کے لیے اس بات کی پہچان بن گیا کہ وہ دوسروں کو دینے والے آدمی ہیں۔ اس چیز نے پولس کے دل کو ان کے حق میں نرم کر دیا۔

اس دنیا میں دینے والے کو دیا جاتا ہے جو دوسروں کو دے وہ دوسروں سے پاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس وقت بھی پانے کا مستحق بن جاتا ہے جب کہ اس نے ابھی عملاً دیا نہ ہو، اس نے ابھی صرف دینے کا ارادہ کیا ہو۔

مستقبل پر نظر

پبلی لیس سائرس (Pubilius Syrus) ایک لاطینی مصنف ہے۔ اس کا زمانہ پہلی صدی قبل مسیح ہے۔ وہ رومی عہد میں شام کے علاقہ میں پیدا ہوا اور روم میں وفات پائی۔ اس کا ایک قول انگریزی ترجمہ میں اس طرح نقل کیا گیا ہے ــــــ عقل مند آدمی مستقبل کی اس طرح حفاظت کرتا ہے جیسے کہ وہ حال ہو:

The wise man gurads against the future as if it were the present.

نادان آدمی کی نظر حال پر ہوتی ہے، عقل مند آدمی کی نظر مستقبل پر۔ نادان آدمی اپنے آج کے حالات میں ایک ناپسندیدہ چیز دیکھتا ہے۔ وہ اس سے لڑنے کے لیے کھڑا ہو جاتا ہے۔ عقل مند آدمی دور اندیشی سے کام لیتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ ہماری آج کی لڑائی کا انجام کل کس انداز میں نکلے گا۔ نادان آج کو دیکھ کر اقدام کرتا ہے، عقل مند وہ ہے جو مستقبل کو سامنے رکھتے ہوئے اپنے عمل کی منصوبہ بندی کرے۔

ہر اقدام اپنے نتیجہ کے اعتبار سے مستقبل کا واقعہ ہے۔ اقدام آج کیا جاتا ہے، مگر اس کا نتیجہ ہمیشہ آئندہ نکلتا ہے۔ اس لیے یہی درست بات ہے کہ عملی اقدام کو آئندہ کے معیار سے جانچا جائے۔ آج کی کارروائی کے ٹھیک یا بے ٹھیک ہونے کا فیصلہ اس اعتبار سے کیا جائے کہ کارروائی جب اپنے انجام پر پہونچے گی تو اس کا حاصل کس صورت میں ہمارے سامنے آئے گا۔

ایک شخص کو ایک بھڑ نے کاٹ لیا۔ اب وہ غصہ ہو کر ایسا کرے کہ بھڑوں کو سزا دینے کے لیے بھڑ کے چھتہ میں اپنا ہاتھ ڈال دے۔ اگر کوئی آدمی ایسا کرے تو اس کے بعد اس کی یہ شکایت بے معنی ہوگی کہ پہلے تو صرف ایک بھڑ نے اس کو معمولی طریقہ پر کاٹا تھا۔ اب سیکڑوں بھڑیں اس سے لپٹ گئیں اور اس کے سارے جسم کو ڈنک مار کر زخمی کر دیا۔

یہ دنیا دانش مندوں کے لیے ہے، نادانوں کے لیے یہاں اس کے سوا کوئی انجام نہیں کہ وہ بے سوچے سمجھے ایک اقدام کریں اور جب اس کا برا انجام سامنے آئے تو اس کے خلاف احتجاج کرنے بیٹھ جائیں۔

" آج " کا صحیح مصرف آج کو قربان کرنا نہیں ، بلکہ آج کو استعمال کرنا ہے ۔ جو لوگ اس حکمت کو جانیں وہی اس دنیا میں بڑی کامیابی حاصل کرتے ہیں ۔

ایک مغربی مفکر کا قول ہے کہ ——— اچھا سپاہی جنگ کے پہلے ہی دن لڑکر مر نہیں جاتا، بلکہ وہ زندہ رہتا ہے تاکہ اگلے دن وہ دشمن سے لڑسکے :

A good soldier lives to fight for the second day.

یہ قول صرف معروف قسم کی بڑی بڑی جنگوں کے لئے نہیں ہے ۔ وہ روزانہ پیش آنے والے عام مقابلوں کے لیے بھی ہے ۔ اگر کسی کے ساتھ آپ کی اَن بَن ہو جائے اور آپ فوراً ہی اس سے آخری لڑائی لڑنے کے لیے کھڑے ہو جائیں تو آپ ایک " برے سپاہی " ہیں ۔ آپ اپنی زندگی میں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکتے ۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اکثر حالات میں آدمی " پہلے دن " زیادہ موثر لڑائی لڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتا ۔ اس لیے عقل مند وہ ہے جو پہلے دن لڑائی کو اوائڈ کرے ۔ وہ لڑائی کے میدان سے ہٹ کر اپنے آپ کو مضبوط اور مستحکم بنانے کی کوشش کرے ۔ تاکہ یا تو اس کے مقابلہ میں اس کا حریف اتنا کمزور ہو جائے کہ وہ لڑائی کے بغیر ہتھیار ڈال دے ۔ یا وہ خود اتنا طاقت ور ہو جائے کہ وہ ہر معرکہ کو کامیابی کے ساتھ جیت سکے ۔

اس اصول کی بہترین مثال اسلام کی تاریخ ہے ۔ پیغمبر اسلام صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیغمبرانہ مدت کا نصف سے زیادہ حصہ مکہ میں گزارا ۔ یہاں آپ کے مخالفین نے ہر قسم کا ظلم کیا ۔ مگر آپ نے ان سے ٹکراؤ نہیں کیا ۔ آپ یک طرفہ طور پر صبر کرتے رہے ۔ مدینہ کی طرف ہجرت کے بعد جب پھر انھوں نے ظلم کیا تو آپ نے اپنی فوج کو منظم کر کے ان سے جنگ کی ۔ اس کے بعد دوبارہ آپ حدیبیہ کے موقع پر جنگ سے رک گیے ، اس کے بعد جلد ہی وہ وقت آیا کہ دشمن نے کسی لڑائی کے بغیر ہتھیار رکھ کر اپنی شکست مان لی ۔

" پہلے دن " آپ نے دشمن کے خلاف صبر کیا ۔ " دوسرے دن " آپ نے دشمن سے مسلح مقابلہ کیا اور اس کے اوپر کامیابی حاصل کی ۔ حدیبیہ کے " دوسرے دن " تو مقابلہ کی نوبت ہی نہیں آئی ۔ دشمن نے بلا مقابلہ شکست مان کر اپنے ہتھیار رکھ دیئے ۔

بیس سال بعد

"کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا" ــــــ چھ لفظ کے اس جملہ کو آج ایک شخص چھ سکنڈ سے بھی کم وقت میں اپنی زبان سے ادا کر سکتا ہے۔ مگر اس واقعہ کو ظہور میں لانے کے لیے کولمبس کو ۲۰ پُرمشقت سال صرف کرنے پڑے۔

کرسٹوفر کولمبس (Christopher Columbus) ۱۴۵۱ میں اٹلی میں پیدا ہوا۔ ۱۵۰۶ میں اسپین میں اس کی وفات ہوئی۔ امریکہ کی دریافت حقیقۃً یورپ کے لیے مشرق کا سمندری راستہ دریافت کرنے کی کوشش کا ایک ضمنی حاصل (by-product) تھی۔ کولمبس نے ۱۴۸۴ میں پرتگال کے شاہ جان دوم (John II) سے درخواست کی کہ وہ اس بحری سفر کے لیے اس کی مدد کرے۔ مگر شاہ پرتگال نے اس کو بے فائدہ سمجھ کر مدد کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد کولمبس نے کیسٹلی (Castile) کی ملکہ ازبیلا (Isabella) سے مدد کی درخواست کی یہاں بھی اس کو مثبت جواب نہیں ملا۔ تاہم کولمبس نے اپنی کوشش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ آٹھ سال کے بعد ملکہ نے اس کو کشتیاں اور ضروری سامان مہیا کر دیا۔

کولمبس نے تین کشتیوں کے ساتھ اپنا پہلا سفر ۳ اگست ۱۴۹۲ کو شروع کیا۔ تاہم اس سفر میں وہ امریکہ کے ساحل تک پہونچنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ ہر قسم کی مشکلات اور آزمائشوں کے باوجود کولمبس اپنی کوشش میں لگا رہا۔

آخر کار چوتھے سفر کے بعد ۱۵۰۴ میں وہ "نئی دنیا" کو دریافت کرنے میں کامیاب ہوگیا (10/691)۔ کولمبس سے پہلے دنیا دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کولمبس کی دریافت نے (نئی اور پرانی) دونوں دنیاؤں کو ملا کر ایک کر دیا۔ یہ بلاشبہ ایک عظیم دریافت تھی۔ مگر یہ دریافت صرف اس وقت ممکن ہو سکی جب کہ کولمبس اور اس کے ساتھی بے حوصلہ ہوئے بغیر ۲۰ سال تک اس جان جوکھم منصوبہ کی تکمیل میں لگے رہے۔

یہی اس دنیا میں کامیابی کا طریقہ ہے۔ اس دنیا میں ہر کامیابی "۲۰ سالہ" محنت مانگتی ہے۔ اس کے بغیر یہاں کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کی جا سکتی۔

اس دنیا میں ہر کامیابی لمبی جدوجہد کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ آدمی پہلے کم پر راضی ہوتا ہے، اس کے بعد وہ زیادہ تک پہنچتا ہے۔

نیل آرم اسٹرانگ پہلے شخص ہیں جنھوں نے چاند کا سفر کیا۔ ۲۱ جولائی ۱۹۶۹ کو انھوں نے ایگل نامی چاند گاڑی سے اتر کر چاند کی سطح پر اپنا قدم رکھا۔ اس وقت زمین اور چاند کے درمیان برابر مواصلاتی ربط قائم تھا۔ چاند پر اترنے کے بعد انھوں نے زمین والوں کو جو پہلا پیغام دیا وہ یہ تھا کہ ایک شخص کے اعتبار سے یہ ایک چھوٹا قدم ہے، مگر انسانیت کے لئے یہ ایک عظیم چھلانگ ہے:

That's one small step for man, but one giant leap for mankind.

آرم اسٹرانگ کا مطلب یہ تھا کہ میرا اس وقت چاند پر اترنا بظاہر صرف ایک شخص کا چاند پر اترنا ہے۔ مگر وہ ایک نئے کائناتی دور کا آغاز ہے۔ ایک شخص کے بحفاظت چاند پر اترنے سے یہ ثابت ہو گیا کہ انسان کے لئے چاند کا سفر ممکن ہے۔ یہ دریافت آئندہ آگے بڑھے گی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آئے گا جب کہ عام لوگ ایک سیارہ سے دوسرے سیارہ تک اسی طرح سفر کرنے لگیں جس طرح وہ موجودہ زمین کے اوپر کرتے ہیں۔

ہر بڑا کام موجودہ دنیا میں اسی طرح ہوتا ہے۔ ابتداءً ایک فرد یا چند افراد قربانی دے کر ایک دریافت تک پہنچتے ہیں۔ اس طرح وہ انسانی سفر کے لئے ایک نیا راستہ کھولتے ہیں۔ یہ ابتدائی کام بلاشبہ انتہائی مشکل ہے۔ وہ پہاڑ کو اپنی جگہ سے کھسکانے کے ہم معنی ہے۔ مگر جب یہ ابتدائی کام ہو جاتا ہے تو اس کے بعد سارا معاملہ آسان ہو جاتا ہے۔ اب ایک ایسا کشادہ راستہ لوگوں کے سامنے آجاتا ہے کہ انسانی قافلے بڑی تعداد میں اس پر سفر کر سکیں۔

کسان جب زمین میں ایک بیج ڈالتا ہے تو وہ گویا زراعت کی طرف ایک "چھوٹا قدم" ہوتا ہے تاہم اس چھوٹے قدم کے ساتھ ہی کسان کے زرعی سفر کا آغاز ہو جاتا ہے۔ یہ سفر جاری رہتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے کہ اس کے کھیت میں ایک پوری فصل کھڑی ہوئی نظر آئے۔ یہی طریقہ تمام انسانی معاملات کے لئے درست ہے، خواہ وہ زراعت اور باغبانی کا معاملہ ہو یا اور کوئی معاملہ۔

چیلنج نہ کہ ظلم

ایڈمنڈ برک (Edmund Berke) کا قول ہے کہ جو شخص ہم سے لڑتا ہے وہ ہمارے اعصاب کو مضبوط کرتا ہے اور ہماری استعداد کو تیز بناتا ہے۔ ہمارا مخالف ہمارا مددگار ہے:

He that wrestles with us, strengthens our nerves, and shapens our skill. Our antagonist is our helper.

یہ عین وہی بات ہے جو شیخ سعدی نے گلستاں کی ایک کہانی کے تحت تمثیلی طور پر اس طرح کہی ہے کہ کیا تم دیکھتے نہیں کہ بلی جب عاجز ہو جاتی ہے تو وہ اپنے پنجے سے شیر کی آنکھ نکال لیتی ہے:

نہ بینی کہ چوں گربہ عاجز شود   برآرد بہ چنگال چشم پلنگ

دوسروں کی طرف سے آپ کے خلاف کوئی واقعہ پیش آئے تو اس کے ردعمل کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آپ اس کو ظلم سمجھیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ اس کو چیلنج قرار دیں۔ ظلم سمجھنے کی صورت میں شکایت کا ذہن پیدا ہوتا ہے، اور چیلنج سمجھنے کی صورت میں مقابلہ کا۔

شکایتی ذہن کو اپنے کرنے کا کام صرف یہ نظر آتا ہے کہ وہ فریق ثانی کے خلاف چیخ پکار شروع کر دے۔ وہ اس کے خلاف اپنے تمام احتجاجی الفاظ استعمال کر ڈالے۔ اس کے برعکس مقابلہ کا ذہن عمل کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ حالات کو سمجھ کر جوابی طریقہ تلاش کرنے میں لگ جاتا ہے تاکہ حکمت اور تدبیر کے ذریعہ فریق ثانی کے مخالفانہ منصوبوں کو ناکام بنا دے۔

شکایت اور احتجاج کا ذہن آدمی کو ایسے راستوں کی طرف لے جاتا ہے جہاں وہ اپنی بچی ہوئی قوت بھی بے فائدہ ہنگاموں میں ضائع کر دے۔ جب کہ چیلنج اور مقابلہ کا ذہن آدمی کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کو جگاتا ہے، وہ اس کو نیا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ وہ اس کو اتنا عظیم بنا دیتا ہے کہ کمزور بھی طاقت ور پر غالب آجائے، اور بلی بھی شیر کو پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دے۔

موجودہ دنیا مقابلہ کی دنیا ہے۔ یہاں شکایت کا ذہن آدمی کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے اور تدبیر کا ذہن تعمیر و ترقی کی طرف۔

آپ راستہ چل رہے ہیں۔ درمیان میں ایک جھاڑی کے کانٹے سے آپ کا دامن الجھ جاتا ہے۔ ایسے وقت میں آپ کیا کرتے ہیں۔ آپ "شکایت" کے بجائے "تدبیر" کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ آپ جھاڑی کے خلاف احتجاج نہیں کرتے، بلکہ یہ سوچنے لگتے ہیں کہ کون سی صورت اپنائیں جس سے مسئلہ حل ہو جائے۔

عقل مند آدمی جانتا ہے کہ یہی طریقہ اس کو انسان کے معاملہ میں بھی اختیار کرنا ہے۔ انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے بھی ایسا ہوتا ہے کہ کسی شخص سے ٹکراؤ ہو جاتا ہے۔ کسی سے کوئی تکلیف پہونچ جاتی ہے۔ کسی شخص کے متعلق ہمارا احساس ہوتا ہے کہ اس نے ہمارا حق ہم کو نہیں دیا۔ ایسے ہر موقع پر دوبارہ ہمیں شکایت کے بجائے تدبیر کا انداز اپنانا چاہیے۔

زندگی کا ہر مسئلہ ایک چیلنج ہے نہ کہ ایک شخص کے اوپر دوسرے شخص کی زیادتی۔ آپ کے ساتھ کوئی مسئلہ پیش آئے، اور آپ اس کو زیادتی سمجھیں تو اس سے شکایت اور احتجاج کا ذہن پیدا ہوگا۔ حتیٰ کہ یہ ذہن آپ کو یہاں تک لے جا سکتا ہے کہ آپ مایوسی کا شکار ہو جائیں۔ آپ یہ سمجھ لیں کہ موجودہ ماحول میں آپ کے لیے کچھ کرنا ممکن ہی نہیں۔ شکایت کا ذہن مایوسی تک لے جاتا ہے، اور مایوسی کا ذہن نفسیاتی خودکشی تک۔

اس کے برعکس اگر آپ کا یہ حال ہو کہ جب کوئی مسئلہ پیش آئے تو آپ اس کو اپنے لیے ایک چیلنج سمجھیں، تو اس سے آپ کی سوئی ہوئی صلاحیتیں بیدار ہوں گی۔ آپ کے اندر حالات سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔ اول الذکر صورت میں آپ کا ذہن اگر منفی رُخ پر چل رہا تھا تو اب آپ کا ذہن تمام تر مثبت رُخ پر چل پڑے گا ——— یہی ایک لفظ میں، موجودہ دنیا میں کامیابی اور ناکامی کا راز ہے۔ اس دنیا میں جو شخص مسائل سے شکایت اور احتجاج کی غذا لے، اس کے لیے یہاں بربادی کے سوا کوئی اور چیز مقدر نہیں۔ اس کے برعکس جس شخص کا حال یہ ہو کہ مسائل کا سامنا پیش آنے کے بعد اس کا ذہن تدبیر تلاش کرنے میں لگ جائے، وہ لازماً کامیاب ہو کر رہے گا۔ کیوں کہ اس دنیا میں ہر مسئلہ کا ایک حل ہے اور ہر مشکل کی ایک تدبیر۔

غیر معمولی انسان

وان وورسٹ (Bruce van Voorst) ایک امریکی جرنلسٹ ہے۔ اس نے جنگی رپورٹر کی حیثیت سے شہرت حاصل کی ہے۔ ڈامی نیکن (Dominican Republic) کی جنگ، ایرانی انقلابیوں کی شاہ کے خلاف جنگ، عراق اور ایران کی جنگ اور خلیجی جنگ (۱۹۹۱) میں اس نے میدان جنگ میں پہونچ کر براہِ راست رپورٹنگ کی ہے۔

ٹائم میگزین (۴ فروری ۱۹۹۱) میں وان وورسٹ کے کچھ تجربات شائع کئے گئے ہیں۔ اس نے جو باتیں کہیں ان میں سے ایک بات جنگ کے وقت فوجیوں کی صفت (quality) اور سالمیت (integrity) کے بارہ میں تھی۔ اس نے کہا کہ جب جنگی مقابلہ جاری ہو تو فوجی حیرت انگیز طور پر اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ وہ مشکلات سے بے پروا ہو کر اپنے فرائض انجام دیتے ہیں۔ جنگ میں یہ فوجی عام فوجی نہیں ہوتے، وہ سب کے سب غیر معمولی لوگ بن جاتے ہیں:

In battle there are no ordinary soldiers; they are all extraordinary.(p. 4).

امریکی صحافی نے جو بات فوجیوں کے بارہ میں کہی، وہ ہر انسان اور ہر مقابلہ کے لیے یکساں طور پر صحیح ہے۔ انسان کے اندر پیدائشی طور پر بے شمار صلاحیتیں ہیں۔ عام حالات میں یہ صلاحیتیں سوئی ہوئی رہتی ہیں۔ مگر جب کوئی خطرہ پیش آتا ہے، جب چیلنج کی صورت حال سامنے آتی ہے تو اچانک انسان کی تمام سوئی ہوئی صلاحیتیں جاگ اٹھتی ہیں۔ اس سے پہلے اگر اس کے "پاور ہاؤس" کا صرف ایک بلب جل رہا تھا تو اب اس کے تمام بلب بیک وقت جل اٹھتے ہیں۔

اب اس کی عقل زیادہ گہری سوچ کا ثبوت دیتی ہے۔ اس کا جسم مزید طاقتوں کے ساتھ متحرک ہو جاتا ہے۔ اس کی پوری ہستی ایک ہیروانہ کردار کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ چیلنج کمزور انسان کو طاقتور انسان بنا دیتا ہے۔ وہ ناداں آدمی کو ہوشیار آدمی بنا دیتا ہے۔ چیلنج بظاہر ایک رکاوٹ ہے، مگر اپنے نتیجہ کے اعتبار سے وہ اعلیٰ ترین ترقی کا سب سے بڑا زینہ ہے ــــــ مقابلہ پیش آنے سے پہلے ہر انسان ایک معمولی انسان ہے، مگر مقابلہ پیش آنے کے بعد ہر انسان غیر معمولی انسان بن جاتا ہے۔

جہاں اسکوپ نہ ہو وہاں زیادہ اسکوپ ہوتا ہے۔ جہاں بظاہر مواقع نہ ہوں وہاں اور زیادہ بڑے مواقع آدمی کے لیے چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔

ایک مسلم نوجوان ہیں، ان کے کچھ رشتہ دار امریکہ میں رہتے ہیں۔ وہ امریکہ گیے۔ وہاں تعلیم حاصل کی۔ دو سال تک امریکہ میں ملازمت بھی کی۔ پھر انھیں خیال آیا کہ اپنے ملک میں آئیں اور یہاں اپنی زندگی کی تعمیر کریں چنانچہ وہ ہندستان واپس آگیے۔

ان سے میری ملاقات ہوئی تو انھوں نے کہا کہ میں ہندستان واپس آکر ذہنی انتشار میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ یہاں جو میرے دوست اور رشتہ دار ہیں، وہ سب کہہ رہے ہیں کہ تم نے بہت نادانی کی کہ تم امریکہ چھوڑ کر ہندستان آگیے۔ وہاں تم کو ترقی کے بڑے بڑے مواقع مل سکتے تھے۔ یہاں تو تمہارے لیے کوئی اسکوپ نہیں۔

میں نے جواب دیا کہ آپ کے دوست اور رشتہ دار سب الٹی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ ہندستان میں اسکوپ نہیں، اسی لیے تو یہاں اسکوپ ہے۔ ہندستان میں آپ کے لیے ترقی کے وہ تمام مواقع ہیں جو امریکہ میں ہیں، بلکہ یہاں آپ امریکہ سے بھی زیادہ بڑی ترقی کر سکتے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ ترقی کا تعلق دو چیزوں سے ہے۔ ایک خارجی مواقع۔ دوسرے، اندرونی امکانات۔ خارجی مواقع سے مراد وہ مواقع ہیں جو آپ کے وجود کے باہر خارجی دنیا میں پائے جاتے ہیں۔ اندرونی امکانات سے مراد وہ فطری استعداد ہے جو آپ کے ذہن اور آپ کے جسم کے اندر اللہ تعالیٰ نے رکھ دی ہے۔

عام طور پر لوگوں کی نگاہ دنیا کے خارجی مواقع پر ہوتی ہے۔ اس لیے وہ کہہ دیتے ہیں کہ فلاں ملک میں مواقع ہیں اور فلاں ملک میں مواقع نہیں ہیں۔ مگر ترقی کے لیے اس سے بھی زیادہ اہمیت ان صلاحیتوں کی ہے جو فطرت سے ہر آدمی کو ملی ہوئی ہیں۔ کوئی بھی آدمی ان سے خالی نہیں۔

جب زندگی کی مشکلیں آدمی کو چیلنج کرتی ہیں تو اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ حالات کا جھٹکا انھیں جگا کر متحرک کر دیتا ہے۔ یہ بیداری کسی انسان کی زندگی میں اس کی ترقی کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ امریکہ میں یہ اسکوپ ہے کہ وہاں خارجی مواقع موجود ہیں۔ ہندستان میں یہ اسکوپ ہے کہ یہاں چیلنج کی صورت حال پائی جاتی ہے جو آدمی کی فطری صلاحیتوں کو آخری حد تک جگا دیتی ہے۔ اور پہلے اسکوپ کے مقابلہ میں دوسرا اسکوپ بلاشبہ کہیں زیادہ قیمتی ہے۔

وقت کی اہمیت

لارڈ چسٹر فیلڈ (Lord Chesterfield) ۱۶۹۴ میں لندن میں پیدا ہوا، اور ۱۷۷۳ میں وہیں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے اپنے لڑکے فلپ اسٹین ہوپ کے نام بہت سے خطوط لکھے تھے۔ ان خطوط میں زندگی کی کامیابی کا "آرٹ" بتایا گیا تھا۔ یہ خطوط اس کے بعد چھاپ دیئے گیے ہیں۔

ایک خط میں لارڈ چسٹر فیلڈ نے لکھا ——— میں نے تم سے کہا ہے کہ تم منٹوں کی حفاظت کرو، کیوں کہ گھنٹے اپنے آپ اپنی حفاظت کرلیں گے :

I recommended you to take care of the minutes, for the hours will take care of themselves.

اگر آپ اپنے منٹ کو ضائع نہ کریں تو گھنٹہ اپنے آپ ضائع ہونے سے بچ جائے گا، کیوں کہ منٹ منٹ کے ملنے ہی سے گھنٹہ بنتا ہے۔ جس آدمی نے جزء کا خیال رکھا، اس نے گویا کُل کا بھی خیال رکھا۔ کیوں کہ جب بہت سا جزء اکٹھا ہوتا ہے تو وہی کُل بن جاتا ہے۔

بیشتر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ زیادہ کی فکر میں کم کو بھولے رہتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن کو بہت کی طرف اتنا زیادہ لگاتے ہیں کہ تھوڑے کی طرف سے ان کی نگاہیں ہٹ جاتی ہیں۔ مگر آخری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انھیں کچھ بھی نہیں ملتا۔

اپنے ملے ہوئے وقت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ کیجئے۔ لمحوں کو استعمال کرکے آپ مہینوں اور سالوں کے مالک بن سکتے ہیں۔ اگر آپ نے لمحوں کو کھویا تو اس کے بعد آپ مہینوں اور سالوں کو بھی یقینی طور پر کھودیں گے۔

اگر آپ روزانہ اپنے ایک گھنٹہ کا صرف پانچ منٹ کھوتے ہوں تو رات دن کے درمیان آپ نے روزانہ ۲ گھنٹہ کھودیا۔ مہینہ میں ۶۰ گھنٹہ اور سال میں ۷۲۰ گھنٹے آپ کے ضائع ہوگیے۔ اسی طرح ہر آدمی اپنے ملے ہوئے وقت کا بہت سا حصہ بیکار ضائع کردیتا ہے۔ ۸۰ سال کی عمر پانے والا آدمی اپنی عمر کے ۴۰ سال بھی پوری طرح استعمال نہیں کرپاتا۔

وقت آپ کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ وقت کو ضائع ہونے سے بچائیے۔

ہر بڑی کامیابی چھوٹی چھوٹی کامیابی کے مجموعہ کا نام ہے۔ چھوٹی کامیابی پر راضی ہوجائیے۔ اس کے بعد آپ بڑی کامیابی بھی ضرور حاصل کرلیں گے۔

مولوی لطف اللہ ایک معمولی ٹیوٹر تھے۔ وہ ۱۸۰۲ء میں مالوہ کے قدیم شہر دھارانگر میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے کسی انگریزی درس گاہ میں ایک دن بھی نہیں پڑھا۔ مگر ان کی خود نوشت انگریزی سوانح عمری ۱۸۵۷ میں لندن سے چھپی۔ لندن کے پبلشر اسمتھ ایلڈر اینڈ کمپنی نے اس کا نام یہ رکھا:

Autobiography of Lutfullah: A Mohammedan Gentleman

اس کتاب کے ساتھ ایک انگریز مسٹر ایسٹ ویک کا دیباچہ شامل ہے۔ انھوں نے دیباچہ میں مصنف کی صحیح انگریزی کی تعریف کی ہے۔ انھوں نے اس پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ ایک ہندستانی نے بدیسی زبان میں اتنی ضخیم کتاب کس طرح لکھی۔

مولوی لطف اللہ نے یہ صلاحیت کیسے پیدا کی کہ وہ انگریزی میں ایک ایسی کتاب لکھیں جو لندن سے چھپے اور انگریز ادیب اس کی زبان کی تعریف کرے۔ اس کا راز اردو کے اس مشہور مقولہ میں چھپا ہوا ہے: تھوڑا تھوڑا بہت ہوجاتا ہے۔

مولوی لطف اللہ نے انگریزی زبان صرف اپنی محنت سے سیکھی۔ وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازموں کو ہندستانی، فارسی اور مرہٹی زبانیں سکھاتے تھے۔ ان کے انگریز شاگردوں کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ انگریزوں سے تعلق کے نتیجہ میں ان کے اندر انگریزی زبان سیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ انھوں نے ذاتی مطالعہ سے انگریزی زبان پڑھنا شروع کیا۔ اور آٹھ سال کی لگاتار محنت کے نتیجہ میں اس پر پوری طرح قدرت حاصل کرلی۔ انھوں نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ اس آٹھ سال کی مدت میں "کوئی ایک رات ایسی نہیں گزری جب کہ سونے سے پہلے میں نے انگریزی کے دس لفظ یاد نہ کیے ہوں اور ڈاکٹر گل کرسٹ کی قواعد کی کتابوں کے چند صفحے توجہ سے پڑھ کر ذہن میں محفوظ نہ کیے ہوں"۔ "دس لفظ" بظاہر بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ مگر دس لفظ روزانہ کی رفتار کو جب آٹھ سال تک پھیلا دیا جائے تو وہ ایک شخص کو غیر زبان کا ایسا ادیب بنا دیتے ہیں کہ اہل زبان بھی اس کی زبان دانی کا اعتراف کریں۔

شیر کا طریقہ

ٹائمس آف انڈیا (۱۸ مارچ ۱۹۹۱) میں شیر کے بارہ میں ایک رپورٹ چھپی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ شیر جنگل کی گھاس پر چلنا پسند نہیں کرتے۔ انھیں اندیشہ ہوتا ہے کہ کوئی کانٹا ان کے نرم پاؤں میں نہ چبھ جائے۔ چنانچہ وہ ہمیشہ کھلے راستوں پر یا سڑکوں پر چلتے ہیں:

Tigers hate to walk on the jungle grass for the fear of a thorn piercing their soft feet. Thus they always walk on open paths and roads.

شیر اور دوسرے تمام جانور فطرت کے مدرسہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ وہ ہمیشہ اس طریقہ پر چلتے ہیں جو ان کے خالق نے براہِ راست طور پر انھیں بتایا ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہوگا کہ شیر کا مذکورہ طریقہ فطرت کا پسندیدہ طریقہ ہے۔ شیر کے لئے یہ احتیاطی طریقہ اس کی طینت میں رکھ دیا گیا ہے۔ اور انسان کے لیے شریعت کی زبان میں یہی بات ان لفظوں میں کہی گئی کہ خُذوا حِذرکُم (اپنے بچاؤ کا انتظام رکھو)

اللہ تعالیٰ نے جس خاص مصلحت کے تحت موجودہ دنیا کو بنایا ہے، اس کی بنا پر یہاں صاف ستھرے راستے بھی ہیں، اور کانٹے دار جھاڑیاں بھی۔ یہ کانٹے دار جھاڑیاں لازماً اس دنیا میں رہیں گی، ان کو ختم کرنا ممکن نہیں۔ اب یہاں جو کچھ کرنا ہے، وہ وہی ہے جو خدا کے سکھائے ہوئے طریقہ کے مطابق جنگل کا شیر کرتا ہے، یعنی کانٹے دار جھاڑیوں سے اپنے آپ کو بچایا جائے اور صاف اور کھلا ہوا راستہ تلاش کرکے اس پر اپنا سفر جاری کیا جائے۔

شیر جنگل کی گھاس سے اعراض کرتے ہوئے چلتا ہے، ہم کو انسانوں کے فتنہ سے اعراض کرتے ہوئے اپنا سفرِ حیات طے کرنا ہے۔ ہم کو چاہیے کہ ہم اپنے کسی عمل سے دوسروں کو غصہ نہ دلائیں۔ اور اگر دوسرے لوگ ہمارے اوپر غضب ناک ہو جائیں تو صبر کے ذریعہ ان کے غضب کو ٹھنڈا کریں۔ اور حکیمانہ تدبیر کے ذریعہ اپنے آپ کو ان کے غضب کا شکار ہونے سے بچائیں۔

"جنگل کا بادشاہ" جو کچھ کرتا ہے وہ بزدلی نہیں ہے بلکہ عین بہادری ہے۔ اسی طرح ایک انسان اپنے سماج میں یہی طریقہ اختیار کرے تو وہ بزدلی نہیں ہوگا بلکہ عین بہادری ہوگا۔ اعراض کا طریقہ شیر کا طریقہ ہے نہ کہ گیدڑ کا طریقہ۔

خداوند عالم کا ایک ہی قانون ہے جو انسانوں سے بھی مطلوب ہے اور غیر انسانوں سے بھی۔ اور وہ ہے ناخوش گوار باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی زندگی کی تعمیر کرنا۔

گلاب کے پھولوں کا ایک باغ ہے۔ آپ اس میں داخل ہوتے ہیں۔ اس کی خوبصورت پتیاں اور اس کے خوشبودار پھول آپ کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کے کانٹے آپ کو لگ جاتے ہیں۔ آپ کا ہاتھ زخمی ہو جاتا ہے یا آپ کے کپڑے کانٹوں میں پھنس جاتے ہیں۔

اب ایک صورت یہ ہے کہ گلاب کے باغ میں کانٹوں کی موجودگی کو آپ باغبان کا فعل قرار دیں۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آپ یہ جانیں کہ یہ کانٹے قدرت کے قانون کا نتیجہ ہیں۔ اگر آپ کانٹوں کی موجودگی کا سبب باغبان کو سمجھیں تو آپ کے اندر نفرت اور شکایت کا ذہن ابھرے گا، اور اگر آپ اس کو قانون قدرت کا نتیجہ سمجھیں تو آپ کانٹوں کی موجودگی کو بطور حقیقت تسلیم کرتے ہوئے یہ کوشش کریں گے کہ اس سے اعراض کرتے ہوئے اپنا مقصد حاصل کریں۔ ایک تشخیص سے احتجاج کا ذہن ابھرے گا اور دوسری تشخیص سے تدبیر تلاش کرنے کا۔

ہندستان میں اکثریتی فرقہ کی طرف سے جو قابل شکایت باتیں پیش آتی ہیں، ان کو مسلمانوں کے تمام لکھنے اور بولنے والے انسان کا پیدا کردہ مسئلہ سمجھتے ہیں۔ اس لیے وہ احتجاج کی پالیسی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ مگر یہ سراسر عبث ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے گلاب کے کانٹوں کے خلاف شور وغل کیا جائے۔ گلاب کے درخت میں کانٹے بہر حال رہیں گے، اسی طرح انسانی سماج میں ایک سے دوسرے کو تلخ باتیں بھی ضرور پیش آئیں گی۔

ان تلخ اور قابل شکایت باتوں کا حل صرف ایک ہے۔ ان سے اعراض کرنا، ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے سفر حیات پر رواں دواں رہنا۔ اس قسم کے سماجی مسائل خود خدا کے تخلیقی منصوبہ کا حصہ ہیں، اس لیے وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتے۔ البتہ ان کی موجودگی کو گوارا کر کے ہم اپنی زندگی کے سفر کو ضرور جاری رکھ سکتے ہیں۔

نادان آدمی ناموافق باتوں سے الجھتا ہے، دانش مند آدمی ناموافق باتوں سے دامن بچاتے ہوئے گزر جاتا ہے۔ یہی ایک لفظ میں، اس دنیا میں ناکامی اور کامیابی کا راز ہے۔ یہاں الجھنے کا انجام ناکامی ہے اور نظر انداز کرنے کا انجام کامیابی۔

خون کے بجائے پانی

محمد افضل لادی والا (۵۳ سال) بمبئی کے رہنے والے ہیں۔ ۲۴ فروری ۱۹۹۱ کی ملاقات میں انھوں نے اپنا ایک واقعہ بتایا۔ ۲۲ جنوری ۱۹۹۱ کو رنگ بھون (دھوبی تلاؤ) میں ایک کلچرل پروگرام تھا۔ افضل صاحب نے اس میں شرکت کی۔ ساڑھے گیارہ بجے رات کو یہ پروگرام ختم ہوا۔ اس سے فارغ ہو کر وہ بمبئی وی ٹی پر آئے اور ٹرین کے ذریعہ کرلا پہنچے۔ اس وقت تقریباً ساڑھے بارہ بجے کا وقت ہو چکا تھا۔ اسٹیشن سے رہائش گاہ (ہلاؤ پل) تک تقریباً دو کیلومیٹر کا فاصلہ ہے۔ انھوں نے چاہا کہ تھری وھیلر کے ذریعہ گھر کے لیے روانہ ہوں۔ تھری وھیلر کے انتظار میں وہ سڑک پر کھڑے ہو گئے۔ اتنے میں ایک تھری وھیلر آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس وقت ان کے منہ میں پان تھا۔ تھری وھیلر کو آواز دینے کے لیے انھوں نے جلدی میں پان کو تھوکا۔ اتفاق سے عین اسی وقت ایک مسافر سائڈ میں آگیا اور افضل صاحب کا پان پورا کا پورا اس کے پاؤں پر جا گرا۔

مسافر فوراً آگ بگولا ہو گیا۔ طیش میں آکر اس نے کہا کہ پان کھاتے ہو اور پان کھانے کی تمیز بھی نہیں۔ مگر افضل صاحب، جو الرسالہ کے مستقل قاری ہیں، انھوں نے گرم الفاظ کا جواب ٹھنڈے الفاظ سے دیا۔ انھوں نے کہا کہ میں اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہوں۔ پان کھانا بھی غلط، اور پان کھا کر میں نے جو کچھ کیا وہ بھی غلط۔ وہ آدمی تیز ہوتا گیا۔ مگر افضل صاحب نے اس کی اشتعال انگیز باتوں کا جواب دینے کے بجائے کہا کہ مجھے معاف کیجئے۔ اس نے کہا کہ یہ اچھا ہے کہ کسی کے ساتھ کچھ بھی کر دو، اس کے بعد کہو کہ معاف کر دو۔

افضل صاحب نے کہا کہ بھائی میں رسمی معافی نہیں مانگ رہا ہوں۔ میں دل سے معافی مانگ رہا ہوں۔ اب آپ مجھے اجازت دیجئے کہ میں آپ کے پاؤں دھوؤں۔ افضل صاحب نے جب پاؤں دھونے کی بات کہی تو آدمی کچھ نرم پڑا۔ کچھ اور باتوں کے بعد آخر کار وہ راضی ہوا کہ افضل صاحب اس کا پاؤں دھوئیں۔ قریب ہی ایک چائے وغیرہ کا ہوٹل تھا۔ افضل صاحب فوراً اس کے پاس گئے اور کہا کہ "چچا، ایک گلاس پانی دینا" افضل صاحب گلاس لے کر آئے تو آدمی بالکل ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس نے کہا کہ مجھ کو دیجئے، میں خود اپنے ہاتھ سے دھو لیتا ہوں۔

آدمی نے اپنے ہاتھ میں گلاس لے کر دھویا۔ ایک گلاس سے پوری صفائی نہیں ہوئی تو افضل صاحب دوڑ کر گئے اور ایک گلاس مزید پانی لے آئے۔ یہاں تک کہ اس کا پاؤں پوری طرح صاف ہو گیا۔ یہ واقعہ

ریلوے اسٹیشن کے باہر پیش آیا۔ گفتگو کے دوران افضل صاحب نے اس آدمی سے کہا: بھائی صاحب، آپ تو "میم" ہیں، اگر آپ "کاف" ہوتے تب بھی مجھے یہی کرنا تھا، کیوں کہ اسلام نے ہم کو ایسا ہی حکم دیا ہے۔ یہ سن کر وہ آدمی افضل صاحب سے لپٹ گیا۔ اس نے کہا کہ بھائی صاحب، میں کاف ہی ہوں۔ اور آپ جیسا مسلمان مجھے اپنی زندگی میں پہلی بار ملا ہے۔ اور اگر دوسرے مسلمان بھی آپ جیسے ہو جائیں تو سارا جھگڑا ختم ہو جائے۔

اب وہ آدمی بالکل بدل گیا۔ پہلے اس کے اندر غصہ اور انتقام بھڑک اٹھا تھا۔ اب وہ شرمندہ ہو کر افضل صاحب سے کہنے لگا کہ بھائی، مجھ کو معاف کرنا۔ آپ کو میں نے بڑی تکلیف دی۔ میری وجہ سے آپ کو پانی لانا پڑا۔ آپ کا تھری دھیلر بھی چھوٹ گیا۔ افضل صاحب نے کہا کہ مجھ کو شرمندہ نہ کیجئے۔ اس معاملہ میں اصل غلطی تو میری تھی۔ اور میں جو پانی لایا، وہ میرا فرض تھا جو میں نے کیا۔ واقعہ کے شروع میں جو آدمی دوسرے کو غلط بتا رہا تھا۔ واقعہ کے آخر میں وہ خود اپنی غلطی مان کر شرمندہ ہو گیا اور معافی مانگنے لگا۔

جب یہ واقعہ پیش آیا، اس وقت بمبئی کے علاقہ جوگیشوری میں زبردست فرقہ وارانہ کشیدگی موجود تھی۔ یہ مقام کرلا سے تقریباً ۵ کیلومیٹر کے فاصلہ پر ہے۔ ان حالات میں اگر افضل صاحب اشتعال کے جواب میں اشتعال کا انداز اختیار کرتے تو وہی ہوتا جو اس طرح کے مواقع پر دوسری بہت سی جگہوں میں ہو چکا ہے۔ یعنی فرقہ وارانہ فساد اور جان و مال کی تباہی۔ اس کے بعد شاید ایسا ہوتا کہ افضل صاحب خدانخواستہ گھر پہنچنے کے بجائے اسپتال لے جائے جاتے اور علاقہ میں ہندو مسلم فساد برپا ہو کر سیکڑوں خاندانوں کو برباد کر دیتا۔

افضل صاحب نے یہ واقعہ بتانے کے بعد کہا: اس وقت مجھے الرسالہ کی بات یاد آئی۔ یہ الرسالہ کے دیے ہوئے ذہن کا نتیجہ تھا کہ میں اشتعال کے موقع پر مشتعل ہونے سے بچ گیا، اور نتیجۃً اس کے برے انجام سے بھی۔ میرے گلاس بھر پانی نے سیکڑوں لوگوں کو اس بھیانک انجام سے بچا لیا کہ ان کا خون سڑکوں پر بہایا جائے۔ ایک قسم کے الفاظ بول کر آپ آدمی کے ذہن کو غصہ کا تنور بنا سکتے ہیں۔ اور دوسرے قسم کے الفاظ بول کر آدمی کے بھڑکتے ہوئے غصہ کو ٹھنڈا کر سکتے ہیں۔ الفاظ آگ کا کام بھی کرتے ہیں اور برف کا کام بھی۔ یہ بولنے والے کے اپنے اوپر ہے کہ وہ دونوں میں سے کس چیز کا اپنے لیے انتخاب کرتا ہے۔

آسان حل

الطاف حسین حالی پانی پتی (۱۹۱۴ - ۱۸۳۷) ایک انقلابی ذہن کے آدمی تھے۔ انھوں نے اردو ادب میں اصلاح کی تحریک چلائی۔ انھوں نے قدیم اردو شاعری پر سخت تنقید کی۔ انھوں نے کہا کہ اردو شاعری مبالغہ اور عشق و عاشقی اور فرضی خیال آرائی کا مجموعہ ہے۔ اس کے بجائے اس کو بامقصد شاعری ہونا چاہیے۔ اس کا ایک نمونہ انھوں نے خود "مسدس" کی صورت میں پیش کیا۔

حالی کی یہ تنقید ان لوگوں کو بہت بری لگی جو اردو شاعری پر ناز کرتے تھے اور اس کو اپنے لیے فخر بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ حالی کے خلاف نہایت نازیبا قسم کے مضامین شائع ہونا شروع ہوئے۔ لکھنؤ کا اخبار "اودھ پنچ" اکثر نہایت برے انداز میں ان کے خلاف لکھتا اور اس کا عنوان اِن الفاظ میں قائم کرتا :

ابتر ہمارے حملوں سے حالی کا حال ہے میدانِ پانی پت کی طرح پائمال ہے

حالی نے ان بے ہودہ مخالفتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموشی کے ساتھ اپنا کام کرتے رہے۔ آخر کار چند سال کے بعد وہ لوگ تھک کر چپ ہو گیے۔ کسی نے حالی سے سوال کیا کہ آپ کے مخالفین کیسے خاموش ہو گیے۔ اس کے جواب میں حالی نے کسی کا نام لیے بغیر یہ شعر کہا :

کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ سب کچھ کہا انھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

جھوٹی مخالفتوں کا سب سے زیادہ آسان اور کارگر جواب یہ ہے کہ اس کا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ جھوٹی مخالفت ہمیشہ بے بنیاد ہوتی ہے۔ اس کے لیے مقدر ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ ڈھ پڑے۔ ایسی مخالفت کا جواب دینا گویا اس کی مدتِ عمر میں اضافہ کرنا ہے۔ اگر آدمی صبر کرلے تو بے جڑ درخت کی طرح ایک روز وہ اپنے آپ گر پڑے گی۔ وہ کبھی دیر تک خدا کی زمین پر قائم نہیں رہ سکتی۔

جھوٹ کا سب سے بڑا قاتل وقت ہے۔ آپ آنے والے وقت کا انتظار کیجیے۔ اور اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ وقت نے اس فتنہ کو زیادہ کامل طور پر ہلاک کر دیا ہے جس کو آپ صرف ناقص طور پر ہلاک کرنے کی تدبیر کر رہے تھے۔

اس تدبیر کا تعلق کسی ایک معاملہ سے نہیں۔ جس معاملہ میں بھی خاموش انتظار کی یہ تدبیر اختیار کی جائے گی، آخر کار وہ کارگر ثابت ہوگی۔

کچھ عیسائیوں نے دہلی کے پلوں اور دیواروں پر کالے رنگ سے انگریزی میں یہ فقرہ لکھ دیا کہ مسیح جلد آنے والے ہیں (Jesus is coming soon) اس کے بعد کچھ ہندو نوجوانوں میں جوابی جوش پیدا ہوا۔ انھوں نے مذکورہ فقرہ کے آگے ہر جگہ یہ الفاظ لکھ دیئے کہ ہندو بننے کے لیے (to become Hindu) جملہ کی ساخت بتاتی ہے کہ یہ پڑھے لکھے ہندوؤں کا فعل نہیں تھا۔ کیوں کہ انگریزی کے اعتبار سے صحیح جملہ یوں ہوگا:

To become a Hindu

اسی قسم کا واقعہ اگر کسی شہر میں مسلمانوں کے ساتھ پیش آتا تو فوراً کچھ سطحی قسم کے لوگ یہ کہنا شروع کر دیتے کہ یہ توہین رسول ہے۔ یہ مسلمانوں کی دل آزاری ہے، یہ ہماری ملی غیرت کو چیلنج ہے۔ اس کے بعد کچھ مسلم نوجوان مشتعل ہو کر جوابی کارروائی کرتے اور پھر شہر کے اندر ہندو مسلم فساد ہو جاتا۔ اب نام نہاد مسلم لیڈر بیانات دے کر انتظامیہ کا نکما پن ثابت کرتے۔ ریلیف فنڈ کھول کر کچھ لوگ ملی خدمات کا کریڈٹ لینا شروع کر دیتے۔ مسلمانوں کے اردو اخبارات میں گرما گرم سرخیاں چھپتیں جس کے نتیجہ میں ان کی اشاعت بڑھ جاتی۔ اور جہاں تک مسلم عوام کا تعلق ہے، ان کے حصہ میں اس کے سوا کچھ اور نہ آتا کہ ان کی بربادی میں مزید اضافہ ہو جائے۔

مگر عیسائیوں نے اس "اشتعال انگیز کارروائی" کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ واقعہ محض ایک بے واقعہ (non-event) بن کر رہ گیا۔

۱۹ فروری ۱۹۹۰ کی صبح کو میں اوبرائے ہوٹل (نئی دہلی) کے پاس فلائی اوور پر کھڑا ہوا اس کی دیواروں پر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ پل کے دونوں طرف کی کشادہ سڑک پر سواریاں تیزی سے گزر رہی تھیں۔ کسی کو بھی یہ فرصت نہ تھی کہ وہ ٹھہر کر پل کے اوپر لکھے ہوئے ان الفاظ کو پڑھے۔ یہ الفاظ پل کی دیواروں پر ناقابل التفات نشان کے طور پر صرف اس بات کے منتظر تھے کہ بارش کا پانی اور ہواؤں کا جھونکا ان کو مٹا دے، اس سے پہلے کہ کوئی ان کو پڑھے یا ان سے کوئی اثر قبول کرے۔

جو "اشتعال انگیزی" اتنی بے حقیقت ہو، اس پر جو لوگ مشتعل ہو کر فساد کے اسباب پیدا کرتے ہیں وہ بلاشبہ تمام نادانوں سے زیادہ نادان ہیں۔

علم کی اہمیّت

جیفرسن (Thomas Jefferson) امریکہ کا تیسرا صدر تھا۔ وہ ۱۷۴۳ میں پیدا ہوا اور ۱۸۲۶ میں اس کی وفات ہوئی۔ وہ ۱۸۰۱ سے لے کر ۱۸۰۹ تک امریکہ کا صدر رہا۔ جیفرسن نہایت قابل آدمی تھا۔ وہ انگریزی، لاطینی، یونانی، فرانسیسی، اسپینی، اطالوی اور اینگلوسیکسن زبانیں جانتا تھا۔ مورخین اس کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ ایک انتہائی غیر معمولی قسم کا صاحب علم آدمی تھا:

He was an extraordinary learned man (10/130).

اس نے اپنی طویل عمر میں فلسفہ اور سائنس سے لے کر مذہب تک تقریباً تمام علوم کا گہرا مطالعہ کیا۔ آخر عمر میں اس نے یہ کوشش کی کہ وہ انجیل کا تجزیہ کرے اور یہ معلوم کرے کہ حضرت مسیح نے واقعۃً کیا کہا تھا اور بیان کرنے والوں نے ان کے بارے میں کیا بیان کیا:

He attempted an analysis of the New Testament in order to discover what Jesus really said as distinguished from what he was reported to have said.

جیفرسن نے آخر عمر میں یہ وصیت کی تھی کہ اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر جو کتبہ لگایا جائے اس میں یہ نہ لکھا جائے کہ وہ امریکہ کا صدر تھا۔ بلکہ یہ لکھا جائے کہ وہ ورجینیا یونیورسٹی کا بانی تھا۔ چنانچہ اس کی وصیت کے مطابق اس کی قبر (Monticello) پر جو کتبہ لگا ہوا ہے اس میں یہ الفاظ درج ہیں:

Here was buried Thomas Jefferson ..... father of the University of Verginia (10/131).

حقیقت یہ ہے کہ علم سب سے بڑی دولت ہے۔ جو لوگ علم کی اہمیت کو جان لیں، ان کو امریکہ کی صدارت بھی ہیچ معلوم ہوگی۔

علم سب سے بڑی دولت ہے۔ علم ہی وہ واحد چیز ہے جس سے آدمی کبھی نہیں اکتاتا، جس کی حد کبھی کسی کے لیے نہیں آتی۔ علم ہر معاملہ میں کارآمد ہے۔ وہ ہر میدان میں کامیابی کا زینہ ہے۔ علم سے آدمی کو وہ شعور ملتا ہے جس سے وہ دنیا کو جانے۔ جس سے وہ باتوں کو ان کی گہرائی تک سمجھ سکے۔ علم ایسا سکہ ہے جس سے آپ دنیا کی ہر چیز خرید سکتے ہیں۔

علم ہر قسم کی ترقی کا راز ہے، فرد کے لیے بھی اور قوم کے لیے بھی، جس کے پاس علم ہو اس کے پاس گویا ہر چیز موجود ہے۔

جناب عبدالرحمٰن انتولے (بیرسٹرایٹ لا، اور سابق چیف منسٹر مہاراشٹر) نے ۵ فروری ۱۹۸۷ کی ملاقات میں ایک واقعہ بتایا۔ غالباً ۱۹۵۴ کی بات ہے۔ اس وقت وہ لندن کی کونسل آف لیگل ایجوکیشن میں قانون کے طالب علم تھے۔ ایک لکچر کے دوران ایک قانونی مسئلہ کی وضاحت کرتے ہوئے ان کے انگریز پروفیسر نے انھیں یہ واقعہ سنایا تھا۔

پروفیسر نے بتایا کہ ایک بڑا صنعتی کارخانہ چلتے چلتے اچانک بند ہوگیا۔ کارخانہ کے انجنیر اس کو دوبارہ چلانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکے۔ آخر ایک بڑے اکسپرٹ کو بلایا گیا۔ وہ آیا تو اس نے کارخانہ کا ایک راونڈ لیا۔ اس نے اس کی مشینیں دیکھیں۔ اس کے بعد وہ ایک جگہ رک گیا۔ اس نے کہا کہ ایک ہتھوڑا لے آؤ۔ ہتھوڑا لایا گیا تو اس نے ایک مقام پر ہتھوڑے سے مارا۔ اس کے بعد مشین حرکت میں آگئی اور کارخانہ چلنے لگا۔

مذکورہ اکسپرٹ نے واپس جاکر ایک سو پونڈ کا بل بھیج دیا۔ کارخانہ کے منیجر کو یہ بل بہت زیادہ معلوم ہوا۔ اس نے ایکسپرٹ کے نام اپنے خط میں لکھا کہ آپ نے تو کوئی کام کیا نہیں، یہاں آکر آپ نے صرف ایک ہتھوڑا مار دیا۔ اس کے لیے ایک سو پونڈ کا بل ہماری سمجھ میں نہیں آیا۔ براہِ کرم آپ ہمارے نمائندہ کو مزید اور زیادہ بہتر تفصیلات عطا فرمائیں:

Please furnish my client with further and better particulars.

اس کے جواب میں مذکورہ اکسپرٹ نے لکھا کہ میں نے جو بل روانہ کیا تھا وہ بالکل صحیح ہے۔ اصل یہ ہے کہ ۹۹ پونڈ اور ۱۹ شلنگ تو یہ جاننے کے لیے ہیں کہ مشین میں غلطی کیا ہے اور کہاں ہے۔ اور ایک شلنگ ہتھوڑا اٹھا کر مارنے کے لیے:

£ 99.19 to diagnose the disease and one shilling to pick up the hammer and to strike at the right spot.

اس دنیا میں سب سے زیادہ قیمت علم کی ہے۔ سو میں ایک اگر محنت کی قیمت ہو تو سو میں ننانوے علم کی قیمت قرار پائے گی۔

محرومی کے بعد بھی

سموئل بٹلر (Samuel Butler) انیسویں صدی کا مشہور انگریز مصنف ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ زندگی اس فن کا نام ہے کہ ناکافی مقدمات سے کافی نتائج اخذ کیے جائیں:

Life is the art of drawing sufficient conclusions from insufficent premises.

سموئل بٹلر نے یہ بات فطری تعقل کے تحت کہی ہے۔ مگر زندگی کے بارہ میں شریعت نے جو تصور دیا ہے وہ بھی عین یہی ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اس دنیا میں خدا نے جو نظام بنایا ہے، اس میں آسانی کے ساتھ مشکل لگی ہوئی ہے (اِنَّ مَعَ العُسرِ یُسراً) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک بار ایک پہاڑی راستہ کو دیکھا جس کا نام لوگوں نے الضَّیِّقَۃ (دشوار) رکھ دیا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں۔ اس کا نام تو الیُسریٰ (آسان) ہے۔ گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ آدمی عُسر میں یُسر کو دریافت کرے۔ وہ دشوار گزار راستہ کو آسان راستہ کے روپ میں دیکھ سکے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی اس تعلیم کی اعلیٰ ترین مثال ہے۔ آپ کو سخت ترین مشکلات پیش آئیں، مگر آپ نے حکیمانہ تدبیر سے ان کو اپنے حق میں آسان بنالیا۔ آپ نے ڈس ایڈوانٹج کو ایڈوانٹج میں تبدیل کرلیا۔ ایک مستشرق مسٹر کیلٹ (E.E. Kellet) نے آپ کی اس صفت کمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انھوں نے مشکلات کا سامنا اس عزم کے ساتھ کیا کہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں:

He faced adversity with the determination to wring success out of failure.

دنیا میں ایک طرف انسان ہے جو دوسرے انسان کے لیے مشکلات پیدا کرتا ہے۔ دوسری طرف خدا کا نظام ہے جس نے ہر مشکل کے ساتھ اس کا حل بھی رکھ دیا ہے۔ ایسی حالت میں انسانی مشکلات پر شور کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ آدمی نے انسان کے عمل کو دیکھا مگر وہ خدا کے عمل کو نہ دیکھ سکا۔ کیوں کہ اگر وہ خدا کے عمل کو دیکھتا تو شکایت کرنے کے بجائے وہ اس کو استعمال کرنے میں لگ جاتا۔

اس دنیا میں ہر ناکامی کے بعد ایک نئی کامیابی کا امکان آدمی کے لیے باقی رہتا ہے۔ ضرورت صرف یہ ہے کہ آدمی اس امکان کو استعمال کرکے دوبارہ اپنے آپ کو کامیاب بنا لے۔

الرسالہ (دسمبر ۱۹۸۸) میں کناڈا کے کھلاڑی بن جانسن (Ben Johnson) کا قصہ چھپ چکا ہے۔ دوڑ کے عالمی مقابلہ میں اس نے اول درجہ کی کامیابی حاصل کی۔ مگر اگلے ہی دن اس کا جیتا ہوا گولڈ میڈل اس سے چھین لیا گیا۔ مزید اس کے بارہ میں یہ سخت فیصلہ کیا گیا کہ وہ اگلے دو سال تک کھیل کے مقابلوں میں حصہ نہ لے سکے گا۔ بن جانسن کے لیے یہ اس کی زندگی کا شدید ترین حادثہ تھا۔ تاہم اس نے "ظالم ججوں" کے خلاف احتجاج میں وقت ضائع نہیں کیا۔ اس نے از سرِ نو اپنی تیاری کا منصوبہ بنایا۔

اٹلی کے ٹیلی وژن نیٹ ورک نے نومبر ۱۹۸۸ میں بن جانسن کا ایک باتصویر انٹرویو اس کی رہائش گاہ (ٹورانٹو) پر لیا جس کی تفصیل اخبارات میں شائع ہوئی ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۹ نومبر ۱۹۸۸) کے مطابق، ایک سو میٹر دوڑ کے عالمی چیمپین بن جانسن نے ٹیلی وژن کیمرہ کے سامنے روتے ہوئے کہا کہ انھوں نے جان بوجھ کر کھیل کے اصولوں کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی۔ تاہم وہ اپنی تیاری جاری رکھے ہوئے ہیں اور وہ بارسلونہ (اسپین) میں ۱۹۹۲ میں ہونے والے اولمپک کھیلوں میں واپس آنے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ان کا عالمی ریکارڈ ٹریک پر ۱۳ سال کی مسلسل محنت کا نتیجہ تھا۔ بظاہر وہ بہت افسردہ دکھائی دے رہے تھے۔ سیول اولمپک کے بعد پیش آنے والے مشکل لمحات کا ذکر کرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے۔ انٹرویو لینے والے مسٹر گیانی منولی (Gianni Minoli) نے کہا کہ شوٹنگ کا کام پانچ منٹ تک روک دینا پڑا۔ کیوں کہ بن جانسن اپنی سسکیوں پر قابو نہیں پا سکے تھے۔

بن جانسن نے بتایا کہ ٹریک پر واپس آنے کے لیے وہ ہفتہ میں چھ دن چار گھنٹہ روزانہ ٹریننگ حاصل کر رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میرا کام صرف دوڑنا ہے۔ بیٹھے رہنے کی بات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ میری خواہش یہ ہے کہ میں دوبارہ مقابلہ میں حصہ لوں۔ انھوں نے میرا سونے کا تمغہ مجھ سے لیا ہے نہ کہ میری رفتار:

They have taken away my gold medal, not my speed.

چھیننے والا ہمیشہ آپ کی کوئی چیز چھینتا ہے نہ کہ خود آپ کو۔ آپ کا وجود اپنی پوری صلاحیتوں کے ساتھ پھر بھی آپ کو حاصل رہتا ہے۔ اس حاصل شدہ متاع کو استعمال کیجیے، اور پھر ہر محرومی کے بعد آپ اپنی ایک نئی تاریخ بنا سکتے ہیں۔

مشتعل نہ کیجئے

ہندستان میں سب سے زیادہ شیر گیر کے جنگل میں پائے جاتے ہیں۔ یہاں ان کے لیے بہت بڑا کھلا پارک بنایا گیا ہے جس کو Gir forest sanctuary کہا جاتا ہے۔ بلیسویں صدی کے آغاز میں یہاں ۲۰ سے بھی کم تعداد میں شیر پائے جاتے تھے مگر مئی ۱۹۹۰ کی گنتی کے مطابق، اب وہاں ۲۸۰ شیر ہیں۔ ان شیروں کی وجہ سے انسانی زندگی کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ ٹائمس آف انڈیا (۲۲ اگست ۱۹۹۰) کی ایک رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پچھلے دو برسوں میں ان شیروں نے علاقہ کے ۱۹ آدمی مار ڈالے اور ۱۴۰ آدمیوں کو زخمی کیا۔

ان حادثات کے بعد مسٹر روی چیلم کی قیادت میں ایک ٹیم کو مقرر کیا گیا تا کہ وہ صورت حال کے بارہ میں تحقیق کرے۔ انھوں نے تحقیق کے بعد یہ بتایا ہے کہ شیروں نے اگرچہ بہت سے انسانوں کو نقصان پہنچایا اور ان پر حملے کیے۔ مگر یہ حملے محض شیروں کی درندگی کی بنا پر نہ تھے۔ ریسرچ کرنے والوں نے انسان کے اوپر شیر کے اکثر حملوں کا سبب اشتعال انگیزی کو قرار دیا ہے:

The researchers have attributed most of the lion attacks on humans to provocations of the animals.

شیر ایک خوں خوار درندہ ہے۔ وہ انسان کے لیے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ مگر شیر اپنی ساری درندگی کے باوجود اپنی فطرت کے ماتحت رہتا ہے۔ اور اس کی فطرت یہ ہے کہ وہ اشتعال انگیزی کے بغیر کسی انسان کے اوپر حملہ نہ کرے۔

یہ قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے جو یہ بتاتی ہے کہ "درندہ انسانوں" کے ظلم سے کس طرح بچا جائے۔ درندہ انسان کے ظلم سے بچنے کی واحد یقینی تدبیر یہ ہے کہ اس کو اس کی فطرت کی ماتحتی میں رہنے دیا جائے۔ اشتعال دلانے سے پہلے ہر انسان اپنی فطرت کے زیر حکم رہتا ہے۔ اور اشتعال دلانے کے بعد ہر آدمی اپنی فطرت کے حکم سے باہر آجاتا ہے۔ گویا فطرت خود ہر آدمی کو ظلم و فساد سے روکے ہوئے ہے۔ ایسی حالت میں آپ کو جوابی کارروائی کرنے کی کیا ضرورت۔

مشتعل ہونے سے پہلے شیر ایک بے ضرر حیوان ہے۔ مشتعل ہونے کے بعد شیر ایک مردم خور حیوان بن جاتا ہے۔ آپ شیر کو مشتعل نہ کیجئے، اور پھر آپ اس کے نقصان سے محفوظ رہیں گے۔

نرمی اور تحمل کوئی بزدلی کی بات نہیں، یہ زندگی کا ایک اہم اصول ہے جو خود خالق فطرت نے تمام مخلوقات کو سکھایا ہے۔

عربی کا ایک مثل ہے: السَّماحُ رِباحٌ ۔ یعنی معاملات میں نرمی اور وسعتِ ظرف کا طریقہ ہمیشہ مفید ہوتا ہے۔

یہ مثل انسانی تجربات سے بنی ہے۔ انسان نے ہزاروں برس کے دوران دونوں قسم کا تجربہ کیا۔ نرم رویہ کا بھی اور سخت رویہ کا بھی۔ آخر کار تجربات سے ثابت ہوا کہ سخت رویہ الٹا نتیجہ پیدا کرتا ہے، اس کے مقابلہ میں نرم رویہ ایسا نتیجہ پیدا کرتا ہے جو آپ کے لیے مفید ہو۔

ریلوے اسٹیشن پر دو آدمی چل رہے تھے۔ ایک آدمی آگے تھا، دوسرا آدمی پیچھے۔ پیچھے والے کے ہاتھ میں ایک بڑا بکس تھا۔ تیزی سے آگے بڑھتے ہوئے اس کا بکس اگلے آدمی کے پاؤں سے ٹکرا گیا۔ وہ پلیٹ فارم پر گر پڑا۔

پیچھے والا آدمی فوراً ٹھہر گیا اور شرمندگی کے ساتھ بولا کہ مجھے معاف کیجئے (Excuse me) آگے والے آدمی نے اس کو سنا تو وہ بھی ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے کہا کوئی حرج نہیں (O.K.) اور پھر دونوں اٹھ کر اپنی اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اس قسم کی کوئی ناخوش گوار صورت پیش آئے تو دونوں بگڑ جائیں۔ ایک کہے کہ تم اندھے ہو۔ دوسرا کہے کہ تم بدتمیز ہو، تم کو بولنا نہیں آتا۔ وغیرہ۔ اگر ایسے موقع پر دونوں اس قسم کی بولی بولنے لگیں تو بات بڑھے گی۔ یہاں تک کہ دونوں لڑ پڑیں گے۔ پہلے اگر ان کے جسم پر مٹی لگ گئی تھی تو اب ان کے جسم سے خون بہے گا۔ پہلے اگر ان کے کپڑے پھٹے تھے تو اب ان کی ہڈیاں توڑی جائیں گی۔

خواہ گھریلو زندگی کا معاملہ ہو یا گھر کے باہر کا معاملہ ہو۔ خواہ ایک قوم کے افراد کا جھگڑا ہو یا دو قوموں کے افراد کا جھگڑا۔ ہر جگہ نرم روی اور عالی ظرفی سے مسئلے ختم ہوتے ہیں اور اس کے برعکس رویہ اختیار کرنے سے مسئلے اور بڑھ جاتے ہیں۔

نرم روی کا طریقہ گویا آگ پر پانی ڈالنا ہے، اور شدت کا طریقہ گویا آگ پر پٹرول ڈالنا۔ پہلا طریقہ آگ کو بجھاتا ہے اور دوسرا طریقہ آگ کو مزید بھڑکا دیتا ہے۔

دشمن میں دوست

ڈاکٹر سید عبداللطیف (۱۹۷۱-۱۸۹۱) کرنول (دکن) میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن اور دوسری خدمات کی وجہ سے کافی مشہور ہیں۔ وہ مقامی ہائی اسکول میں اپنے والد کی اطلاع کے بغیر داخل ہوگیے تھے۔ والد کو انگریز اور انگریزی تعلیم سے سخت نفرت تھی۔ ان کو معلوم ہوا تو غصہ ہوگیے اور درشت لہجے میں پوچھا کہ انگریزی پڑھ کر کیا کرے گا۔ دبلے پتلے، پست قامت لڑکے نے جواب دیا: انگریزی پڑھ کر قرآن کا ترجمہ انگریزی زبان میں کروں گا۔ ۱۹۱۵ میں انھوں نے بی اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ ۱۹۲۰ میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں انگریزی کے استاد مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۲ میں ان کے لیے نیا تعلیمی موقع پیدا ہوا جب کہ جامعہ عثمانیہ کے چار استادوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ بھیجنا طے پایا اور ان کے لیے ریاست کی طرف سے ۳۰ ہزار روپے کا بلاسودی قرض منظور کیا گیا۔ ان میں سے ایک سید عبداللطیف بھی تھے۔

لندن پہنچ کر وہ وہاں بی اے (آنرز) میں داخلہ لینا چاہتے تھے۔ مگر کنگس کالج کے صدر شعبۂ انگریزی اور دوسرے انگریز اساتذہ آپ کی صلاحیت سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ آپ کو بی اے اور ایم اے سے مستثنیٰ کرتے ہوئے براہ راست پی ایچ ڈی کرنے کی اجازت دے دی۔ آپ کے مقالہ کا عنوان "اردو ادب پر انگریزی ادب کے اثرات" طے پایا۔ مقالہ کی تیاری کی مدت تین سال مقرر کی گئی تھی مگر آپ نے دو سال ہی میں پی ایچ ڈی کے مقالہ کی تکمیل کرلی۔ کنگس کالج کے ذمہ داروں نے اس کو منظور کرتے ہوئے ڈاکٹریٹ کا مستحق قرار دیا۔ سید عبداللطیف مقررہ مدت سے ایک سال پہلے ڈاکٹر ہوکر حیدرآباد واپس آگیے۔ یہاں آپ کو فوراً جامعہ عثمانیہ کا پروفیسر بنا دیا گیا۔ (انجمن، از حسن الدین احمد آئی اے ایس)

۱۹۲۲ میں انگریز کو مسلمانوں کا سب سے بڑا دشمن سمجھا جاتا تھا۔ مگر اسی دشمن نے مسلمان طالب علم کے ساتھ فیاضی کا وہ معاملہ کیا جس کی مثال مسلم اداروں میں بھی مشکل سے ملے گی۔ حقیقت یہ ہے کہ "دشمن انسان" کے اندر بھی "دوست انسان" موجود ہوتا ہے۔ مگر اس دوست انسان کو وہی لوگ پاتے ہیں جو دوستی اور دشمنی سے اوپر اٹھ کر انسانوں سے معاملہ کرنا جانتے ہوں۔

عام مزاج یہ ہے کہ لوگ اپنوں کو اپنا اور غیروں کو غیر سمجھتے ہیں۔ مگر کھلے دل والے انسان کے لیے ہر ایک اس کا اپنا ہے، کوئی اس کا غیر نہیں۔

سوامی رام تیرتھ (۱۹۰۶ - ۱۸۷۳) نہایت قابل آدمی تھے۔ ان کا ایک بہت بامعنی قول ہے: زندگی کے سب دروازوں پر لکھا ہوا ہوتا ہے "کھینچو" مگر اکثر ہم اسے "دھکا" دینا شروع کر دیتے ہیں۔

سوامی رام تیرتھ روانی کے ساتھ انگریزی بولتے تھے۔ وہ دھرم کے پرچار کے لیے ۱۹۰۳ میں امریکہ گئے۔ ان کا جہاز سان فرانسسکو کے سمندری ساحل پہ لنگر انداز ہوا۔ وہ اترے تو ایک امریکی ازراہِ تعارف ان کے قریب آیا۔ اس کے بعد جو گفتگو ہوئی وہ یہ تھی:

"آپ کا سامان کہاں ہے" امریکی نے پوچھا۔

"میرا سامان بس یہی ہے" سوامی رام تیرتھ نے جواب دیا۔

"اپنا روپیہ پیسہ آپ کہاں رکھتے ہیں"

"میرے پاس روپیہ پیسہ ہے ہی نہیں"

"پھر آپ کا کام کیسے چلتا ہے"

"میں سب سے پیار کرتا ہوں، بس اسی سے میرا سب کام چل جاتا ہے"

"تو امریکہ میں آپ کا کوئی دوست ضرور ہوگا"

"ہاں ایک دوست ہے اور وہ دوست یہ ہے"

سوامی رام تیرتھ نے یہ کہا اور اپنے دونوں بازو امریکی شخص کے گلے میں ڈال دیے۔ امریکی ان کی اس بات سے بہت متاثر ہوا۔ اس کے بعد وہ امریکی ان کا اتنا گہرا دوست بن گیا کہ وہ انھیں اپنے گھر لے گیا اور سوامی رام تیرتھ جب تک امریکہ میں رہے وہ برابر ان کے ساتھ رہا اور ان کی خدمت کرتا رہا۔ حتیٰ کہ وہ ان کا شاگرد بن گیا۔

اس دنیا میں محبت سب سے بڑی طاقت ہے۔ محبت کے ذریعہ آپ اپنے مخالف کو جھکا سکتے ہیں اور ایک اجنبی شخص کو اپنا بنا سکتے ہیں۔ بشرطیکہ آپ کی محبت سچی محبت ہو، وہ دکھاوے اور نمائش کے لیے نہ ہو۔

ناکامی میں کامیابی

موہن سنگھ اوبرائے ۱۵ اگست ۱۹۰۰ کو جہلم کے ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ ان کے باپ پشاور میں ٹھیکہ داری کا کام کرتے تھے۔ مگر مسٹر اوبرائے ابھی صرف چھ مہینے کے تھے کہ ان کے باپ کا انتقال ہوگیا۔ باپ کے مرنے کے بعد مسٹر اوبرائے بے وسیلہ ہوکر رہ گیے۔ بڑی مشکلوں سے انھوں نے سرگودھا سے میٹرک کیا اور لاہور سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد مالی دشواری کی بنا پر وہ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔

مسٹر اوبرائے نے اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں جو ٹائمس آف انڈیا کے سنڈے ایڈیشن (۱۲ اگست ۱۹۹۰) میں چھپے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ انٹرمیڈیٹ کے بعد جب میں نے دیکھا کہ اب میں مزید تعلیم حاصل نہیں کر سکتا تو یہ میری زندگی میں بڑی تشویش کا لمحہ تھا۔ کیوں کہ میں نے محسوس کیا کہ موجودہ تعلیمی لیاقت کے ذریعہ میں کوئی سروس حاصل نہیں کر سکتا:

This was a moment of anxiety in my life as I realised that my qualifications would not get me a job.

سروس سے محرومی انھیں بزنس کے میدان میں لے گئی۔ یہ کاروباری جدوجہد کی ایک لمبی کہانی ہے جس کو مذکورہ اخبار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ۱۹۲۴ میں وہ معمولی طور پر ایک ہوٹل کے کام میں شریک ہوئے۔ ۱۹۳۹ میں جب دوسری عالمی جنگ شروع ہوئی تو وہ کلکتہ میں اپنا ایک ہوٹل شروع کر چکے تھے۔ ان کا کام بڑھتا رہا۔ یہاں تک کہ آج وہ ایک "ہوٹل ایمپائر" کے مالک ہیں۔ ہندستان کے اکثر بڑے شہروں میں ان کے "ہوٹل اوبرائے" کے نام سے قائم ہیں۔ اس کے علاوہ سنگاپور، سعودی عرب، سری لنکا، نیپال، خلیج، مصر اور افریقہ میں ان کے بڑے بڑے ہوٹل کامیابی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

مسٹر اوبرائے کو سروس کے میدان میں جگہ نہیں ملی تو انھوں نے بزنس کے میدان میں اس سے زیادہ بڑی جگہ اپنے لیے حاصل کرلی۔ یہی موجودہ دنیا میں کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔ یہاں کامیاب وہ ہوتا ہے جو گرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے کی صلاحیت کا ثبوت دے سکے۔

اگر ایک میدان میں آپ کو مواقع نہ ملیں تو دوسرے میدان میں محنت شروع کر دیجیے۔ عین ممکن ہے کہ آپ دوسرے میدان میں وہ سب کچھ پالیں جس کی امید آپ پہلے میدان میں کیے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر سالم علی (۱۹۸۷-۱۸۹۶) کو علم طیور (Ornithology) میں غیر معمولی مقام ملا۔ ہندستان نے ان کو پدما بھوشن کا خطاب دیا۔ برطانیہ نے ان کو گولڈ میڈل سے نوازا۔ ہالینڈ نے ان کو گولڈن آرک عطا کیا۔ عالمی ادارہ وائلڈ لائف نے ان کو انعام کے طور پر ۵۰ ہزار ڈالر دیئے۔ ہندستان کی تین یونیورسیٹیوں نے اعزازی طور پر ان کو ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی۔ وہ راجیہ سبھا کے ممبر بنائے گیے وغیرہ۔ ڈاکٹر سالم علی کو یہ غیر معمولی کامیابی ایک غیر معمولی ناکامی کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ وہ بمبئی کے ایک گنجان علاقہ کھیت واڑی میں پیدا ہوئے۔ بی اے تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھیں روزگار کی ضرورت ہوئی۔ مگر جب وہ روزگار کی تلاش میں نکلے تو ان کے الفاظ میں " ہر ادارے اور ہر دفتر میں ان کے لیے جگہ نہیں (No vacancy) کا بورڈ لگا ہوا تھا"۔ اس ناکامی نے ان کے لیے نئی کامیابی کے راستے کھول دیے۔

ایک روز انھوں نے ایک چھوٹی چڑیا پکڑی۔ اس کو دیکھا تو اس میں ایک غیر معمولی خصوصیت نظر آئی۔ اس کی گردن پیلے رنگ کی تھی۔ انھوں نے اس کی تحقیق شروع کر دی۔ انھوں نے علم طیور کے موضوع پر بہت سی کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ان کی دل چسپی بڑھتی گئی۔ یہاں تک کہ انھوں نے ایک دستی دور بین حاصل کی۔ اب ان کا کام یہ ہو گیا کہ اِدھر اُدھر جاکر چڑیوں کا مشاہدہ کریں اور ان کے حالات اپنی ڈائری میں لکھیں۔ آخر کار انھوں نے علم طیور میں اتنی مہارت پیدا کی کہ خود اس فن کو نئی جہتوں اور نئی وسعتوں سے آشنا کیا۔ ان کی دو کتابیں بہت مشہور ہیں۔ ایک کتاب میں انھوں نے برصغیر ہند کی ۱۲۰۰ چڑیوں کے حالات لکھے ہیں۔ ان کی دوسری کتاب طیور ہند *(Indian Birds)* ہے جو گیارہ بار چھپ چکی ہے۔ اور عالمی سطح پر پڑھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر سالم علی کو زمینی ادارہ میں جگہ نہیں ملی تھی، انھوں نے آسمانی مشاہدہ میں اپنے لیے زیادہ بہتر کام تلاش کر لیا۔ ان کو ملکی ملازمت میں نہیں لیا گیا تھا، مگر اپنی اعلیٰ کارکردگی کے ذریعہ وہ عالمی اعزاز کے مستحق قرار پائے۔

فاصلہ پر رہو

سڑک پر بیک وقت بہت سی سواریاں دوڑتی ہیں۔ آگے سے پیچھے سے، دائیں سے بائیں سے۔ اس لیے سڑک کے سفر کو محفوظ حالت میں باقی رکھنے کے لیے بہت سے قاعدے بنائے گئے ہیں۔ یہ سڑک کے قاعدے (Traffic rules) سڑک کے کنارے ہر جگہ لکھے ہوئے ہوتے ہیں تاکہ سڑک سے گزرنے والے لوگ انھیں پڑھیں اور ان کی رہنمائی میں اپنا سفر طے کریں۔

دہلی کی ایک سڑک سے گزرتے ہوئے اسی قسم کا ایک قاعدہ بورڈ پر لکھا ہوا نظر سے گزرا۔ اس کے الفاظ یہ تھے ——— فاصلہ برقرار رکھو :

Keep Distance

میں نے اس کو پڑھا تو میں نے سوچا کہ ان دو لفظوں میں نہایت دانائی کی بات کہی گئی ہے۔ یہ ایک مکمل حکمت ہے۔ اس کا تعلق سڑک کے سفر سے بھی ہے اور زندگی کے عام سفر سے بھی۔

موجودہ دنیا میں کوئی آدمی اکیلا نہیں ہے۔ ہر آدمی کو دوسرے بہت سے انسانوں کے درمیان رہتے ہوئے اپنا کام کرنا پڑتا ہے۔ ہر آدمی کے سامنے اس کا ذاتی انٹرسٹ ہے۔ ہر آدمی اپنے اندر ایک انا لیے ہوئے ہے۔ ہر آدمی دوسرے کو پیچھے کرکے آگے بڑھ جانا چاہتا ہے۔

یہ صورت حال تقاضا کرتی ہے کہ ہم زندگی کے سفر میں "فاصلہ پر رہو" کے اصول کو ہمیشہ پکڑے رہیں۔ ہم دوسرے سے اتنی دوری پر رہیں کہ اس سے ٹکراؤ کا خطرہ مول لیے بغیر ہم اپنا سفر جاری رکھ سکیں۔

اسی حکمت کو قرآن میں اعراض کہا گیا ہے۔ اگر آپ اعراض کی اس حکمت کو ملحوظ نہ رکھیں تو کہیں آپ کا فائدہ دوسرے کے فائدہ سے ٹکرا جائے گا۔ کہیں آپ کا ایک سخت لفظ دوسرے کو مشتعل کرنے کا سبب بن جائے گا۔ کہیں آپ کی بے احتیاطی آپ کو غیر ضروری طور پر دوسروں سے الجھا دے گی۔

اس کے بعد وہی ہوگا جو سڑک پر ہوتا ہے۔ یعنی حادثہ (accident) سڑک کا حادثہ آدمی سفر کو روک دیتا ہے۔ بعض اوقات خود مسافر کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح زندگی میں مذکورہ اصول کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آپ کی ترقی کا سفر رک جائے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ خود اپنی زندگی سے محروم ہو جائیں۔ آپ تاریخ کے صفحہ سے حرف غلط کی طرح مٹا دیے جائیں۔

ماضی میں اور حال میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ جب بھی کسی شخص نے اپنی مقررہ حد کو پار کیا، وہ لازمی طور پر برے انجام کا شکار ہوا۔

نیتین والیا ایک ۳ سالہ بچہ ہے۔ وہ اپنے والدین (وجے پال والیا اور سونیتا) کے ساتھ شاہدرہ میں رہتا ہے۔ بچہ کو چڑیا گھر دیکھنے کا شوق تھا۔ اس کے والدین اس کو دہلی کا چڑیا گھر دکھانے کے لیے لے گیے۔ مختلف جانوروں کو دیکھتے ہوتے یہ لوگ وہاں پہونچے جہاں سفید شیر کا پنجرہ ہے۔ وہ شیر اور اس کے بچے کو دیکھنے کے لیے رکے۔ یہاں نیتین ریلنگ کے اندر داخل ہو گیا اور پنجرہ میں اپنا ہاتھ ڈال دیا۔ شیرنی (نیما) نے جھپٹ کر اس کا ہاتھ اپنے منھ میں لے لیا۔ لوگوں نے اس کو لکڑی سے مار کر ہٹایا، مگر اس دوران وہ بچے کا ہاتھ کندھے تک چبا چکی تھی۔ آپریشن کے بعد بچہ زندہ ہے مگر وہ ساری عمر کے لیے اپنے دائیں ہاتھ سے محروم ہو چکا ہے۔

ٹائمس آف انڈیا (۲۱ مارچ ۱۹۸۸) کے رپورٹر کے مطابق، بچہ کے والدین نے اس حادثہ کی ذمہ داری چڑیا گھر کے کارکنوں پر ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ اس وقت پنجرہ کے پاس کوئی چوکیدار موجود نہ تھا:

The parents claim that there were no gaurds around.

اکثر لوگوں کا یہ حال ہے کہ جب ان کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آتا ہے تو وہ فوراً اپنے سے باہر کسی کو تلاش کرتے ہیں جس پر حادثہ کی ذمہ داری ڈال سکیں۔ مگر موجودہ دنیا میں اس قسم کی کوشش سراسر بے فائدہ ہے۔ یہاں حادثات سے صرف وہ شخص بچ سکتا ہے جو اپنے آپ کو قابو میں رکھے۔ جو شخص خود بے قابو ہو جائے وہ لازماً حادثہ سے دوچار ہوگا، خواہ دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کے لیے اس نے ڈکشنری کے تمام الفاظ دہرا ڈالے ہوں۔

چڑیا گھر میں خونخوار جانور کے کٹہرے سے چار فٹ کے فاصلہ پر ریلنگ (railing) لگی ہوئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جانور کے مقابلہ میں آدمی کو ایک محفوظ فاصلہ پر رکھا جائے۔ اسی طرح زندگی کے ہر موڑ پر ایک ریلنگ کھڑی ہوتی ہے۔ جو شخص ریلنگ کو حد سمجھ کر وہاں ٹھہر جائے وہ محفوظ رہے گا۔ اور جو شخص ریلنگ کو پار کر جائے، وہ اپنے آپ کو حادثات سے نہیں بچا سکتا، نہ چڑیا گھر کے اندر اور نہ چڑیا گھر کے باہر۔

مقابلہ کی ہمت

جے آر ڈی ٹاٹا (J.R.D. Tata) ہندستان کے چند انتہائی بڑے صنعت کاروں میں سے ہیں۔ بوقت تحریر ان کی عمر ۸۵ سال کی ہے۔ اب بھی وہ ہوائی جہاز چلاتے ہیں اور برف پر اسکینگ (skiing) کرتے ہیں۔ اتنی بڑی عمر میں ان کی اس صحت کا راز کیا ہے، اس کے جواب میں انھوں نے کہا :

> One of the things that keep me young is the fact that I am prepared to live dangerously. You must be prepared to take risks — risk in business, sport, marriage, everything, to make life worthwhile. (p. 4).

جو چیزیں مجھ کو برابر جوان رکھتی ہیں ان میں سے ایک یہ حقیقت ہے کہ میں خطرات میں جینے کے لیے تیار رہتا ہوں۔ زندگی کو کارآمد بنانے کی خاطر آپ کو رسک لینے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ بزنس، کھیل، شادی، ہر چیز میں رسک (ہندستان ٹائمس ۱۳ جولائی ۱۹۹۱)

انگریزی کا مثل ہے کہ رسک نہیں تو کامیابی بھی نہیں (No risk no gain) یہاں سوال یہ ہے کہ رسک اور خطرات کیوں آدمی کو کامیابی اور ترقی کی طرف لے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسک آدمی کی قوتوں کو جگاتا ہے، وہ ایک معمولی انسان کو غیر معمولی انسان بنا دیتا ہے۔

آدمی اگر خطرات کا سامنا نہ کرے، وہ رسک کی صورتوں سے دور رہے تو وہ سست اور کاہل انسان بن جائے گا۔ اس کی فطری صلاحیتیں خوابیدگی کی حالت میں پڑی رہیں گی۔ وہ ایسا بیج ہوگا جو پھٹا نہیں کہ درخت بنے، وہ ایسا ذخیرۂ آب ہوگا جس میں موجیں نہیں اٹھیں جو طوفان کی صورت اختیار کرے۔

مگر جب آدمی کو خطرات پیش آتے ہیں، جب اس کی زندگی رسک کی حالت سے دوچار ہوتی ہے تو اس کی شخصیت کے اندر چھپی ہوئی فطری استعداد جاگ اٹھتی ہے۔ حالات کا دباؤ اس کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ متحرک ہو جائے، وہ اپنی ساری طاقت اپنے کام میں لگا دے۔

ہر آدمی کے اندر اتھاہ صلاحیتیں ہیں۔ مگر یہ صلاحیتیں ابتدائی طور پر سوئی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ کبھی جگائے بغیر نہیں جاگتیں۔ ان صلاحیتوں کو جگانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ وہ یہ کہ انھیں چیلنج سے سابقہ پیش آئے۔ انھیں خطرات کا سامنا کرنا پڑے۔

عافیت کی زندگی بظاہر سکون کی زندگی ہے ۔ مگر عافیت کی زندگی کی یہ مہنگی قیمت دینی پڑتی ہے کہ آدمی کی شخصیت ادھوری رہ جائے ۔ وہ اپنی امکانی ترقی کے درجہ تک نہ پہنچ سکے ۔

۶ جنوری ۱۹۹۰ کے اخبارات جو خبریں لاتے ، ان میں سے ایک خبر یہ تھی کہ اظہر الدین کو اتفاق رائے سے قومی ٹیم کا کیپٹن مقرر کیا گیا ہے ۔ وہ نیوزی لینڈ جانے والی انڈین کرکٹ ٹیم کے لیڈر ہوں گے ۔ یہ بات کرکٹ حلقوں کے لیے انتہائی تعجب خیز تھی ۔ کیوں کہ عام خیال تھا کہ یہ عہدہ سری کانت کو دیا جائے گا جو شارجہ کپ ، نہرو کپ اور پاکستان کے دورہ پر جانے والی حالیہ ٹیم کے کپتان رہے ہیں ۔ ۲۷ سالہ اظہر الدین حیدرآبادی کو کرکٹ میں ان کی مہارت کی وجہ سے ونڈر بوائے (wonder boy) کہا جاتا ہے ۔ اظہر الدین ہندستانی کرکٹ کے دوسرے کم عمر کپتان ہیں ۔ ان سے قبل منصور علی خان پٹودی ۲۱ سال کی عمر میں قومی ٹیم کے کپتان بنائے گئے تھے ۔

اظہر الدین کو جس چیز نے اس اعلیٰ عہدے پر پہونچایا ، وہ ان کی یہ صلاحیت ہے کہ چیلنج پیش آنے پر وہ بے ہمت نہیں ہوتے ، بلکہ مزید طاقت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ دسمبر ۱۹۸۹ میں دورۂ پاکستان کے آغاز میں اظہر الدین کا ٹسٹ کیریر خطرہ میں پڑ گیا تھا ۔ کیوں کہ فیصل آباد ٹسٹ کی پہلی باری میں وہ کوئی خاص اسکور نہ کر سکے تھے ، بلکہ صفر پر ہی آوٹ ہو گئے تھے ۔ لیکن دوسری باری میں شاندار سنچری بنا کر انھوں نے اپنا ٹسٹ کیریر تباہ ہونے سے بچا لیا ۔

ٹائمس آف انڈیا (۶ جنوری ۱۹۹۰) کی رپورٹ کے مطابق ، سلکشن کمیٹی کے چیرمین مسٹر راج سنگھ دونگر پور نے کہا کہ اظہر الدین کو منتخب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ چیلنج کا مقابلہ کرنے کو محبوب رکھتے ہیں ، جیسا کہ پاکستان کے دورہ میں دیکھا گیا جہاں وہ پہلے ٹسٹ میں چھنٹ نہ جانے کے قریب پہونچ گئے تھے ۔ اور یہ قیادت کی نہایت اہم خصوصیت ہے :

He loves getting out of challenging situations, as was seen on the tour of Pakistan where he was on the verge of being dropped from the first Test, and that's an important ingredient in leadership.

یہ دنیا چیلنج کی دنیا ہے ۔ یہاں وہی لوگ کامیاب ہوتے ہیں جو چیلنج کا سامنا کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں ۔ یہ صفت کسی آدمی کے اندر جتنی زیادہ ہوگی اتنی ہی زیادہ بڑی کامیابی وہ اس دنیا میں حاصل کرے گا ۔

ضمیر کی طاقت

ابوالبرکات علوی (۶۳ سال) نظام پور ضلع اعظم گڈھ (یوپی) کے رہنے والے ہیں۔ ۲۹ اگست ۱۹۸۹ کی ملاقات میں انھوں نے اپنے علاقہ کا ایک واقعہ بتایا جس میں بہت بڑا سبق ہے۔

اعظم گڈھ کے شمال مغرب میں ایک گاؤں رَیدا ہے جو مجھوئی ندی کے کنارے فیض آباد کی سرحد پر واقع ہے۔ یہاں چار گھر مسلمانوں کے ہیں۔ اس کے مقابلہ میں ہندوؤں کے دو سو گھر آباد ہیں۔ نومبر ۱۹۸۷ میں ایسا ہوا کہ باہر سے ایک نیل گائے آیا اور گنّے کے کھیت میں داخل ہوگیا۔ ایک مقامی مسلمان جھنو درزی نے چاہا کہ اس کا شکار کیا جائے۔ انھوں نے پڑوس کے گاؤں مخدوم پور میں ایک مسلمان کو اس کی خبر کی جس کے پاس بندوق ہے۔ وہ اپنی بندوق لے کر آئے اور نیل گائے پر فائر کیا۔

اگر نیل گائے موقع پر مرگیا ہوتا تو کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوتا۔ مگر نشانہ صحیح نہیں لگا۔ نیل گائے زخمی ہوگیا اور خون بہاتا ہوا بھاگا۔ ہندوؤں نے جب جا بجا خون دیکھا تو وہ مشتعل ہوگیے۔ ان کو معلوم ہوا کہ جھنّو درزی نے مخبری کرکے نیل گائے پر گولی چلوائی ہے تو انھوں نے گاؤں میں پنچایت کی اور جھنو کو بلاکر اس کو یہ سزا سنائی کہ تم نے جو قصور کیا ہے اس کے بدلے تمہارے اوپر ایک ہزار روپیہ جرمانہ عائد کیا جاتا ہے۔

اس گاؤں میں کوئی سطحی لیڈر جھنّو درزی کو بھڑکانے کے لیے موجود نہ تھا اور نہ مسلمانوں کا وہاں کوئی زور تھا جو جھنو درزی کو جھوٹے بھرم میں مبتلا کرے۔ چنانچہ فطرت نے جھنّو درزی کی رہنمائی کی۔ وہ لوگوں کے سامنے کھڑا ہوگیا اور کہا: پنچوں کا فیصلہ مجھ کو منظور ہے۔ میں غریب آدمی ہوں۔ میرے پاس نقد روپیہ موجود نہیں۔ مگر میں اپنے گھر کا سامان بیچ کر اس کو ادا کروں گا۔

تین دن گزرے تھے کہ ہندوؤں کا ضمیر جاگ اٹھا۔ انھوں نے دوبارہ اپنے لوگوں کی پنچایت بلائی۔ انھوں نے آپس میں کہا کہ یہاں مسلمان بہت تھوڑے اور کمزور ہیں۔ باہر کے لوگ جب سنیں گے کہ ہم نے ان سے جرمانہ وصول کیا ہے تو وہ ہم لوگوں کو بہت گرا ہوا سمجھیں گے اور ہماری بے عزتی ہوگی کہ ہم نے مسلمانوں کو کمزور پاکر انھیں دبالیا۔ اتفاق رائے سے یہ طے ہوا کہ جھنّو درزی سے جرمانہ نہ لیا جائے۔ چنانچہ اس متفقہ فیصلہ کے مطابق جھنو درزی کا جرمانہ معاف کردیا گیا۔

ہر انسان کے اندر ضمیر ہے۔ یہ ضمیر فریق ثانی کے اندر آپ کا نمائندہ ہے۔ اس فطری نمائندہ کو استعمال کیجئے اور پھر آپ کو کسی سے شکایت نہ ہوگی۔

سی ایف ڈول (C.F. Dole) نے کہا ہے کہ ـــــ مہربانی کا برتاؤ دنیا میں سب سے بڑی عملی طاقت ہے:

Goodwill is the mightiest force in the universe.

یہ محض ایک شخص کا قول نہیں، یہ ایک فطری حقیقت ہے۔ انسان کے پیدا کرنے والے نے انسان کو جن خصوصیات کے ساتھ پیدا کیا ہے، ان میں سے اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ کسی آدمی کے ساتھ برا سلوک کیا جائے تو وہ بپھر اٹھتا ہے، اور اگر اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے تو وہ احسان مندی کے احساس کے تحت سلوک کرنے والے کے آگے بچھ جاتا ہے۔

اس عام فطری اصول میں کسی بھی شخص کا کوئی استثنار نہیں۔ حتیٰ کہ دوست اور دشمن کا بھی نہیں۔ آپ اپنے ایک دوست سے کڑوا بول بولئے۔ اس کو بے عزت کیجئے۔ اس کو تکلیف پہونچائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس کے بعد فوراً وہ ساری دوستی کو بھول گیا ہے۔ اس کے اندر اچانک انتقامی جذبہ جاگ اٹھے گا۔ وہی شخص جو اس سے پہلے آپ کے اوپر پھول برسا رہا تھا، اب وہ آپ کے اوپر کانٹا اور آگ برسانے کے لیے آمادہ ہو جائے گا۔

اس کے برعکس ایک شخص جس کو آپ اپنا دشمن سمجھتے ہیں، اس سے میٹھا بول بولئے۔ اس کی کوئی ضرورت پوری کر دیجئے۔ اس کی کسی مشکل کے وقت اس کے کام آجائیے۔ حتیٰ کہ پیاس کے وقت اس کو ایک گلاس ٹھنڈا پانی پلا دیجئے۔ اچانک آپ دیکھیں گے کہ اس کا پورا مزاج بدل گیا ہے۔ جو شخص اس سے پہلے آپ کا کھلا دشمن دکھائی دے رہا تھا، وہ آپ کا دوست اور خیر خواہ بن جائے گا۔

خدا نے انسان کی فطرت میں یہ مزاج رکھ کر ہماری عظیم الشان مدد کی ہے۔ اس فطرت نے ایک نہتے آدمی کو بھی سب سے بڑا تسخیری ہتھیار دے دیا ہے۔ اس دنیا میں شیر اور بھیڑیئے کو مارنے کے لیے گولی کی طاقت چاہیے، مگر انسان کو زیر کرنے کے لیے کسی گولی کی ضرورت نہیں۔ اس کے لیے حسن سلوک کی ایک پھوار کافی ہے۔ کتنا آسان ہے انسان کو اپنے قابو میں لانا۔ مگر نادان لوگ اس آسان ترین کام کو اپنے لیے مشکل ترین کام بنالیتے ہیں۔

دماغی اضافہ

سرسی وی رمن (۱۹۷۰-۱۸۸۸) ہندستان کے مشہور سائنس داں تھے۔ وہ ترو چراپلی میں پیدا ہوئے اور بنگلور میں ان کی وفات ہوئی۔ آخر وقت میں وہ رمن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر تھے۔ اس کے علاوہ وہ بہت سے علمی عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۳۰ میں ان کو فزکس کا نوبیل پرائز دیا گیا۔ رمن کے بارہ میں ایک معلوماتی مضمون سنڈے ریویو (۱۷ مارچ ۱۹۹۱) میں چھپا ہے۔ اس کا ایک اقتباس یہ ہے :

Raman believed that science came from the brain and not from equipment. When one of his pupils in spectroscopy complained that he had only a 1 KW lamp whereas his competitor abroad had a 10 KW lamp, Raman told him: "Dont't worry. Put a 10M KW brain to the problem."

رمن کا یقین تھا کہ سائنس دماغ سے آتی ہے نہ کہ ساز و سامان سے۔ ان کے ایک شاگرد نے ایک بار شکایت کی کہ اس کے پاس ریسرچ کا کام کرنے کے لیے صرف ایک کیلو واٹ کا لیمپ ہے، جب کہ بیرونی ملکوں میں اس کے برابر کے ایک طالب علم کے پاس ۱۰ کیلو واٹ کا لیمپ ہوتا ہے۔ رمن نے اس طالب علم کو جواب دیا کہ تردد نہ کرو، تم اپنے مسئلہ کی تحقیق میں ۱۰ کیلو واٹ کا دماغ رکھ لو۔

یہ بات نہایت درست ہے۔ اس دنیا میں ہر کام کا تعلق دماغ سے ہے۔ سامان کی کمی کو دماغ سے پورا کیا جا سکتا ہے، مگر دماغ کی کمی کو سامان سے پورا نہیں کیا جا سکتا۔

دو سو سال اور تین سو سال پہلے مغرب میں جو سائنس داں پیدا ہوئے، ان میں سے کسی کے پاس وہ اعلیٰ سامان نہیں تھا جو آج کسی یونیورسٹی میں ایک ریسرچ طالب علم کے پاس ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک نے کم سامان کے ساتھ کام کیا۔ مثلاً نیوٹن نے کروسین کے لیمپ کے ذریعہ کام کیا، کیوں کہ اس وقت بجلی کا استعمال ہی شروع نہ ہوا تھا۔ وغیرہ۔ مگر یہی سائنس داں تھے جنھوں نے جدید مغربی سائنس کی بنیادیں قائم کیں۔

اس اصول کا تعلق ہر انسان سے ہے۔ جب بھی کسی شخص کو محسوس ہو کہ اس کے پاس سرمایہ یا وسائل یا ساز و سامان کی کمی ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنی دماغی محنت کو بڑھا لے۔ اس کی دماغی محنت اس کے لیے ہر دوسری کمی کی تلافی بن جائے گی۔

فطرت نے دماغ کی صورت میں انسان کو حیرت انگیز طاقت دی ہے۔ دماغ کو استعمال کرکے آدمی اپنی ہر کمی کی تلافی کر سکتا ہے۔

مسٹر کمال علیگ (پیدائش ۱۹۵۸) نے یکم فروری ۱۹۸۹ کی ملاقات میں اپنا ایک واقعہ بتایا۔ وہ پہلے سگریٹ پیتے تھے۔ ۱۹۸۴ سے انھوں نے مکمل طور پر سگریٹ کو چھوڑ دیا ہے۔ ۱۹۷۷ سے ۱۹۸۱ تک وہ تعلیم کے سلسلہ میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں تھے۔ اس زمانہ میں وہ "چین اسموکر" تھے۔ ایک روز کا واقعہ ہے۔ امتحان کا زمانہ قریب تھا۔ وہ رات کو دیر تک پڑھنے میں لگے رہے۔ یہاں تک کہ رات کو ایک بجے کا وقت ہو گیا۔ اس وقت انھیں سگریٹ کی طلب ہوئی۔ دیکھا تو دیا سلائی ختم ہو چکی تھی۔ ہیٹر بھی بگڑا ہوا تھا۔ ایک طرف اندر سے سگریٹ کی سخت طلب اٹھ رہی تھی، دوسری طرف کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جس سے سگریٹ کو جلایا جاسکے۔

تقریباً آدھ گھنٹہ تک ان کے دماغ پر یہ سوال چھایا رہا۔ وہ اس سوچ میں پڑے رہے کہ سگریٹ کو کس طرح جلایا جائے۔ آخر ایک تدبیر ان کے ذہن میں آئی۔ ان کے کمرہ میں بجلی کا سو واٹ کا بلب لٹک رہا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ اس جلتے ہوئے بلب میں اگر کوئی ہلکی چیز لپیٹ دی جائے تو کچھ دیر کے بعد گرم ہو کر وہ جل اٹھے گی۔ انھوں نے ایک پرانا کپڑا لیا اور اس کا ایک ٹکڑا پھاڑ کر جلتے ہوئے بلب کے اوپر لپیٹ دیا۔ تقریباً ۵ منٹ گزرے ہوں گے کہ کپڑا جل اٹھا۔ کمال صاحب نے فوراً اس سے اپنا سگریٹ سلگایا اور اس کے کش لینے لگے۔

اسی کا نام "دماغی محنت" ہے۔ عام لوگ محنت کے نام سے صرف جسمانی محنت کو جانتے ہیں۔ مگر محنت کی زیادہ بڑی قسم وہ ہے جس کا نام دماغی محنت ہے۔ دنیا کی تمام بڑی بڑی ترقیاں وہی ہیں جو دماغی محنت کے ذریعہ حاصل کی گئی ہیں۔ جسمانی محنت پھاوڑا چلانے یا ہتھوڑا مارنے کا کام انجام دے سکتی ہے۔ مگر ایک سائنٹفک فارم یا جدید طرز کا ایک کارخانہ بنانے کا کام صرف دماغی محنت کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔ جسمانی محنت اگر آپ کو ایک روپیہ فائدہ دے سکتی ہو تو آپ دماغی محنت کے ذریعہ ایک کرور روپیہ کما سکتے ہیں۔ جسمانی محنت صرف یہ کر سکتی ہے کہ وہ دوڑ کر بازار جائے اور ایک دیا سلائی خرید کر لائے اور اس کے ذریعہ سے اپنی سگریٹ سلگائے۔ مگر دماغی محنت ایسی حیرت انگیز طاقت ہے جو دیا سلائی کے بغیر آپ کے سگریٹ کو سلگا دے، جو ظاہری آگ کے بغیر آپ کے گھر کو روشن کر دے۔

تاریخ کا سبق

سرٹامس رو (Sir Thomas Roe) سترھویں صدی عیسوی کے شروع میں لندن سے ہندستان آیا اور یہاں تین سال (۱۶۱۸ - ۱۶۱۵) تک رہا۔ اس نے مغل حکمراں جہانگیر سے تعلق پیدا کیا۔ دوسری اعلیٰ صفات کے ساتھ اس کی ایک صفت یہ تھی کہ وہ ترکی زبان جانتا تھا اور جہانگیر سے براہ راست گفت گو کر سکتا تھا۔

سرٹامس رو (۱۶۴۴ - ۱۵۸۱) جب ہندستان آیا، اس وقت جہانگیر اجمیر میں تھا. ٹامس رو اجمیر پہنچا اور تین سال تک یہاں رہا۔ جہانگیر کبھی کبھی اس کو اپنے دربار میں بلاتا اور اس سے اِدھر اُدھر کی گفت گو کرتا۔ ٹامس رو نے اندازہ کیا کہ جہانگیر کو فن مصوری سے بہت دل چسپی ہے۔ اس نے ایک روز جہانگیر کی خدمت میں ایک تصویر پیش کی۔ جہانگیر کو یہ تصویر بہت پسند آئی۔

ٹامس رو نے محسوس کیا کہ وہ جس وقت کا منتظر تھا، وہ وقت اب اس کے لیے آگیا ہے۔ اس نے بادشاہ سے ایک ایسی چیز مانگی جو بظاہر بہت معمولی تھی۔ یہ چیز تھی، ہندستان کے ساحلی شہر سورت میں فیکٹری (تجارتی ادارہ) قائم کرنے کی اجازت۔ بادشاہ نے ایک فرمان لکھ دیا۔ جس کے مطابق انگریز (ایسٹ انڈیا کمپنی) کو سورت میں اپنا تجارتی ادارہ قائم کرنے کی اجازت مل گئی۔

ہندستان کے ایک شہر میں تجارتی ادارہ کھولنے کی اجازت بظاہر بہت معمولی چیز تھی. کیونکہ اس کے باوجود ہندستان، وسیع ملک مغل حکمراں ہی کے حصہ میں تھا۔ عظمت وشان اور قوت وطاقت کے تمام مظاہر پر دوسروں کا قبضہ بدستور باقی تھا۔ مگر سورت میں تجارتی ادارہ قائم کرنا انگریز کو وہ سِرا دے رہا تھا جو بالآخر اس کو تمام دوسری چیزوں پر قبضہ دلادے چنانچہ انگریز نے اس کمتر چیز کو قبول کرلیا اور اس کے بعد تاریخ نے بتایا کہ جو کم تر پر راضی ہوجائے وہ آخر کار برتر پر بھی قبضہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔

یہ تاریخ کا سبق ہے، مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس تاریخ سے سبق حاصل کریں۔

اس دنیا میں اصل اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کو معاملہ کا ابتدائی سرا مل جائے۔ ابتدائی سرا جس کے ہاتھ میں آجائے وہ آخر کار انتہائی سرے تک پہنچ کر رہے گا۔

ہندستان کی آزادی کی تحریک ۱۷۹۹ میں شروع ہوئی جب کہ سلطان ٹیپو انگریزوں سے جنگ کرتے ہوئے مارے گیے۔ اس کے بعد انگریزوں سے لڑنا، انگریز شخصیتوں پر بم مارنا، ان پر حملہ کرنے کے لیے بیرونی حکومتوں کو ابھارنا، جیسے ہنگامے سو سال سے زیادہ مدت تک جاری رہے۔

اس قسم کی تدبیریں اپنی نوعیت میں پر شور تھیں۔ چنانچہ ان کا نام آتے ہی انگریز فوراً چوکنا ہو جاتا تھا اور ان کو پوری طاقت سے کچل دیتا تھا۔ اس کے بعد گاندھی میدانِ سیاست میں آئے تو اچانک صورتِ حال بدل گئی۔ پچھلے لوگ ہنسا کے ذریعہ آزادی کا مطالبہ کرتے تھے، گاندھی نے اس کے برعکس اَہنسا کے طریقہ کو اختیار کیا۔ انھوں نے آزادی کی تحریک کو ایسی بنیاد پر چلانے کا اعلان کیا جو انگریزوں کو ناقابل لحاظ دکھائی دے۔

گاندھی کے اسی طریقہ کا ایک جزء وہ ہے جس کو ڈانڈی مارچ کہا جاتا ہے۔ گجرات کے ساحل پر قدیم زمانہ سے نمک بنایا جاتا تھا۔ انگریزی حکومت نے گجرات میں نمک بنانے کی صنعت کو سرکاری قبضہ میں لے لیا۔ گاندھی اس قانون کی پُرامن خلاف ورزی کے لیے سابرمتی سے پیدل روانہ ہوئے اور ۲۴ دن میں ۲۴۰ میل کا سفر طے کرکے ڈانڈی کے ساحل پر پہونچے اور نمک کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھ میں لے کر سرکاری قانون کی خلاف ورزی کی۔

گاندھی نے جب اپنے منصوبہ کا اعلان کیا تو انگریز عہدیداروں کی ایک میٹنگ ہوئی۔ اس موقع پر ایک انگریز افسر نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا تھا کہ ان کو اپنا نمک بنانے دو۔ مسٹر گاندھی کو چٹکی بھر نمک سے بہت زیادہ بڑی چیز درکار ہوگی کہ وہ برطانی شہنشاہیت کو زیر کر سکیں:

> Let him make his salt. Mr. Gandhi will have to find a great deal more than a pinch of salt to bring down the British Empire.

موجودہ دنیا میں کامیاب اقدام وہ ہے جو دیکھنے میں ناقابل لحاظ دکھائی دے، مگر حقیقۃً وہ ناقابل تسخیر ہو۔ جو حریف کو بظاہر "چٹکی بھر نمک" نظر آئے، مگر انجام کو پہونچے تو وہ "پہاڑ بھر نمک" بن جائے۔

خدمت کا کرشمہ

نئی دہلی کے انگریزی پندرہ روزہ انڈیا ٹوڈے (۱۵ اگست ۱۹۹۰ء) میں صفحہ ۶۸ پر ایک سبق آموز واقعہ شائع ہوا ہے۔ محمد حنیف سلیمان (۳۵ سال) لکھنؤ کے ایک مسلمان باربر ہیں۔ وہ پچھلے دس سال سے مسٹر ملائم سنگھ یادو کی حجامت بناتے رہے ہیں۔ مسٹر یادو پہلے صرف ایک نیتا تھے اب وہ یوپی کے چیف منسٹر ہیں۔ محمد حنیف سلیمان نے مسٹر یادو سے کہا کہ آپ ایک بڑے عہدے پر پہنچ گئے ہیں۔ مجھے لکھنؤ کے بازار حضرت گنج میں ایک دکان دلا دیجئے۔

مسٹر یادو اس پر راضی ہو گئے۔ مگر وہ اس کے بعد اپنے وعدہ کو بھول گئے۔ محمد حنیف سلیمان چند مہینے تک انتظار کرتے رہے۔ اس کے بعد انھوں نے چیف منسٹر کی رہائش گاہ پر جانا چھوڑ دیا۔ مسٹر یادو نے دریافت کرایا تو معلوم ہوا کہ محمد حنیف سلیمان ان کی وعدہ خلافی پر ناراض ہیں اور اس بنا پر ان کے یہاں جانا چھوڑ دیا ہے۔ مسٹر یادو کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انھوں نے اپنے افسروں کو حکم دیا کہ سلیمان کے لیے حضرت گنج میں ایک دکان تلاش کرو۔ افسروں نے حضرت گنج میں دوڑ دھوپ کی تو معلوم ہوا کہ اس علاقہ میں کوئی بھی دکان خالی نہیں ہے۔

حضرت گنج میں لکھنؤ ڈولپمنٹ اتھارٹی کے پاور ڈپارٹمنٹ کا ایک سرکاری دفتر موجود تھا۔ مسٹر یادو کے حکم پر یہ دفتر خالی کر کے سلیمان کو دے دیا گیا تاکہ وہ وہاں اپنی دکان کھول سکیں۔ رپورٹر کے مطابق اس وقت ۱۲۵۰ لوگ حضرت گنج میں دکان حاصل کرنے کے منتظر ہیں۔ سلیمان نے ان سب پر چھلانگ لگا کر ایک دن میں لکھنؤ کی اہم ترین مارکیٹ میں ایک ایسی دکان حاصل کر لی جس کی قیمت اِس وقت پانچ لاکھ روپیہ ہے۔ اب محمد حنیف سلیمان نے اس دکان میں اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ اس دکان کے اوپر اِس نام کا بورڈ لگا ہوا ہے: بمبئی ہیر ڈریسرز (Bombay Hair Dressers) رپورٹر کے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے سلیمان نے جو کچھ کہا اس کو رپورٹر نے اپنی زبان میں اس طرح نقل کیا ہے کہ میں اپنی سیوا کی وجہ سے اس کا حقدار تھا:

I deserved this much all my seva.

خدمت کے کرشمہ کو، دوسرے لفظوں میں، نفع بخشی کا کرشمہ کہا جا سکتا ہے۔ اگر آپ کسی آدمی کو یہ یقین دلائیں کہ آپ اس کے لئے نفع بخش ہیں تو وہ آپ کا گرویدہ ہو جائے گا۔ دوسروں کو فتح کرنے کی سب زیادہ آسان تدبیر یہ ہے کہ آپ اس کے لئے نفع بخش بن گئے ہوں۔

ہر آدمی فطری طور پر ایک چیز سے سخت بیزار ہوتا ہے اور دوسری چیز کو وہ بہت زیادہ پسند کرتا ہے۔ پہلی چیز نقصان ہے اور دوسری چیز فائدہ۔ اگر کسی آدمی کی رائے یہ ہو جائے کہ آپ اس کو نقصان پہنچانے والے ہیں، آپ اس کے لئے کسی پہلو سے پرابلم بن سکتے ہیں تو وہ آپ کو سخت ناپسند کرنے لگے گا۔ ضرر رساں آدمی کبھی کسی کا محبوب نہیں ہو سکتا۔

اس کے برعکس جس آدمی کی تصویر یہ ہو کہ وہ دوسروں کو فائدہ پہنچانے والا ہے، اس سے ہر آدمی کو دلچسپی ہو جائے گی، خواہ یہ فائدہ بخشی کتنی معمولی ہی کیوں نہ ہو۔ میٹھا بول، دوسرے کی ضرورت پوری کرنے کے لئے دوڑنا، دوسرے کے مسائل میں اس کے کام آنا، دوسرے سے خوش اخلاقی کے ساتھ پیش آنا، اس قسم کی کوئی بھی صفت ایک آدمی کو دوسروں کی نظر میں پسندیدہ بنا دیتی ہے۔ لوگ ایسے آدمی کو اپنا آدمی سمجھتے ہیں، لوگ اپنے معاملات میں ایسے آدمی پر بھروسہ کرتے ہیں، لوگوں کے دلوں میں ایسے آدمی کے لئے نرم گوشہ ہوتا ہے۔

اگر آپ ایسے لوگوں کے درمیان ہیں جن کو آپ غیر سمجھتے ہیں یا جن کو آپ اپنا دشمن خیال کرتے ہیں تو آپ ان کے لئے نفع بخش بن جائیے۔ آپ اپنے قول اور عمل سے ثابت کیجئے کہ آپ ان کے لئے مسئلہ نہیں ہیں بلکہ آپ ان کے لئے ایک قیمتی اثاثہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اگر آپ ایسا کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس کے بعد نہ آپ کو دوسروں سے شکایت ہوگی نہ دوسروں کو آپ سے۔ اس کے بعد آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کا پورا ماحول آپ کا ساتھی اور آپ کا مددگار بن گیا ہے۔

تعمیرِ حیات

زندگی کی تعمیر ہر انسان کا پہلا مسئلہ ہے۔ ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ وہ دنیا میں اپنے لئے ایک باعزت مقام حاصل کرے، مگر اس مقصد کا حصول صرف خواہش کے ذریعہ نہیں ہوسکتا، اس کے لئے ضرورت ہے — حقیقت پسندانہ منصوبہ بنانا اور اس کے حصول کے لئے ضروری عمل کرنا۔ اس کے بغیر صرف خواہش کی بنیاد پر کوئی شخص اپنی زندگی کو کامیاب نہیں بنا سکتا۔

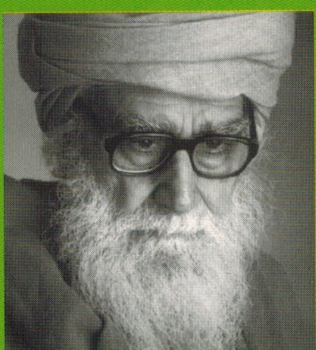

www.goodwordbooks.com

ISBN 978-93-5179-017-4

9 789351 790174

₹ 75

Goodword